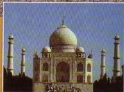
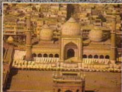
سیاحتِ ماجدی







مولانا عبدالماجد دریابادی

سیاحتِ ماجدی

ترتیب: راشد شیخ

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

toobaa-elibrary.blogspot.com

سیاحتِ ماجدی

از

مولانا عبد الماجد دریا بادی

ترتیب

محمد راشد شیخ

ادارہ علم و فن

نام کتاب ——— سیاحتِ ماجدی
مصنف ——— مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

اشاعت ——— 2001ء
ناشر ——— ادارۂ علم و فن
B-108 الفلاح ملیر ہالٹ، کراچی
مطبع ——— حاجی حنیف اینڈ سنز، لاہور

صفحات ——— 360
قیمت ——— -/180 روپے

ملنے کے پتے

☆ فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار کراچی
☆ ویلکم بک پورٹ، اردو بازار کراچی
☆ مکتبۂ ندوہ، قاسم سینٹر اردو بازار کراچی
☆ ادارۂ تالیفات اشرفیہ، بیرون بوہر گیٹ ملتان
☆ کریمی بک ہاؤس، کینٹ شاپنگ سینٹر حیدر آباد
☆ دار الکتاب، عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
☆ مکتبۂ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار لاہور
☆ مکتبۂ رشیدیہ، 25 لوئر مال لاہور
☆ خان بک کمپنی، 25-C/2 لوئر مال لاہور
☆ کوآپرابک شاپ، 70 شارع قائد اعظم لاہور
☆ اظہار سنز، 19 اردو بازار لاہور

فہرست

عرضِ مرتب

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲ء–۱۹۷۷ء) معروف مفسر قرآن، صحافی، انشا پرداز اور نامور مصنف تھے۔ آپ نے اپنے ہفتہ وار اخبارات "سچ"، "صدق" اور "صدقِ جدید" کے ذریعے ایک طویل عرصے تک اصلاحی و علمی خدمات انجام دیں۔ مولانا سفر بہت کم کرتے تھے مگر جب بھی کرتے تو واپسی پر اپنے رسائل میں اس سفر کے دلچسپ حالات ضرور تحریر فرماتے۔

مولانا دریابادیؒ کے اسفار میں "سفر حجاز"، "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں"، "گیارہ سفر یا سیاحتِ ماجدی"، "تاثرات دکن" اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا کی زیر ادارت شائع ہونے والے رسائل میں بعض ایسے سفرنامے بھی ملے جو مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ ہم نے مولانا کے سفرناموں کا ایک جامع اور مکمل مجموعہ ترتیب دیا ہے جس میں "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں"، "گیارہ سفر یا سیاحتِ ماجدی" کے علاوہ تین مزید سفرنامے شامل کیے گئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سفر آگرہ / جے پور ۱۹۶۳ء
سفر علی گڑھ ۱۹۶۶ء
سفر دہلی ۱۹۶۷ء

"ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" ۱۹۵۵ء میں مولانا دریابادی مرحوم نے خود مرتب کر کے شائع کیا تھا جبکہ "گیارہ سفر یا سیاحتِ ماجدی" مولانا کے برادر زادے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب نے مرتب کیے تھے۔ "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" مولانا دریابادی کا تحریر کردہ دیباچہ بھی ابتدا میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ تمام اسفار ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۳ء کے

دوران ہوئے۔ اسفار کی ترتیب میں سنین کے بجائے مقامات سفر کو ترجیح دی گئی ہے۔

مولانا دریابادی مرحوم کی دیگر تحریروں کی طرح ان کے سفر ناموں میں بھی ادبیت، انشاپردازی اور تعمیری و اصلاحی پہلو بھرپور طریقہ سے موجود ہے۔ مولانا ہر چیز کو اصلاحی نقطۂ نظر سے دیکھتے اور اس کے معائب و محاسن بے کم و کاست بیان کر دیتے۔ مولانا کے نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن ہے لیکن ان کے سوز دروں، مسلمانوں کے لئے غم خواری، ان کی اصلاح اور ترقی کے جذبے سے انکار ممکن نہیں۔ وہ کسی کی پسند ناپسند کو خاطر میں لائے بغیر دل کی بات حیطۂ تحریر میں لے آتے تھے۔ اس سلسلے میں اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

"صحافت برائے صحافت کی طرح تصنیف برائے تصنیف بھی بحمد اللہ اپنا مقصد کبھی نہ رہا۔ ہر دور میں وہی لکھا جو اپنے خیال و عقیدہ کے مطابق تھا، قلم سے وہی ٹپکا، وہی چھلکا جو دل و دماغ کے اندر موجود تھا"۔[1]

امید کی جاتی ہے کہ مولانا دریابادی کے یہ سفر نامے اردو کے سیاحتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوں گے۔ اس مجموعے کی تصحیح و املا کے مشکل کام میں دو بزرگوں پروفیسر ڈاکٹر سیّد عطاء اللہ حسینی و محمد اسماعیل صاحبان نے معاونت فرمائی جن کا شکریہ واجب ہے۔

محمد راشد شیخ

ملیر ہالٹ، کراچی

---

[1] "آپ بیتی" از مولانا عبد الماجد دریابادی ص ۲۸۲، شائع کردہ مجلس نشریات اسلام، کراچی

ڈھائی ہفتہ پاکستان میں

دیباچہ

(طبع اوّل)

ایک مختصر سے ڈھائی ہفتہ کے سفر کی داستان، شاید لکھنے والے کی طول بیانی کے باعث بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی اور صدق کے دس نمبروں میں بمشکل ختم ہو پائی۔ پڑھنے والوں کو خدا معلوم کیا لذت اس میں ملی کہ عین اس کی قسط وار اشاعت کے وقت وہ پاکستان کے تو بکثرت اور ہندوستان کے بھی دو ایک پرچوں میں نقل ہوتی رہی اور پسند کرنے والوں کے خطوط بڑی تعداد میں وصول ہوتے رہے پسند کا اظہار تقریباً ہر طبقہ کی طرف سے ہوا اور بہت سے کرم فرماؤں کا اصرار یہ ہوا کہ ان متفرق مضامین کو یکجا کر کے مستقل کتاب کی شکل دے دی جائے۔

آئندہ اوراق اسی ارشاد کی تعمیل ہیں۔ ادھر اس سفر نامہ کی آخری قسط نکلی ہی تھی کہ اُدھر پاکستان کی دنیا ہی بدل گئی۔ نہ وہ گورنر جنرل رہ گئے نہ وہ وزیر اعظم۔ ریل کے کچھ ڈبے کلکتہ سے براہ راست لاہور جانے لگے۔ راستہ کی دشواریاں بھی کم ہو گئیں۔ "چیکنگ" اٹاری اور جلو سے امرتسر اور لاہور منتقل ہو آئی۔ وقس علیٰ ہذا۔ ناظرین کرام ان تبدیلیوں کو ذہن میں رکھیں...... نظر ثانی کے وقت لفظی ترمیم تو کثرت سے ہوئی ہی ہے، کہیں کہیں کئی کئی سطروں کا اضافہ بھی ضروری نظر آیا۔

صدق میں چھپے ہوئے ایک ضمیمہ کو اصل کتاب کا جزو بنا دیا گیا ہے اور نئے ضمیمے بڑھا دیئے گئے ہیں۔

کتاب جیسی کہ وہ شائع ہو رہی ہے، بڑی حد تک رہین منت ایک نادیدہ حیدر آبادی مخلص چودھری مبارک علی خاں (فیض منزل، نلگنڈہ) کی ہے۔ انھوں نے اتنا ہی نہیں کیا کہ کل کتاب کا مسودہ نہایت پاک و صاف لکھا کر بھیج دیا۔ اور اس میں ترمیم و حذف و

اضافہ میں مجھے بڑی آسانی رہی بلکہ طرح طرح کی گلکاریاں بھی بڑی محنت و کاوش سے کیں اور تاریخیں نکال کر کتاب کے کئی نام اپنی طرف سے تجویز کر دیئے۔ ان میں سے صرف ایک نام "مبارک سفر" کو قائم رہنے دیتا ہوں جس سے خود ان کے نام کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ بعض نقشوں کا اضافہ بھی تمامترا نہیں کی جدت ہے۔

ظاہر ہے کہ جس کتاب میں اس کثرت سے اشخاص اور مختلف فرقوں اور پارٹیوں اور اداروں کا ذکر آئے گا، اس سے ہر پڑھنے والا متفق نہیں ہو سکتا اور نہ لکھنے والا ہی اتنے سرسری اور رواروی کے مشاہدے سے اپنی رائیں پوری پختگی اور ذمہ داری سے قائم کر سکتا ہے۔ بہر حال جو صاحب سمجھیں کہ ان کے حق میں انصاف نہیں ہوا ہے وہ ازراہِ کرم خود ہی عفو و درگزر سے کام لیں۔ یا اگر کسی بیان کی تردید ضروری خیال فرمائیں تو لکھ بھیجیں۔ تصحیح و اصلاح دوسرے ایڈیشن میں ممکن ہے۔

دریاباد۔ بارہ بنکی
اکتوبر ۱۹۵۵ء

عبدالماجد

(۱)

تقریب سفر پر طرح طرح کی طبع آزمائیاں

پاکستان کے موجودہ فرمانروا ہز ایکسی لینسی ملک غلام محمد ایک زمانہ میں سرکار ہند میں ریلوے فنانس میں کسی اونچے عہدہ پر تھے اور قیام لکھنؤ میں رہتا تھا، چودھری خلیق الزماں کے مکان پر۔ اِن کے اُن کے تعلقات دوستی کی حدود سے گزر کر سگے بھائیوں کے سے ہو چکے تھے اسے آج مدت تیس اکتیس سال کی ہو گئی اپنا تعلق اس وقت تحریک خلافت سے خصوصی طور پر تھا۔ صوبہ اودھ کی خدمت صدارت سپرد تھی اور چودھری صاحب تحریک کے ایک مسلّم لیڈر تھے۔ اس تقریب سے اپنا سلسلہ آمد و رفت چودھری صاحب کے یہاں لگا رہتا اور ضمناً ملک صاحب سے نیاز حاصل ہو جاتا۔ یہ کائنات ہے اپنے اُن کے تعلقات کی، اور شرافت نفس و ذرہ نوازی کا کمال ہے کہ وہ اس تھوڑے کو بہت سمجھے، اپنے جاہ و حشم کی ترقیوں کے ہر دور میں اسے یاد رکھا یہاں تک کہ اب جب وہ اس مرتبۂ جلیل پر ہیں انھوں نے اپنے اس قدیم اور اب سالہا سال سے گوشہ نشین نیاز مند کی یاد باقی رکھی۔ اور شروع جنوری میں اسے عنایت نامہ سے سرفراز کر کے وسط مارچ میں اسے کراچی آنے کی دعوت دے دی۔ کئی ہفتہ حیص بیص میں گزرے اور بالآخر وسط فروری (۱۹۵۵ء میں منظوری شروع اپریل ۱۹۵۵ء) میں حاضری کی لکھ بھیجی اور اپنا ڈھائی ہفتہ کے سفر کا پروگرام، روانگی اور واپسی کی تاریخوں بلکہ ٹرینوں کے تعین کے ساتھ لکھ دیا...... زیارت پاکستان کی تمنا کس مسلمان کے دل میں نہیں؟

سر گیسوئے تو در پیچ سرے نیست کہ نیست

ایک تو مسلم ملک پھر پڑوسی اور پڑوسی بھی کیسا، اپنے ہی گوشت پوست کا پتلا، اپنے ہی دل و جگر کا ٹکڑا، اپنے کتنے بھائی بند، عزیز دوست، مخلصین اس سرزمین پر آباد اور پھر قائم اسلامیت کے کن کن دعوؤں اور کیسے کیسے وعدوں کے ساتھ ہوا تھا! یہ

سب چیزیں مل ملا کر اشتیاقِ دید کو حدِ کمال تک پہنچائے ہوئے

از غمِ عشق تو پُر خوں جگرے نیست کہ نیست

ساتھ ہی مانع بھی چند در چند موجود۔ سب سے بڑا مانع فرصت کی کمی۔ آخری فیصلہ بڑے سوچ بچار کے بعد یہی ہوا کہ اسے بھی ایک ضروری کام سمجھ، ڈھائی ہفتہ کی رخصت دوسرے کاموں سے لی جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس دیرینہ شوق کو اس بار پورا ہی کر لیا جائے!

خبر کا پھوٹنا تھا کہ نزدیک و دور یہاں اور وہاں ہر رنگ کی طبع آزمائی شروع ہو گئی اور طرح طرح کی گلفشانی ہونے لگی۔ بقول شخصے

ذہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے

اور لازمی نتیجہ کے طور پر

سخن آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

پورا نقشہ "چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند" کا جما ہوا۔

ایک صاحب نے اندازہ کا تیر چلایا کہ ہو نہ ہو، آپ کی طلبی شیخ الاسلام کے لئے ہو رہی ہے اور دیکھئے کہیں انکار نہ کر بیٹھئے گا۔ جگہ بہت اچھی ہے مشاہرہ معقول اور کام برائے نام۔ ...... ایک دوسرے صاحب اس سے بھی دور کی کوڑی لائے، بولے بھوپال میں تو یہ خبر عام ہے کہ عہدۂ قاضی القضاۃ کی پیشکش آپ کے لئے ہوئی ہے ...... گویا "شیخ الاسلام" اور "قاضی القضاۃ" نام کے عہدے تو حکومت پاکستان میں موجود ہی ہیں...... گویا اس بے علم و بے عمل کو مناسبت تام بھی ان عہدوں کے ساتھ موجود ہے! ...... اور گویا مدۃ العمر کے معمول کے خلاف اب یہ گوشہ نشین کوئی سرکاری عہدہ لپک کر قبول بھی کر لے گا! ...... ناصحین مشفقین کو اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی، کہ ایسے کھلے اور بنیادی سوالات پر ادنیٰ غور و فکر بھی کریں۔ متخیلہ نے ایک چلتی ہوئی چیز پیش کر دی اور قوم چشم بد دور مدت سے انھیں کھلونوں سے کھیلنے کی عادی ہو چکی ہے! نئی

بوستانِ خیال تصنیف کرنے والوں کے لئے بس اتنا کافی تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ جب پاکستان آئے ہیں تو اس سے کچھ ہی روز قبل ریاست بھوپال میں قاضی القضاۃ تھے۔ پس لازم آیا کہ مملکت پاکستان میں کوئی عہدہ اس نام کا موجود ہو اور اب وہ ان کے ایک دیرینہ رفیق و نیاز مند کو تفویض ہو!

اپنے کو مناسبت کسی درجہ میں بھی اگر کسی عہدہ کے ساتھ ہو سکتی تھی تو اس کی صورت صرف یہ تھی کہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے نمونہ کا کوئی وسیع دار التصنیف پاکستان میں کھلتا اور اس کی نگرانی اس نامۂ سیاہ کے سپرد ہوتی۔ باقی اس کے سوا کسی قسم کے فقیہانہ، واعظانہ، حاکمانہ یا انتظامی منصب سے مناسبت تو اس عاجز کو سو میں ایک درجہ کی بھی نہیں!

...... ایک تیسرے گروہ کا انکشاف تھا کہ "حکومت جس قسم کے دستور اساسی کو پاس کرانا چاہتی ہے آپ اس کی تصدیق و تصویب کے لئے طلب ہوئے ہیں تاکہ وہاں کے علماء جب اس دستور کے خلاف چیخ پکار کریں تو ان کا منہ بند کرنے کو آپ کے تصدیقی دستخط پیش کر دیئے جائیں"!

...... اور چوتھے گروہ کی تحقیق تھی کہ "آپ جماعت اسلامی اور مودودی پارٹی کا زور توڑنے کے لئے بلائے گئے ہیں" ...... اور پانچویں گروہ کے نمائندوں نے اعتماد کے لہجہ میں سرگوشی کی "آپ سے ملک کی مذہبی صورت حال سے متعلق استصواب رائے یقیناً ہو گا۔ ذرا خیال کر کے علماء کے حق میں کلمۂ خیر کہہ دیجئے گا اور خصوصاً مظلوم مولانا مودودی کی فوری رہائی پر تو ضرور زور دیجئے گا" ...... غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ جتنی زبانیں اتنی کہانیاں ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من

وز درون من نجست اسرار من

خوب خوب افسانہ تراشیاں تھیں اور خیال آرائیاں جن کے جھرمٹ میں رخت سفر بندھا اور مسافر پاکستان کا پہلا قدم اٹھا۔

واہمہ کی ان ساری خلاقیوں کی آخر بنیاد کیا تھی؟ صرف یہ مفروضہ کہ حاکم اعلیٰ جب کسی کو بلائے گا تو ضرور ہی کوئی نہ کوئی ملکی یا سیاسی غرض اس میں شامل ہو گی! جیسے ذاتی محبت و دوستی اور شخصی پسند و دلچسپی حکام والا مقام کے ہاں کوئی معنی ہی نہیں رکھتی! جیسے حاکمیت انسانیت کو دھکیل کر پورا میدان صاف کر دیتی ہے! اور ہم سبقی، ہم وطنی، ہم صحبتی قسم کے الفاظ ارباب حکومت کے ہاں بالکل بے مفہوم رہ جاتے ہیں!...... گویا ڈاکٹر کے ہاں جب کوئی جائے تو ہمیشہ اپنا حال ہی کہنے! اور ڈاکٹر جب کسی کو بلائے تو لازمی طور پر علاج ہی کرنے! اور گویا ڈاکٹر کا کسی انسان سے بحیثیت دوست کے ملنا اور اس کی مکالمت و مجالست سے لطف اٹھانا از قبیل محالات ہے۔

اپنا یہ معمول کم سے کم احباب خصوصی کو تو معلوم ہی ہے کہ خطاب خاص میں سبقت کرتا نہیں ہے۔ خطاب عام جتنا بھی بن پڑتا ہے صدق اور دوسری تحریروں کے ذریعہ برابر ہوتا ہی رہتا ہے لیکن خطاب خاص کے لئے کوئی وجہ موجہ ضروری ہے۔ جن عزیزوں قریبوں کی تلقین و تربیت اپنے ذمہ واجب ہے ان کی صورت دوسری ہے۔ باقی اس محدود دائرے کے باہر خطاب خاص تو جب ہی ممکن ہے کہ یا تو ادھر سے کوئی سوال پیش ہو، اور اس کے جواب میں اپنی فہم و علم کی بساط کے موافق کوئی مشورہ یا گزارش پیش کی جائے۔ اور یا پھر وہ مسئلہ دینی یا دنیوی حیثیت سے اہمیت ہی اتنی غیر معمولی رکھتا ہو کہ خاموشی گناہ کے درجہ میں پہنچ جائے۔ ان خصوصی صورتوں کو چھوڑ کر بلا طلب مشورہ کسی کے معاملات میں دخل دینا اور اس پر اپنے مشورے ٹھونسنا اپنی وضع و معمول کے بالکل خلاف ہے۔

عزت مآب ملک صاحب سے سیاسی مباحثے اور مذاکرے زندگی کے کسی دور میں بھی نہیں رہے اور نہ وہ کبھی اس بے ہنر کو اپنا اتالیق یا مرشد سمجھے۔ اس لئے ان کے دعوت نامہ کا مفہوم بالکل صاف اور سیدھا تھا۔ ایک با اقتدار کرم فرمانے چاہا کہ اپنے ایک قدیم نیاز مند کو اپنے ملک کی سیر کرا دے۔ اور اس ملک کے اندر اس کے جو بے شمار محب و مخلص و عزیز موجود ہیں ان سے ملنے جلنے کا موقع فراہم کر دے۔ اور بس اس

کے لئے بے تکلف بلا بھیجا چلیے چھٹی ہوئی...... لیکن جو قوم دن رات "سنسنی خیزی" کی بھوک میں مبتلا رہتی اور ہر سیدھی اور موٹی سی بات میں عجائب دیکھنے اور خوارق تلاش کرنے کی عادی ہو چکی ہے اس کی تسکین اس سادہ توجیہ سے کیونکر ہو سکتی تھی۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لم نکالتی اور ڈوب ڈوب کر فیہ پیدا کرتی رہی۔ اور ارض "پاک" کا مسافر سب کچھ سنتا اور دل ہی دل میں مسکراتا، سفر کی پہلی منزل کو روانہ ہو گیا۔



(۲)

مشکلاتِ راہ، واقعات و واردات

سفر کا قدم ابھی اٹھا کہاں۔ پاکستان اب ایک غیر مملکت ہے، غیریت بھی ایسی جو طرح طرح کی بدگمانیوں کے تہ بہ تہ پردوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہاں کا سفر کیا کچھ آسان ہے کہ بس ٹکٹ لیا اور چل کھڑے ہوئے! اجازت ناموں کی وہ وہ کڑی منزلیں درمیان میں کہ اچھے اچھے ہمت اور حوصلہ والوں کے بھی صبر کا پورا امتحان ہو جائے! لاہور اور کراچی ابھی کل تک بمبئی اور کلکتہ ہی کی طرح اپنے تھے لیکن اب جو حجابات حائل ہیں ان کے لحاظ سے تو شاید لندن بلکہ نیویارک تک پہنچ جانا اس سے آسان تر ہو!...... اجازت پہلے تو اپنی ہی حکومت سے حاصل کیجئے اور عملاً اس کے سامنے ثابت کیجئے کہ آپ چور، اُچکے، بدمعاش اٹھائی گیرے نہیں ہیں ...... پاسپورٹ (پروانہ راہداری) کا فارم کسی طرح اپنے حاکم ضلع کے دفتر سے حاصل کیجئے اور اس کی خانہ پری یوں کیجئے کہ جیسے آپ جرائم پیشہ یا کم سے کم مشتبہ ضرور ہیں۔ اپنا قد ناپ کر لکھئے، بالوں کا رنگ بتائیے، آنکھوں کے رنگ کی صراحت کیجئے اور آپ کا مذہب اجازت دے یا نہ دے اپنے فوٹو تین تین عدد کھنچوا کر شامل کیجئے اور پھر اس جھوٹے اعلان پر دستخط کیجئے کہ آپ کو سفر پاکستان کی "شدید ضرورت" ہے! اس کے بعد اب صوبہ سیکرٹریٹ کے چکر لگانے شروع کیجئے کہ پاسپورٹ تیار ہو کر آپ کو ملے۔ پھر جب خدا خدا کر کے ان سارے مرحلوں سے فراغت پائیے تو اب اجازت حکومت پاکستان سے بھی وہاں داخلہ کی حاصل کیجئے اس کا اصطلاحی نام ویزا (VISA) ہے اور آپ کہیں بھی ہوں، اس غرض سے خاصہ طویل سفر دہلی کا پاکستان کے ہائی کمشنر کے دفتر کے لئے کیجئے!...... جب خودداری کا خون یوں قدم قدم پر ہو لے اور وقت اور روپیہ دونوں کا صرف اچھا خاصہ ہو چکے جب کہیں آپ اس قابل ہوں گے کہ سفر کا پہلا قدم اٹھا سکیں! اب پلٹ کر

سوچتا ہوں تو اپنے اوپر حیرت ہی ہوتی ہے کہ ایک عافیت پسند و عافیت کوش گوشہ نشین سے یہ ہفت خواں کی ساری منزلیں سر ہوئیں کس طرح!

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

یہ صحیح ہے کہ ادھر عزیزوں، مخلصوں کا گروہ، سیکرٹریٹ وغیرہ کے مرحلے طے کرانے میں برابر ساعی و سرگرم ہوا اور ادھر پاکستان کے ہائی کمشنر صاحب بہ نفس نفیس ہی نہیں بلکہ ان کا دفتر بھر مہربان۔ بلکہ ایک اہلکار صاحب دہلی سے دریاباد تک سفر کی زحمت بھی اس سلسلے میں گوارا کر چکے تھے۔ پھر بھی ضابطے ضابطے ہی ہوتے ہیں اور سرخ فیتہ کی سنگلاخ زمینوں سے عہدہ برآ ہونا مخلصوں کی ہر اعانت کے باوجود بھی آسانی سے ممکن نہیں۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں!

سفر بالکل تنہا کرنا نہ تھا۔ شریک حیات، شریک سفر بھی ہو رہی تھیں اور سیر پاکستان کی مجھ سے بڑھ کر حریص و آرزو مند۔ پھر لاہور اور کراچی کے مختصر قیام کا جو نقشہ پیش نظر تھا اور قلیل مدت کے اندر احباب و مخلصین کے ہجوم عظیم کو ایک نظم کے ماتحت جس طرح نپٹانا تھا اس کے لحاظ سے ایک ہمہ وقتی سیکرٹری کی رفاقت ناگزیر تھی۔ چنانچہ اس کے لئے نظر انتخاب اپنے بھتیجے اور داماد محمد ہاشم قدوائی ایم اے (استاد پولیٹیکل سائنس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) پر پڑی۔ ان کے علاوہ سامان کی نگہداشت، اتار چڑھاؤ اور عام آسائش کے خیال سے دفتر صدق کے ایک کارندے کو بھی ساتھ لیا ...... چار آدمیوں کے اس قافلہ کے لئے ہوائی جہاز سے سفر خارج از بحث تھا۔ لکھنؤ سے لاہور کا وہی قدیم اور ایک زمانہ میں مانوس و محبوب راستہ ریل کا اختیار کیا۔

اپریل کی پہلی اور شعبان کی ساتویں تھی کہ بعد نماز جمعہ سہ پہر کی ٹرین سے لکھنؤ سے امرتسر کے لئے روانگی ہوئی۔ وہی ٹرین جو تقسیم ملک سے قبل سیدھی لاہور جاتی تھی اور کلکتہ پنجاب میل کہلاتی تھی...... پلیٹ فارم پر عزیزوں، دوستوں، مخلصوں، رخصت کرنے والوں اور والیوں کا وہ ہجوم کہ جیسے پاکستان نہیں حج وزیارت کو روانہ ہو رہا ہوں۔ اور سفر جیسے دو ڈھائی ہفتہ کے بجائے برسوں کا ہے! اور اسی ہجوم میں ایسے سادہ دل بزرگ بھی تھے جو یہ فرض درجۂ یقین میں کئے ہوئے تھے کہ میں گویا بطور گورنر جنرل بہادر کے سیاسی یا آئینی مشیر کے جارہا ہوں! اور کم سے کم چھوٹے بڑے عہدہ داروں کی ترقی و تقرر کے قلمدان کی کنجی تو میرے ہاتھ میں ہے ہی! "دیکھئے میرے فلاں عزیز کا نام نہ بھول جایئے گا، اچھی طرح نوٹ کر لیجئے فلاں محکمہ میں بیچارہ کی ترقی مدت سے رکی ہوئی ہے" اور "دیکھئے فلاں عزیز کا تقرر ضرور کرا دیجئے گا غریب کو اب تک جگہ نہیں مل سکی"۔ غرض سفارشوں اور فرمائشوں کی ایک پوٹ کی پوٹ تھی کہ کامل اعتماد اور پوری سادگی کے ساتھ ایک دوش ناتواں پر لادی جارہی تھی!......

رخصتی کا منظر پراثر ہوتا ہے اور قلب اگر حساس ہو تو پر حسرت اور دردناک بھی۔ سفر آخرت کے منظر سے کتنا مشابہ! عزیزوں، دوستوں کا ہجوم ساتھ آتا ہے اور میت کو اسی طرح قبر کے سپرد کر کے چلا جاتا ہے!

گاڑی چلی اور دماغ کے تصور خانے میں پاکستان کے اگلے پچھلے نقشے پھرنے لگے۔ ترجمان حقیقت اقبالؔ نے کس شوق اور چاؤ کے ساتھ اس "اسلامی" مملکت کی تحریک دلوں میں قائم کرائی تھی۔ ہزارہا مخلص جانبازوں نے کس دردمندی سے اس آواز پر لبیک کہی تھی۔ کیا کیا آرزوئیں تھیں اور کیسے کیسے منصوبے! اور اب اس شیریں و خوشگوار خواب کی تعبیر کیا نکل رہی ہے! اُمت نے اس کے پیچھے کیا کچھ کھویا، اس کے نام پر کیا کیا لٹایا، اور اب اسے حاصل کر کے کیا کیا پایا! نفع و نقصان کی میزان کیا رہی! سودا مہنگا پڑا یا سستا!...... شام ہوئی، رات کا اندھیرا چھایا، خیالات کی یہ رو جاری تھی۔ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے کہ پچھلی رات میں گاڑی یوپی کے حدود طے کر کے سرحد پنجاب

میں داخل ہو گئی اور پھر صبح ہونے لگی!

یہ انبالہ پڑا، جو کبھی شیخ التبلیغ میر نیرنگ کے دم سے گلزار تھا اور وہ لدھیانہ رہا، یہ سرہند گزرا جسے ایک مجدد وقتؒ کی آرام گاہ آج بھی "شریف" بنائے ہوئے ہے اور وہ راجپورہ نکلا یہاں تک کہ دن کے اجالے میں جالندھر آگیا۔ یہاں ابھی کل تک کتنے عالم و فاضل آباد تھے اور یہاں کی کتنی مسجدوں کے مینار دن رات اللہ کی توحید کی گواہی پکار پکار کر دیتے رہتے تھے!...... دل پر مسرت و انبساط کے بجائے اب تمامتر حسرت و غم کے جذبات طاری تھے۔ لیجئے اب جالندھر اور امرتسر کے درمیان کا علاقہ شروع ہو گیا اور آہ کچھ نہ پوچھئے، دماغ کے کیمرہ کے سامنے کیسی کیسی حسرت آلود، خون میں ڈوبی ہوئی تصویریں آگئیں! کتنے معصوم بچوں اور بچیوں کا معصوم خون اس سرزمین میں جذب ہوا ہوگا! کتنے مظلوم بوڑھوں اور بوڑھیوں کے لاشے اسی علاقے میں تڑپ کر سرد ہوئے ہوں گے! کتنی عصمتیں یہاں دن دہاڑے بیدردی سے لٹی ہوں گی! اللہ کی زمین ان عصمت مآبوں پر تنگ ہو گئی ہو گی! وہ فریاد کر رہی ہوں گی اور کوئی ان کی چیخوں کا سننے والا نہ رہا ہو گا! ظلم، شقاوت، شیطنت کا کون سا کھیل ہے جو اس علاقہ میں ہفتوں بلکہ مہینوں نہیں کھیلا جاچکا ہے...... مسلمان جن صورتوں میں مظلوم رہے اُن پر آہ و فغاں تو بالکل قدرتی تھی لیکن ساتھ ہی یہ عقلی تسکین بھی موجود تھی کہ شہادت و مظلومیت کے اجر بھی کیسے کیسے بے حساب اور قابل رشک انھیں مل چکے ہوں گے لیکن قلب ان صورتوں کے تصور سے کانپ گیا جہاں سبقت و اقدام کا داغ مسلمانوں کے چہرہ پر لگا نظر آیا۔ یہ داغ غیروں کی نظر میں خود اسلام کے روئے روشن پر لگا اور یہ تصور آتے ہی سر ندامت سے جھک گیا۔ دس مسلمانوں کا مظلوم ہو کر اپنے رب کے حضور میں حاضر ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک مسلمان بھی ظالم بن کر دنیا و آخرت میں رونما ہو!

(۳)

لاہور نمبر (۱)

مسافر نوازیاں

امرتسر اسٹیشن بات کی بات میں آ گیا...... وہی امرتسر مرحوم جو کبھی مسلمانوں کا تھا جو ابھی کل تک اسلامیت کا مرکز تھا، مسجدوں اور دینی درسگاہوں کا شہر تھا کیسے کیسے عالم دین اور شیخ طریقت یہاں رہتے تھے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم اور مولانا مفتی محمد حسن سلمہ اللہ کو کوئی بھلانا چاہے بھی تو کیسے بھلادے! خلافت کمیٹی والوں اور احرار کا تو گویا قلعہ تھا۔ کیسے کیسے اہل حق اسی خاک سے اُٹھے اور اسی میں ملے! حافظہ نے بچپن کا ایک ورق کھولا تو اس میں "وکیل" اور اس کے دوسرے مطبوعات کے نقش کیسے اُبھرے اُبھرے نظر آئے! غرض یہ کہ کتنی خوشگوار اور روح پرور یادیں اس شہر سے وابستہ تھیں، وہ اب صرف اس کے ماضی سے وابستہ ہو کر باقی رہ گئی ہیں! دم بھر میں یہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ سواد شہر جس وقت بھی ریل سے نظر آنا شروع ہوا، اسی لمحہ حسرتوں کا یہ باب بھی دماغ کے کتاب خانہ میں کھل گیا...... آخر صحو نے سکر کے دروازہ پر دستک دی، ہوش نے ربودگی کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا، حواس کی آنکھیں کھلیں، پلیٹ فارم پر گاڑی رک چکی تھی۔ ہندوستان کی میل ٹرین کا گویا ٹرمینس (Terminus) (آخری اسٹیشن) تھا۔ قلیوں سے کچھ بڑھ کر آوازیں صرافوں کی آنے لگیں۔ ہندوستان کے سکہ کی حکمرانی ختم ہوئی۔ دوسری مملکت کے سکہ کی عملداری شروع ہونے کو ہے۔ نوٹ، روپیہ، ریزگاری، جو اور جتنی بھی چاہئے نقد بالنقد بدلوا لیجئے!

امرتسر سے لاہور کا فاصلہ ہی کیا ہے۔ میل ٹرین کے لئے اتنی مسافت گھنٹوں کی نہیں منٹوں کے طے کرنے کی ہے لیکن تقسیم کے بعد ہم بدبختوں کے لئے کوئی

معمولی سی سہولت بھی کب باقی رہنے پائی ہے۔ ہر چیز کا فیصلہ جب ضد اور نفسا نفسی ہی پر ٹھہرا تو باہمی سہولتوں کے لئے کسی گنجائش کا سوال ہی کہاں رہ گیا ہے؟ معیار عمل تو یہ پڑ گیا ہے کہ اختیار بھر وہ عمل کیجئے جس سے دوسرے فریق کو زک پہنچے۔ چاہے اپنا ہی نقصان اس سے کیوں نہ لازم آجائے! غیر کمبخت کو تو بدشگونی ہو، خواہ اس کے لئے اپنی ہی ناک جڑ سے اُڑا دینا پڑے!...... یہ تیس بتیس میل کا فاصلہ اب ایک لوکل ٹرین کے ذریعہ طے ہوتا ہے (اور یہ لوکل ٹرین تو اب جا کر چلی ہے تقسیم کے سات سال بعد!) اور اس پر اسٹاف سنا ہے کہ ایک دن ہندوستان کا چلتا ہے اور ایک دن پاکستان کا۔

خواہ مخواہ اور بالکل بلا ضرورت امرتسر پر گاڑی تبدیل کرنا پڑی اور اس لوکل گاڑی نے تھوڑی ہی دیر میں اٹاری پہنچا دیا۔ یہ ہندوستان کا سرحدی اسٹیشن ہے۔ ایک بہت ہی چھوٹا سا اسٹیشن، جس کی اہمیت کی کل کائنات یہ ہے کہ یہ سرحد کا اسٹیشن ہے۔ یہاں حکم ہے کہ چھوٹے بڑے سارے مسافر مع اپنے چھوٹے سے چھوٹے سامان کے اُتریں اور کچھ دور چل کر اپنے پاسپورٹ دکھائیں۔ اپنے سامان کا جائزہ کرائیں اور پھر سے گاڑی میں سوار ہو جائیں!...... حاجیوں کو ایک زمانہ میں جزیرہ کامران میں قرنطینہ کی شدید تکلیف دہ منزل سے گزرنا ہوتا تھا، بس اسی کا نمونہ۔

یہاں پہلا تجربہ آپ کو قلی راج کا ہوگا۔ پنجاب کے ہیکڑ اور اکھڑ قلی جو کچھ چاہیں گے آپ سے مطالبہ کریں گے اور وہی لے کر رہیں گے۔ آپ ان کے سامنے اپنے کو بے بس پائیں گے۔ داد فریاد کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ پولیس دیکھنے میں بہت سی کھڑی ملے گی لیکن مدد آپ کو نہ پولیس سے ملے گی نہ اسٹیشن اسٹاف سے! عمارت اس "چیکنگ" کے لئے کوئی چھوٹی سی بھی موجود نہیں۔ صرف دو شامیانے سے لگا دیئے ہیں۔ ایک میں پولیس کے کچھ افسر کرسیوں پر بیٹھے رہتے ہیں پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کے لئے اور دوسرے میں محکمہ کسٹم کے افسر سامان کی جانچ کے لئے۔ مسافروں کی راحت و آسائش کے نام کا صفر ہی صفر ہے اور اس میں مسافر چاہے فرسٹ ہی کلاس کے کیوں نہ ہوں! کوئی چارہ بجز اس کے نہیں کہ یا تو ہجوم میں گھس کر دھکے کھایئے اور یا پھر

صبر کے ساتھ اپنے سامان ہی پر بیٹھے ہوئے اپنی باری کا انتظار کیجئے۔ جنھیں اپنی خودداری عزیز ہے وہ اس چپقلش اور ذلت کے تجربہ کے بعد اپنے کو کوستے اور اپنے ہی اوپر جھنجھلاتے ہیں کہ سفر ناحق ہی اختیار کیا۔ وہ تو کہیے کہ بس نہیں چلتا اور واپسی کی کوئی گاڑی سامنے موجود ہوتی نہیں، ورنہ عجب نہیں کہ کچھ لوگ تو اسی منزل پر سفر تمام کر کے ہندوستان واپس ہی چلے آئیں!...... شدید انتظار وانقباض کے عالم میں گھنٹہ سوا گھنٹہ کی مدت بھی چار پانچ گھنٹہ سے کم معلوم نہیں ہوئی۔

خدا خدا کر کے گاڑی پھر سے چلی اور منٹوں کے اندر پاکستان کا پہلا سرحدی اسٹیشن جلو آگیا...... اور پتا ہی نہ چلنے پایا کہ ٹھیک کس وقت اور کہاں ہندوستان کے حدود ختم ہوئے اور پاکستان کی سرزمین شروع ہو گئی!...... اور یہ جلو بھی اپنی ہولناکی اور حشر انگیزی میں اٹاری سے کچھ کم نہ تھا اور پاکستان آخر کسی چیز میں ہندوستان سے پیچھے کیوں رہنے لگا! بقول شخصے

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

کتاب ایک ہی۔ اس کا ایک ہندوستانی ایڈیشن اور دوسرا پاکستانی۔ عام مسافروں بیچاروں پر یہاں بھی سب کچھ وہی گزر کر رہا جو کچھ دیر پہلے اٹاری میں گزر چکا تھا۔ البتہ میں اپنی ذات خاص سے یہاں محفوظ اور مستثنیٰ رہا۔ یہاں کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کسٹم اتفاق سے میری کتابوں کے واقف نکلے اور ایک عزیز نے خط لکھ کر انھیں واقف تر کر دیا تھا ...... مجھے اتار کر اپنے کمرہ میں لے گئے اور چائے وغیرہ سے بڑی خاطریں کرتے رہے......

یہیں بیٹھا ہوا تھا کہ لاہور سے ایک صاحب نے فون پر دریافت کیا کہ دریابادی اسی ٹرین سے آرہے ہیں؟ یہاں سے جواب اثبات میں گیا اور یہ بھی کہ عین اس وقت اسی کمرہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، یہ دریافت حال کن صاحب نے کیا تھا اور ان سے بھی واقف ہو جائیے۔ عبدالوحید خاں بی اے، ایل ایل بی (مصنف "مسلمان اور جنگ آزادی") میرٹھی سے لکھنوی ہوئے اور اب مدت سے لاہوری ہیں۔ لکھنؤ میں پرجوش لیگی تھے۔ اور لاہور میں بھی ایم ایل اے رہ چکے ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی میں ڈرا کہ یہ آدمی بے ڈھب

قسم کے ہیں۔ جلسہ، جلوس، نعروں کے عادی۔ ان سے کچھ بعید نہیں جو میرے لئے بھی کوئی ایسا ہی سوانگ کھڑا کر دیں۔ بیچارہ اپنے خلوص و محبت کے اظہار کا طریقہ یہی سمجھتے ہیں۔ بغیر اس کا خیال کئے کہ اس سے خود میرے اوپر کیا گزر رہی ہے گی اور انھیں خبر بھی کس نے کر دی۔ میں نے تو مخصوص دو ہی تین شخصوں کو اطلاع دی تھی اور ان سے بھی تاکید کر دی تھی کہ اعلان عام ہر گز نہ ہونے پائے...... یہ تو بہت بعد کو معلوم ہوا کہ لاہور کے مقبول و معروف روزنامہ "نوائے وقت" میں سفر کی خبر چھپ گئی تھی۔

دم کے دم میں لاہور شہر کے دیباچے شروع ہو گئے۔ دُور دُور کی عام عمارتیں، کارخانے اور مسجدیں، ریلوے ورکشاپ اور ریل والوں کے کوارٹر، مغلپورہ میں انجنوں اور ڈبوں کی ریل پیل۔ خاص لاہور جنکشن کا لق و دق یارڈ۔ پہلی بار ریل کے ڈبوں پر اردو حروف میں "پاکستان ریلوے" کا نظارہ!...... اور پھر خیال کی نظروں کے سامنے لاہور کی تاریخی اہمیت، قدیم اسلامیت، ملی مرکزیت، ہر قدیم و جدید ملی تحریک میں اس کا پیش پیش ہونا۔ تحریک علی گڑھ ہو یا تحریک خلافت سب میں بڑی حد تک اس کی امامت یہاں کی شہرۂ آفاق صحافت، اردو زبان کی خدمات میں اس کی سبقت، یہاں کے اہل علم و اہل قلم، پیسہ اخبار مرحوم، زمیندار، اقبال و ظفر علی خاں، خواجہ کمال الدین و محمد علی، عبداللہ یوسف علی اور نو مسلم شیخ اسد ویس، شاہی مسجد و مزار شیخ علی ہجویریؒ، مہر و سالک اور خدا معلوم کتنے اور قدیم نقش حافظہ کی لوح پر ابھر آئے۔ یہ بھی یاد پڑ گیا کہ ایک مرتبہ اور (۴۱ء یا ۴۲ء) اس شہر میں آنا ہوا تھا۔ پرنسپل برکت علی صاحب کے ہاں دعوت کی میز پر مولانا مودودی، مولانا داؤد غزنوی اور خان بہادر محمد حسین مرحوم (پریس برانچ والے) وغیرھم کا اجتماع تھا۔ جنگ یورپ (دوم) زور شور سے جاری تھی اور مولانا صاحبان اسی زور و قوت کے ساتھ برطانیہ کی شکست اور جرمنی کی فتح کے دعوے کر رہے تھے...... آہ انسان کی غلط اندیشیاں اور بشری ظن و تخمین کی گمراہیاں!

پلیٹ فارم آگیا۔ اور متعدد جانے پہچانے ہوئے مانوس و مالوف چہرے محبت کے تبسم کے ساتھ پیشوائی کو آگے بڑھے، یہ عشرت رحمانی ہیں، وہ شوکت تھانوی ہیں اور

یہ وہی عبدالوحید خاں ہیں۔ اور متعدد اور علاوہ میرے میزبان اور ان کے عزیزوں کے، اور پھر دو صاحب اور بڑھے۔ ایک معلوم ہوا کہ حکومت پنجاب کے پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں اور دوسرے ان کے اسسٹنٹ۔ اس وقت سے میں سرکاری مہمان تھا۔ ان حضرات نے کہا کہ "آپ جس ہوٹل کو پسند فرمائیں وہاں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا جائے اور ایک موٹر آپ کی سواری کے لئے ہر وقت موجود رہے گی"۔ شکریہ کے ساتھ جواب میں عرض کیا گیا کہ "اپنے کو راحت سب سے زیادہ اپنے عزیز میجر ڈاکٹر حاجی خلیل الرحمٰن کے ہاں ملے گی۔ اس لئے ہوٹل وغیرہ سے تو معافی چاہتا ہوں"...... اور سواریوں اور سامان کے دونوں موٹر ان قدیم و خاندانی میزبان کے ہاں روانہ ہو گئے۔ "میزبان" کا لفظ غلط استعمال ہوا۔ میزبانی اور مہمانی کا سوال کیسا؟ اپنا ہی گھر تھا۔ مسافر اپنی پارٹی سمیت اپنے ہی گھر میں اترا۔



(۴)

لاہور نمبر (۲)

مشاہدات و زیارات

لاہور جیسے "غدار"[1] شہر کا تو چپہ چپہ میرے لئے زیارت گاہ کے حکم میں داخل تھا۔ یہاں تین دن کیا معنی تین مہینہ بھی مشکل ہی سے کافی ہوتے لیکن پروگرام میں قیام کی گنجائش کل ساڑھے تین دن ہی کی نکلتی تھی۔ اور پھر قیام بھی شہر سے میلوں دور چھاؤنی کے علاقہ میں تھا۔ اتنے ہی وقت میں کھینچ تان کر سب سے ملنا جلنا، سب کہیں آنا جانا تھا، اپنے مستقل سفری سیکرٹری تو ساتھ تھے ہی، لاہور کی حد تک مقامی سیکرٹری کے فرائض مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی کے سپرد کر دیئے۔ یہ خیر آبادی ثم پاکستانی سیرت محمد علیؒ کے مصنف میرے لئے بہت سے عزیزوں سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ کراچی سے ماہنامہ ریاض نکالتے تھے، اب لاہور آگئے ہیں۔ روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر ہیں اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ایک خاص کارکن، ان دونوں کی مدد سے مشکل بڑی حد تک آسان ہو گئی اور پھر بڑی بات یہ کہ سرکاری موٹر چوبیس گھنٹہ کے لئے موجود...... سب سے پہلے آنے والوں میں خود یہی جعفری اور مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی رہے۔ السابقون الاولون انھیں لوگوں کو ہونا بھی تھا۔ جعفری کو تو ابھی آپ پہچان چکے۔ اب شاہ جعفر ندوی سے بھی متعارف ہو جائیے۔ اپنے دور کے مشہور و معروف واعظ شیوا بیان، بلبل ہزار داستان مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواروی کے خلف اصغر ہیں۔ پیدائشی پیر زادے اور "مشائخ" پھر ندوی ہوئے اب ندویت سے بھی بہت آگے ہیں لیکن پختہ مومن بحمد اللہ ہر دور میں رہے، اب بھی

[1] "غدار" کا استعمال اس معنی میں اب متروک سا ہو گیا ہے۔ بہت بڑے شہر کو غدار کہا جاتا تھا۔

ہیں۔ خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں اور کتابوں پر کتابیں لکھتے جارہے ہیں بعض ان میں سے بڑی اہم اور معرکۃ الآراء ہیں۔ گویا ایسا چمن یہاں کہاں، جس میں پھول ہی پھول ہوں، کانٹے نہ ہوں۔

حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد سے بڑی تمنا تھی کہ ان کا کوئی صحیح اور سچا جانشین دیکھنے میں آئے۔ آنکھیں مدت سے اسی کے لئے ترسی ہوئی تھیں۔ ذکر متعدد ثقہ لوگوں سے سننے میں آیا تھا کہ اس صفت کے ایک بزرگ لاہور میں ہیں، مولانا محمد حسن امرتسری ثم لاہوری، جو مسجد نیلا گنبد کے متصل مدرسۂ اشرفیہ میں رہتے ہیں اور اپنے مرشد کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ جذبۂ اشتیاق سب سے پہلے انھیں کی خدمت میں لے گیا۔ کہنا چاہئے کہ قیام لاہور کے اہم ترین مقصدوں میں ایک مقصد یہی تھا۔ بعد عصر حاضری ہوئی اور دیر تک حکمت و معروف کے کلمات اور اچھی اچھی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ بزرگی صورت سے ظاہر اور تواضع وحسن اخلاق تو شاید ان کا حصہ ہے۔ بار بار اٹھنا چاہا، لیکن مولانا کی شفقت نے اُٹھنے نہ دیا اور مادی خاطریں بھی چائے اور ناشتہ سے خوب رہیں۔ یہیں حضرت تھانوی کے ایک اور خلیفہ جلیل حافظ جلیل احمد خاں علی گڑھی ثم تھانوی ثم لاہوری کی بھی زیارت نصیب ہوگئی۔ اپنے حضرت کے عاشقوں میں تھے اور انھیں کے عشق میں اپنا وطن علی گڑھ اور وہاں کی بڑی جائیداد چھوڑ تھانہ بھون میں بس گئے تھے، اب سالہا سال سے یہیں ہیں۔ دیکھ کر لپٹ گئے۔ تواضع و شفقت دونوں میں اب اور ترقی ہی ہے۔ یہیں دروازہ پر ضمناً اور محض اتفاقاً بطور نعمت غیر مترقبہ دیوبند کے فاضل مہتمم مولانا محمد طیّب صاحب کی دولت دیدار بھی حاصل ہوگئی، چہرہ کی نورانیت اور بشرہ کی شگفتگی ماشاء اللہ اب قابل رشک ہے..... عشاء کے وقت گھر واپس پہنچا تو لاہور کے بسیار نویس اور زود نویس اور خوب نویس اہل قلم میاں محمد اسلم کو منتظر پایا۔ میاں صاحب کے سے "لکھاڑ" کم ہی ہوں گے اور وہ ہر قسم کے تعارف سے بالاتر ہیں انھیں کے ہمراہ دہلی کے اشرف صبوحی بھی تھے۔ گمنام سے بھی

اور کچھ گوشہ نشین سے بھی۔ یہاں بھی بیٹھے تو دبے دبائے، سمٹے سمٹائے۔ گویا بات کرنا نہیں جانتے یا زبان کھولتے شرماتے ہیں۔ کیا کہئے کہ بیچارہ پبلسٹی کی ابجد سے بھی واقف نہیں، اپنی مشرقی وضعداری اور دہلوی شرافت کو لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ذرا بھی آگے بڑھنا جانتے تو آج کتنوں کا چراغ ان کے سامنے گل ہو گیا ہوتا۔ اب بھی جو کچھ لکھ دیا ہے دہلی کی ٹکسالی زبان وانشاء کے معیار سے آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔

لاہور، ۳/اپریل ۱۹۵۵ء

ہندوستان سے پاسپورٹ پر آئے ہوئے ہر نووارد کی حیثیت مجرم کی اگر نہیں تو نیم مجرم کی تو ہوتی ہی ہے۔ وارد ہوتے ہی پولیس اسٹیشن جاکر حاضری لکھنا ضروری ہے۔ مہمان سرکاری ہو جب بھی اس ضابطہ سے مفر نہیں، اتنی ہی رعایت بہت ہے کہ بجائے کل کے آج صبح یہ کام ہو اور بجائے اصالۃً حاضری کے سیکریٹری کے ذریعہ ہو گیا۔ شاہی مسجد کی زیارت اور مزار اقبال پر حاضری پروگرام کے ضروری اجزاء تھے۔ بحمد اللہ موقع مل گیا۔ مزار اقبال کی دوسری جانب مرحوم سرسکندر حیات خاں کی تربت بھی دیکھی اور دل اس سے بھی خاصہ متاثر رہا۔ راستہ میں شہید گنج کا مشہور و معروف گرودوارہ پڑا اور حافظہ کے سامنے مسجد شہید گنج ایجی ٹیشن کی ساری تاریخ پھر گئی۔ وہ مسلمانوں کا مجاہدانہ جوش و خروش، وہ سکھوں سے عدالتی اور میدانی مقابلہ، وہ احرار کے سرخ پوشوں اور ظفر علی خاں کے نیلی پوشوں کی آویزش، ہفتوں نہیں، مہینوں اس چپقلش کا تسلسل۔ یہ ساری باتیں گویا ابھی کل ہی ہوئی تھیں! آج لاہور شہر مسلمانوں کا اپنا ہے۔ آج تو یہ "مسجد" بلا تامل اور بغیر کسی دغدغہ کے مسجد ہی ہو سکتی تھی لیکن نہیں..... آنکھوں نے منظر اس کے برعکس پایا۔ مسجد نہیں یہ بدستور گرودوارہ ہے۔ اس پر پولیس کا پہرہ ہے۔ اور پہرا بھی کس کے خلاف؟ مانئے یا نہ مانئے خود مسلمانوں کے خلاف! یعنی پولیس اسی نگرانی کے لئے ہے کہ کوئی مسلمان اس قطعۂ

زمین پر نماز پڑھنا کیا معنی، یہاں قدم نہ رکھنے پائے! بلکہ دیر تک قریب کھڑا بھی نہ رہنے پائے!...... یا اللہ! یہ وہی پاکستانی مسلمان ہیں جن کے جنون و تعصب کا ایک عالم میں ڈھنڈورا پٹا ہوا...... گردوارہ بند رہتا ہے اور صرف سکھوں ہی کی آمد پر کھل سکتا ہے۔ ذہن بے ساختہ اپنے یوپی کی بابری مسجد (اجودھیا) کی طرف منتقل ہو گیا۔ عدالت دیوانی جو کچھ بھی فیصلہ کرے اس سے یہاں بحث نہیں۔ بحث اس سے ہے کہ کیا ہماری یوپی کی سیکولر حکومت اتنا نہیں کر سکتی تھی کہ تا فیصلہ عدالت اسے مقفل کر کے اسی طرح پولیس کا پہرا لگا دے اور جس طرح اسے مسجد باقی نہیں رکھا ہے ہندو مندر بن جانے سے بھی اسے روکے رہے؟

لاہور کی رونق کا کیا کہنا۔ ہر بڑے شہر کی طرح شہری و تمدنی چہل پہل سے لبریز۔ سیر و تفریح، گلگشت، کھیل تماشے کے مواقع خصوصاً چھاؤنی اور سول لائن کے حصوں میں قدم قدم پر موجود۔ مال روڈ (ٹھنڈی سڑک) سے بھی بار بار گزرنا ہوا۔ لیکن بے حیائی کے وہ منظر کہیں بھی دیکھنے میں نہ آئے جن کے لئے لاہور کی بدنامی اچھے اچھے ثقہ حلقوں میں مدت سے چلی آ رہی ہے۔ عورتیں یوں بھی سر بازار چلتی پھرتیں، تانگوں اور موٹروں پر دوڑتیں، سائیکلوں پر اڑتی زیادہ نظر نہ آئیں جو تھیں بھی وہ بھی عموماً برقع پوش۔ کھلے ہوئے چہروں کے ساتھ کم ہی تھیں اور بے حجابی اور بے حیائی کے ساتھ تو اور بھی کم۔ جتنی تھیں ایک اسلامی مملکت میں بیشک اتنی بھی نہ ہونا چاہئے تھیں یہاں سوال "چاہئے" کا نہیں، واقعہ کا ہے۔ واقعہ کے لحاظ سے عرض ہے کہ جتنے چرچے سنے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مشاہدہ کی شہادت تو بہت ہی کم کی ہے...... مسجدوں میں بجز فجر کے اور مختلف اوقات کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا کوئی مسجد ویران نہ ملی۔ سب جگہ نمازی اچھی خاصی تعداد میں نکلے۔ یہاں تک کہ مقبرۂ جہانگیر میں جو مسجد آبادی سے بالکل الگ ہے وہ بھی مغرب کے وقت نمازیوں سے یکسر خالی نہ تھی۔ بہر حال نمازیوں کی یہ تعداد اور مسجدوں کی یہ معموری بحمد اللہ ایسی نہ معلوم ہوئی جو کسی

مسلم مملکت کے بڑے شہر کے لئے باعث ننگ و رسوائی ہو۔ تیسرا مشاہدہ اسی سیاق و سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ سڑکوں کی تختیوں اور عمارتوں کے نام جوں کے توں ہیں۔ یہ نہیں ہوا کہ آزادی کے جوش میں آکر نزلہ غیر مسلم ناموں پر گرا ہو۔ جو دھنی رام اسٹریٹ تھی وہ آج بھی دھنی رام اسٹریٹ ہی ہے، اسے کوچہ باقی باللہ نہیں بنا دیا گیا، جو سر گنگا رام ہاسپٹل تھا وہ آج بھی بدستور سر گنگا رام ہاسپٹل ہی ہے یہ نہیں ہوا کہ اس کا نام دار الشفا جناح رکھ دیا گیا ہو! یہ بات بظاہر معمولی سی لیکن قوموں کے ذہنی توازن اور ملتوں کے ظرف کا اندازہ انھیں باتوں سے ہوتا رہتا ہے۔

مقبرۂ جہانگیر کا ذکر ابھی پانچ سطریں اوپر آیا ہے۔ ماثر کے لئے یہ مرقع عبرت بھی کچھ کم نہ تھا۔ آج یہاں فاتحہ پڑھنے کے لئے متنفس آتے ہیں۔ سیر و تماشہ کے لئے جتنا مجمع بھی ہو جاتا ہو لیکن چشم تصور کے سامنے ذرا وہ وقت لائیے جب آج سے چار صدی قبل اس شہنشاہ ہند کا انتقال ہوا ہو گا، "ظل سبحانی" کے اُٹھ جانے کی خبر سے رعایا کے دل پر کیا گزر کر رہی ہو گی، کیسا تلاطم مچ گیا ہو گا، کس غضب کی ہل چل شہر بھر میں پڑ گئی ہو گی! وہ دن کیسا کٹا ہو گا، بادشاہ کی تجہیز و تکفین و تدفین کا منظر کتنا موثر رہا ہو گا، جنازہ کا جلوس کس شان سے اُٹھا ہو گا۔ نماز جنازہ کس نے پڑھائی ہو گی۔ جس جگہ آج مقبرہ ہے اس وقت یہاں کون رہ رہا ہو گا، کس طرح عمارت مقبرہ اور باغ کے لئے یہ زمین حاصل کی گئی ہو گی۔ جن لوگوں کے دلوں میں بادشاہ پرستی بطور ایک دینی عقیدہ کے رچی ہوئی تھی ان سے بادشاہ کے لئے قبر کیوں کر کھدی ہو گی۔ بادشاہ کے لاشہ کو قبر میں کیوں کر اتارا گیا ہو گا۔ اس روز کس غضب کا سناٹا محسوس ہوا ہو گا۔ سوگ کیسا زبردست منایا گیا ہو گا اور آج ان چیزوں میں کسی کی کوئی اہمیت باقی ہے؟ دماغ میں اسی قسم کے بیسیوں سوالات چکر کھاتے رہے اور ہر لمحہ دنیا کی بے ثباتی اور اس کے جاہ و حشم کی بے حقیقتی کا درس ملتا رہا۔

---

(۵)

لاہور نمبر (۳)

خاطر داریاں

پارٹیوں اور دعوتوں کا سلسلہ عبدالوحید خاں صاحب کے ہاں سے شروع ہوا۔ ان کی پارٹی اچھی خاصی پر تکلف تھی۔ مہمانوں کی تعداد بھی میرے اندازے سے زائد اور کھانے کا طریق تو اپنے مذاق کے بالکل ہی برخلاف یعنی کھڑے کھڑے کھانا اور پینا۔ جس سے نہ کوئی لذت بڑھ جاتی ہے نہ کوئی سہولت کھانے پینے والوں کو حاصل ہوتی ہے اور نہ کوئی طبی ہی نفع اس میں ہے۔ خیر میں تو احتجاج کر کے کرسی پر بیٹھ گیا اور سالک صاحب وغیرہ دو ایک اور مہمانوں نے بھی میرا ساتھ دیا باقی اور حضرات اس خواہ مخواہ "صاحبیت" اور گناہ بے لذت قسم کے تشبہ بالنصاریٰ پر کچھ مطمئن ہی نظر آئے۔ یہ جدید ترین فیشن ہر اعتبار سے مکروہ اور تکلیف دہ ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر میزبان صاحب کے خلوص و محبت کے اعتراف کے ساتھ ان کی دل شکنی کا خطرہ لینے کے باوجود اس روداد سفر میں اس کا ذکر کیے دیتا ہوں۔ یہیں فضلی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی اور مل کر جی خوش ہوا۔ ہندوستان کے ایک ممتاز صاحب علم آئی سی ایس تھے اب پاکستان میں غالباً وزارت کشمیر کے سیکرٹری ہیں...... صاحب علم ہیں، صاحب ذوق ہیں اور بڑی بات یہ کہ صاحب فہم بھی ہیں اور سخن گوئی اور سخن فہمی دونوں میں مرتبہ امتیاز رکھتے ہیں...... یہیں اور بھی متعدد اہم ہستیوں سے نیاز حاصل ہوا اور بعض سے تجدید نیاز ہوئی۔ دو صاحب اور ملے غالباً سرکاری عہدہ دار اور یہاں کی لٹریری لیگ کے کارکن، ان کی فرمائش قدرۃً یہ ہوئی کہ ان کی انجمن کے ارکان سے ملا جائے، جواب میں دست بستہ معذرت کی گئی کہ کسی قسم کے پبلک اجتماع کی گنجائش اس

پروگرام میں نہیں۔ الحاح کے بعد بھی عذر قبول نہ ہوا۔ اور غالباً اس اعتذار کو بھی تکلف ہی پر محمول کیا گیا اور اصرار برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بعد کو کسی غلط فہمی کی بناء پر ایک انگریزی روزنامہ میں یہ اطلاع بھی شائع ہو گئی کہ ٹاؤن ہال میں فلاں دن، فلاں وقت میں تقریر کروں گا! ظاہر ہے کہ جب بڑی تعداد میں ارکان ہی سے ملنے میں تامل تھا تو اس پبلک میٹنگ میں شرکت کی کیا صورت ممکن تھی! عین وقت کے وقت ٹیلیفون پر معذرت کرنا چاہی۔ ٹاؤن ہال سے سلسلہ ہی نہ ملا جعفری صاحب اس کے گواہ ہیں بلکہ وہی تو میری طرف سے فون کر رہے تھے۔ لوگ جمع ہوئے ہوں گے اور بڑی ناگواری کے بعد ہی رخصت ہوئے ہوں گے لیکن اس قصور کی ذمہ داری اس عاصی پر بہت ہی کم ہے...... مخلصین کے ہاتھوں اس قسم کا تجربہ یہ پہلا نہیں ہوا۔ بارہا عرض کر چکا ہوں کہ میں پبلک لیڈر کسی درجہ کا بھی نہیں۔ اور اگر کبھی چھوٹا موٹا تھا بھی تو اس دور کو ختم ہوئے سالہا سال ہو چکے اب کسی پبلک اجتماع میں محض شرکت ہی سے طبیعت پر بار ہوتا ہے چہ جائیکہ اس میں تقریر یا صدارت وغیرہ۔ لیکن بار بار کے اس انکار و اعتذار کے باوجود بھی محبین و مخلصین کا ایک بڑا گروہ ہے جو اپنی اس فرمائش کی تعمیل پر اصرار برابر جاری رکھے ہوئے ہے۔ افسوس!

آشکارم دید و پنہانم نہ دید!

اور نوبت آخر میں بارہا فریقین کی ناگواری کی آچکی ہے!

دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ وسیع بھی تھا اور طویل بھی۔ اب سب یاد بھی کسے لیکن دو چار تو ایسی ہیں جو کسی حاصل میں بھی بھولنے والی نہیں۔ ان میں سے ایک شورش صاحب "چٹان" والوں کے ہاں تھی۔ نام مدت سے کان میں پڑا ہوا تھا۔ چٹان کی زیارت بھی ہر ہفتہ ہوتی رہتی تھی۔ ملے تو سراپا باغ نکلے۔ چٹان کی خشکی کرختگی اور صلابت کے بجائے مہر و وفا کے پتلے۔ تقریر و خطابت کا رنگ تحریر تک میں غالب ہوتا ہے، تو پھر گفتگو تو اس رنگ کی ہونا ہی تھی۔ پرچہ اور گفتگو دونوں سے سوشلسٹ قسم

کے مسلمان نظر آتے ہیں لیکن کھانے کی میز پر پورے نواب یا سرمایہ دار یا جاگیر دار۔ ابھی جوانی ہی کی آخری منزلوں میں ہیں لیکن اتنے ہی سن میں دس سال سے اوپر کی مدت جیل میں کاٹے ہوئے! خدا نہ کرے کہ اب کبھی جیل جانے کی نوبت آئے اور نہ وہ خود کبھی اپنے کو جیل کے لئے پیش کریں۔ ولایتی حکومت میں جیل جانے کے معنی کچھ اور تھے اور اب اپنی حکومت میں کچھ اور ہیں۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّار ہونا جس طرح ایک رنگ عبادت کا ہے اسی طرح رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی شان بھی امتثال امر اور تکمیل عبدیت ہی کی ہے۔...... یہیں ملاقات لاہور کے متعدد مشاہیر سالک صاحب، راجہ حسن اختر وغیرہ سے رہی اور یہیں پہلی بار زیارت حمید نظامی ایم اے ایڈیٹر روزنامہ "نوائے وقت" کی ہوئی۔ ان کے پرچہ کی اہمیت تو ہمیشہ سے دلنشین تھی، طبیعت ان کی شخصیت سے بھی متاثر ہوئی۔ پروقار، سنجیدہ ہر قسم کے سفلہ پن سے دور۔ یہ صفات معمولی نہیں۔ موجودہ زمانے میں ایک صحافی کے لئے غیر معمولی ہیں۔ خیال تھا کہ مجلس پر وہی چھائے ہوئے ہوں گے اور ایک ایک سے داستان "در وصف خودمی گوید" بیان ہو رہی ہوگی۔ اس کے برعکس وہ شرمیلے، متین، خاموش، خود دار نکلے۔

دوسرا امیرانہ بلکہ کہنا چاہئے کہ شاہانہ ڈنر صاحب "زمیندار" اختر علی خاں صاحب کے ہاں ہوا۔ آخر یہ بلند اختر صاحبزادہ کس باپ کے ہیں۔ وہی ہماہمی، اولوالعزمی، پُرتکلف مہمان نوازی میں اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین اور خلف الصدق۔ دفتر زمیندار کی بھی پرشکوہ عمارت کو گھوم پھر کر ابھی ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کھانوں کے تعدد کے ساتھ ساتھ مہمان بھی کثرت سے تھے۔ اور میزبان فرط اخلاق سے بچھے جاتے تھے۔ یہیں ملاقات وقار انبالوی صاحب ایڈیٹر روزنامہ احساس سے اور محمود نظامی صاحب ایڈیٹر قندیل سے ہوئی۔ جگر صاحب اتفاق سے اس وقت لاہور ہی میں مقیم تھے ان سے بھی نیاز حاصل رہا۔ حمید نظامی، شوکت تھانوی، سالک، شورش سب ہی اس محفل کو رونق بخشے ہوئے تھے۔

تیسرا پرتکلف ظہرانہ مشہور اسلامی ناول نگار میاں محمد اسلم صاحب کے ہاں تھا۔

اسے سادہ صرف اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ مہمانوں کی بھرمار نہ تھی۔ گنے چنے لوگ تھے۔ اشرف صبوحی، جعفری ندوی اور میاں صاحب کے ناشر بدر السلام فروغی۔ باقی جہاں تک انواع و اقسام کے کھانوں کا تعلق ہے میاں صاحب کے عمل اور قول میں تضاد ہی نظر آیا۔ کہاں تعلیم اسلامی سادگی کی اور کہاں عمل اس کے برعکس تکلف اور غذائی تعیش کا! لاہور میں سمجھتا تھا کہ تکلفات سے بری اور سادگی کا شہر ہوگا لیکن دعوتوں کے مسلسل تجربہ نے بتادیا کہ جہاں تک کھانا کھلانے کی شوقینیوں اور غذائی اسراف کا تعلق ہے لاہور کا قدم ذرا بھی لکھنؤ سے پیچھے نہیں اور کام و دہن کے چٹخاروں کے لحاظ سے اودھ اور پنجاب، ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان سب ایک ہی سطح پر ہیں۔

دعوتوں اور ضیافتوں کا ذکر نا تمام رہ جائے گا اگر اس واحد دعوت کا تذکرہ دلی شکر گزاری کے اضافہ کے ساتھ نہ کیا جائے جو عین میرے مذاق کی تھی۔ یہ دعوت کرنے والے شوکت تھانوی تھے۔ اس میں یہی نہیں کہ کھانوں کے اسراف بیجا سے پرہیز کیا گیا تھا یعنی کھانوں میں گو تعدد تھا لیکن تعدد اس بلا کا نہ تھا کہ میز کی میز بھر جائے اور دل کو یہ حسرت ہی رہے کہ کوئی ایک کھانا بھی تو سیر ہو کر نہ کھایا جاسکا اور پھر مہمانوں کی تعداد محدود در محدود۔ صرف دو صاحب باہر کے جن سے گفتگو ہر قسم کی بہ اطمینان کی جاسکی...... شوکت تھانوی لاکھ زندہ دل، بذلہ سنج اور ہنسوڑ سہی پھر آخر تھانوی ہیں۔

میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

مہمان کے مذاق کی یہ رعایت خاص فیض حضرت تھانویؒ کا ہے۔ کاش ان کی مثال دوسروں کے لئے باعث تقلید ہو...... مہر صاحب کے ہاں کا عصرانہ بھی خاموشی و یکسوئی کے لحاظ سے قابل داد تھا گو کھانوں کے تعدد و تنوع کے اعتبار سے ہرگز نہیں ...... جعفری ندوی کے ہاں کا صبح کا ناشتہ اور اکبر مرزا ایم اے دریابادی کے ہاں کا سہ پہر کا ناشتہ کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں کہ یہ دونوں بالکل خانگی ہی چیزیں تھیں۔ بڑے پرانے جامعی اور بڑے مخلص "اقبالی" سیّد نذیر نیازی سے ملاقات اکبر مرزا ہی کے ہاں سالہا سال کے بعد ہوئی۔

وہ تو کہئے اپنی قیام گاہ مانٹگومری روڈ، کوٹھی میجر صدیقی، شہر سے کئی میل دور چھاؤنی کے علاقہ کے بھی ایک کونے میں جا پڑی تھی ورنہ خدا جانے کتنی جگہ اور آنا جانا رہتا۔ محبت کرنے والوں کی آمد کا تو تانتا ہی بندھا رہتا۔ شہر کی جن شخصیتوں سے ملنا ملانا تھا ان میں سے اکثر سے نیاز تو انھیں دعوتوں ضیافتوں کے سلسلہ میں حاصل ہو گیا، کچھ ہستیاں ان کے علاوہ بھی قابل ذکر رہ جاتی ہیں۔

دہلی کے خواجہ محمد شفیع صاحب اسلوب بدیع۔ اس وقت دلی کی ٹکسالی زبان کے امام اور اقلیم انشاء کے فرمانروا ہیں۔ عجب اتفاق کہ جب تک ہندوستان میں رہے کبھی ملاقات کی نوبت ہی نہ آئی۔ اب مدت ہوئی ہجرت کر کے لاہور آ گئے ہیں (ہجرت کا لفظ ان کے لئے بالقصد استعمال ہوا۔ ان کے صبر و تحمل کے وہ وہ امتحانات سننے میں آئے جو صرف سچے مہاجروں کے نصیب میں آتے ہیں۔ ع دیئے داغ نے امتحاں کیسے کیسے) اور ٹمپل روڈ پر ان کا مسکن، حق ہے کہ بجائے خود ایک زیارت گاہ بن جائے۔ ملے اور دونوں ملاقاتوں میں اس شان تواضع و انکسار سے ملے کہ جیسے میں مخدوم ہوں اور وہ خادم، میں معلم ہوں وہ متعلم!

تواضع ز گردن فرازاں نکوست

اس مصرعہ کا محل اب سمجھ میں آیا۔ حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے "غدار" شہر میں اب تک بیکار ہیں۔ اور ان کی خدمات سے استفادہ نہ کوئی سرکاری محکمہ کر رہا ہے نہ کوئی غیر سرکاری ادارہ۔ عجب نہیں کہ اس صورت حال کی ذمہ داری خود انھیں کی بے پناہ خودداری پر ہو تاہم اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس میں نقصان ان کا نہیں اردو زبان، اردو لغت، اردو ادب و انشاء ہی کا ہے۔

سیّد ہاشمی فرید آبادی سے اردو کے پڑھے لکھوں کے طبقہ میں کون ناواقف ہو گا اپنے بھی بڑے قدیم مخلص و کرم فرما ہیں، شہرت بحیثیت مؤرخ اور تاریخی کتابوں کے مصنف و مترجم کے ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مؤرخ سے کہیں بڑھ کر ادیب و انشاء پرداز ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے رُوح رواں تھے اور بابائے اُردو کے

دست راست۔ اب معلوم ہوا کہ لاہور میں ہیں اور علیل۔ مکان ماڈل ٹاؤن میں بڑی ہی تلاش کے بعد ملا۔ ملے تو ماشاء اللہ اب تندرست نکلے، شگفتگی اور دینداری کا اتنا خوشگوار امتزاج دیکھنے میں کم ہی آیا ہے۔ اب کسی سرکاری ادارہ کی طرف سے تاریخ لاہور مرتب کر رہے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر چیز پڑھنے کے قابل ہوتی ہے۔

ایڈووکیٹ جنرل پاکستان فیاض علی صاحب سے توقع تو کراچی پہنچ کر ملنے کی تھی نعمت غیر مترقبہ کہ وہ یہیں لاہور میں مل گئے۔ اخلاص و محبت کے پتلے ہمیشہ سے تھے، اور اب اپنے پیشرو وسیم صاحب (مرحوم) کے جانشین ان کی اور اخلاقی خوبیوں اور بزرگیوں میں بھی ہوتے جاتے ہیں۔ اس وقت زبان خلق میں مطعون اس جرم میں ہو رہے ہیں کہ دوسری شادی کر لی ہے، اس خواہ مخواہ کی بدگوئی سے یہ پھر بھی نفع ہی میں ہیں کہ اس سے ان کے گناہ دُھلتے جاتے ہیں۔

غازی عبدالرحمٰن امرتسری کا اب تو لوگ نام ہی بھول گئے۔ کیسے بتایا جائے اور کیسے یاد دلایا جائے کہ آج سے ۲۵، ۳۰ سال قبل پنجاب بلکہ آل انڈیا مسلم سیاست میں ان کی کتنی اہمیت تھی۔ خلافت کمیٹی کے ہر جلسہ میں پیش پیش رہتے اور بعد کو جب جماعت احرار بنی تو اس کی روح رواں ایک عرصہ تک یہی تھے۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ خود انھیں کے صوبے والے انھیں بھلا بیٹھے ہیں ہیں۔ بڑی تلاش کے بعد پتہ چلا کہ اب پبلک زندگی سے قطعاً کنارہ کش ہو کر صرف وکیل کی حیثیت سے لاہور میں ہیں سراغ لگا کر ان کی کوٹھی تک پہنچا۔ وہ بھلا اب کیا پہچانتے۔ کئی اَتے پتے دیئے جب کہیں جا کر پہچانا۔ اور پھر تو لپٹ کر خوب ملے، دیر تک پچھلے تذکرے کرتے رہے۔ تقسیم ملک کے وقت کے حالات کی جو تفصیل انھوں نے بیان کی وہ بڑی حسرت ناک تھی۔ مصالحت و مفاہمت کے سامان ہونے پر تھے عین وقت پر کیسی کھنڈت پڑ گئی اور تقدیر الٰہی کن کن طریقوں پر بہر صورت پوری ہو کر رہی۔ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا

---

(۶)

لاہور نمبر (۴)

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

قصہ زُلف مختصر نہ ہوا!

لاہور اور لاہوریات کے ذکر میں آخر کچھ تو ایسی دلکشی ہے کہ بات ختم ہونے ہی نہیں آتی۔ اور یقین تو ہے کہ جب قصہ گو کی زبان نہیں تھکتی اور دل نہیں اکتاتا تو سامعین کا دم کیوں گھبرائے اور کیوں وہ انگڑائی لینے لگیں! ...... ذکر لاہور کے ملاقاتیوں اور کرم فرماؤں کا چل رہا تھا۔

صدق کے ایک خصوصی کرم فرما فیروز پور روڈ پر رہتے ہیں۔ خان بہادر عبدالرحیم صاحب ایڈوکیٹ، پہلے سرکاری وکیل تھے۔ مدیر صدق کے علیگڑھی ہمعصر، اپنے زمانہ کے بڑے ممتاز طالب علم، یونین کے وائس پریذیڈنٹ، تیز، طرار، ذہین، خوش تقریر اور چھریرے جسم کے خوش قامت نوجوان، خدمات ملی کا چسکا اسی وقت سے پڑا ہوا۔ مولانا محمد علی کے پرستاروں میں شامل، اب جو ۴۲، ۴۳ سال کے بعد ملنا ہوا تو وہ نقشہ ہی سرے سے بدلا ہوا۔ تمامتر "برندہ رنگ رمیدہ بو" لیکن سیرت کے جوہر شاید اب کہیں زیادہ چمکدار ہو گئے ہیں اور اخلاص کی دولت کچھ اور ترقی ہی پر ہے...... بیچارہ کھلانا پلانا بہت کچھ چاہتے تھے۔ وقت اس کے لئے کسی طرح نہ نکل سکا اور ان سے دل کو شرمندگی ہی رہی۔

مہر و سالک کے لئے شاید پہلے کہہ آیا ہوں کہ ایک زمانہ میں لاہوری صحافت کے آفتاب و ماہتاب تھے اور اپنا لاہور اس وقت عبارت انھیں دونوں کی ذات سے تھا۔ ان میں سے مہر صاحب سے تو بسلسلہ مجلس خلافت دہلی اور لکھنؤ میں بارہا ملاقاتیں بھی

ہو چکی تھیں، سالک صاحب سے شخصی نیاز اکی پہلی بار حاصل ہوا۔ اور یکجائی متعدد صحبتوں میں رہی، خوب شخص نکلے۔ جتنا سنا تھا اس سے بہتر ہی انھیں پایا، علم مجلس کے ماہر، بڑے زندہ دل، بڑے بذلہ سنج، بڑے حاضر جواب، لطیفہ گوئی میں ان کا مد مقابل اور ان سے ٹکر لینے والا تو خاص لاہور ہی میں ایک آدھ اُستاد اور بھی موجود ہے لیکن جو شان خصوصی حضرت اکبر الہ آبادی کی تھی، اس کی جھلک اگر کہیں دیکھنے میں آئی تو سالک ہی کے ہاں۔ وہی حکیمانہ نکتہ سنجی اور وہی چلے ہوئے اشعار میں بے تکلف تصرف اور اصلاح کا ملکہ!...... ان کے صاحبزادہ عبدالسلام خورشید ایم اے کا بس سرسری ہی آمنا سامنا ہوا۔ ہر طرح ہونہار، قابل التفات نظر آئے۔ اسکول آف جرنلزم کے استاد ہیں جی میں تھا کہ اس موضوع پر اور دوسرے موضوعوں پر بھی ان سے ذرا کھل کر گفتگو کیجئے، وقت میں مطلق گنجائش نہ نکل سکی...... مہر صاحب سنجیدہ ہمیشہ کے تھے اب سنجیدگی میں ترقی ہو گئی ہے۔ ڈر ہے خشکی تک نہ پہنچ جائے۔ روشن خیال بھی شروع سے تھے، اب روشن خیال تر نظر آئے۔ ڈر ہے کہ تجدد تک نہ پہنچ جائیں۔ کھلانے پلانے میں دریادلی برتی اور گفتگو میں ایڈیٹر اور صحافی سے زیادہ مفکر و مصنف دکھائی دیئے۔

اپنی برادری والوں میں ایک صاحب امیر الدین قدوائی ایم اے، ایل ایل بی تھے۔ علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم کے شاگرد رشید، بڑے پرجوش مسلم لیگی تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آگئے ہیں اور یونیورسٹی میں لاء لیکچرر (استاد قانون) ہیں۔ ان کے متعلق یہ لطیفہ یہاں عجیب سننے میں آیا کہ جب یہ شروع شروع یہاں آئے ہیں تو ان کے قدوائی ہونے کی بنا پر یہاں کی خفیہ پولیس انہیں وزیر سرکار ہند رفیع احمد قدوائی کا بھائی سمجھی اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہو نہ ہو، یہ یہاں جاسوسی کی غرض سے آئے ہیں چنانچہ شاید ان کی نگرانی بھی جاری رہی! ایک فلسفہ خیال کے مالک ہیں اور یہاں اپنی ہمت و حوصلہ کے لائق کام کا میدان نہیں پاتے، اچھا ہے، اگر ان کے لئے ارض حرم (خصوصاً مدینۂ منورہ) میں قیام کی کوئی صورت نکل آئے تاکہ وہاں یہ دل کھول کر اپنے تبلیغی مشن کو جاری رکھ سکیں۔

دوسرے ملنے والوں میں نام مولوی فضل قدیر ندوی اور مولوی رشید اختر ندوی کے اور خیال میں آرہے ہیں۔ یہ دونوں ندوی ہونے کی بنا پر گویا اپنی برادری ہی کے لوگ ہیں اور مولوی فضل قدیر صاحب کی پرجوش مذہبیت تو بالکل ظاہر ہی ہے۔ صدق نوازوں میں ایک صاحب حسن دین صاحب کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ غالباً محکمہ ڈاک میں کسی عہدہ پر ہیں۔ جن صاحبوں سے ملاقات نہ ہو سکی اور ان کی ملاقات کی حسرت ہی لئے ہوئے لاہور سے روانگی ہوگئی ان میں نمبر اوّل پر نام ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایم اے، پی ایچ ڈی (علیگ) کا ہے۔ فلسفۂ تصوّف پر انگریزی میں لکھنے والے اور ڈاکٹر سید ظفرالحسن مرحوم کے شاگرد رشید غالباً یہاں کالج میں پرنسپل ہیں[1]۔ صدق کے ایک اور مخلص حکیم سید علی احمد نیرؔ واسطی کا بھی ایک نامۂ محبت شمامہ وطن میں مل چکا تھا۔ خدا معلوم ملاقات کس طرح رہ گئی۔ اور ہاں رستم زماں گاما پہلوان کی زیارت کی بڑی تمنا دل میں تھی۔ گو اب شمع جھلملا رہی ہے اور وہ بیچارے رستم دوراں اب نام ہی کے رہ گئے ہیں پھر بھی ان کی ذات مسلمانوں کا نام اونچا کیے ہوئے ہے اور ایسی ہستی کی زیارت بجائے خود ایک عبادت ہے...... فرصت ہوتی تو روزنامہ پیسہ اخبار (مرحوم) کے اجڑے ہوئے دفتر کی زیارت کو بھی ضرور جاتا اور اس کھنڈر سے عبرت کے بڑے سبق حاصل کرتا۔ نئی نسل کو کوئی کیا بتائے کہ آج سے ۴۵ سال قبل پیسہ اخبار پنجاب ہی میں نہیں سارے ہندوستان کی اُردو صحافت میں کیا درجہ رکھتا تھا۔

زندہ اخبار نویسوں میں میکش صاحب سے بھی ملاقات کی آرزو ہی رہ گئی۔ آج کل اپنا روزنامہ نوائے پاکستان نکال رہے ہیں۔ ثقہ راویوں سے سننے میں آیا کہ لاہور میں گنتی کے جو چند بااصول اور صاحب ضمیر و دیانت ایڈیٹر صاحبان ہیں، یہ انھیں میں سے ہیں...... اور اس وقت کسی کے لئے یہ داد بڑی داد ہے...... فرصت زندوں ہی سے نہ ملی تو قبرستانوں تک کیا پہنچ سکتا تھا۔ اگر جانا ممکن ہوتا تو ڈاکٹر سید ظفرالحسن مرحوم ایم اے، پی ایچ ڈی کی تربت پر ضرور حاضری دیتا۔ علی گڑھ میں مدتوں صدر شعبہ فلسفہ

---

[1] بعد کو علم ہوا کہ اسلامک انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔

رہے۔ صورت دیکھئے تو داڑھی کی درازی اور چہرہ کی نورانیت کے لحاظ سے روایتی خواجہ خضر! عقائد کے لحاظ سے بڑے پختہ مومن بلکہ مومن گر...... یہ انھیں کا فیض و تصرف تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے بعض اور شعبوں میں الحاد اور بے دینی کی جتنی بھی گرم بازاری رہی ہو، عین اسی دَور میں شعبہ فلسفہ اس وبا سے نہ صرف محفوظ و غیر متاثر رہا بلکہ اُلٹے اس کی اصلاح و علاج میں خاصی حد تک کامیاب رہا...... لوگوں نے بزرگی اور ولایت کا اپنے دماغ میں ایک محدود و مخصوص سانچا تیار کر رکھا ہے حالانکہ جو کوئی بھی پختہ ایمانی کے ساتھ خدمت دین و عمل صالح کی راہ اختیار کرے وہ بے کھٹکے بزرگ اور ولی اللہ ہو سکتا ہے۔

لاہور کا ایک نامور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ یا بزمِ اقبال ہے۔ یہ گو ضابطہ سے سرکاری نہیں لیکن گراں بہا سرکاری امداد کی بنا پر نیم سرکاری ضرور ہے اور اس کی حیثیت نیم دینی تعلیمی، یا اسی کی زبان میں "ثقافتی" ہے اس کے صدر یا ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے، پی ایچ ڈی سابق صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی (دکن) ہیں۔ اور اس کے دوسرے کارکنوں میں مولانا شاہ محمد جعفر ندوی، مظہر الدین صدیقی صاحب اور مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی بھی شامل ہیں۔ اس کی مطبوعات کی تعداد ۳۰، ۴۰ سے کیا کم ہوگی ان میں سے ۸، ۱۰ انگریزی میں بھی ہیں۔ بعض پر ریویو صدق میں بھی نکل چکا ہے اور اس کے ماہنامہ ثقافت کا تذکرہ بھی اس کے صفحات پر آچکا ہے ادارہ کے دیکھنے کا کمال اشتیاق تھا۔ قیام کا آخری دن تھا کہ آرزو پوری ہوئی۔ دوپہر کا وقت، فضلی صاحب بھی ساتھ تھے، دیکھا تو ادارہ کے کاروبار کا جتنا اندازہ تھا اس سے کہیں زیادہ وسیع پایا۔ ایک لق و دق عالی شان عمارت اور بڑے صاف ستھرے آراستہ کمرے۔ رفیقوں سے بات چیت رہی، اور سب سے بڑھ کر خود خلیفہ صاحب سے۔ خلیفہ صاحب کے عقائد اور شخصیت دونوں سے متعلق عجیب و غریب روایتیں پڑھنے میں آچکی تھیں، مگر ملاقات کے وقت تو ان کی سیرت کا روشن ہی رُخ پیش نظر رہا اور گفتگو

وہ بڑی سلجھی ہوئی کرتے رہے۔

چلتے وقت کتابوں کا ایک بڑا سا پشتارہ ساتھ ہوا۔ سرسری نظر کرنے سے اندازہ ہوا کہ ادارہ کام تو واقعی بہت کر رہا ہے اور مسلمانوں کے عام اداروں کی طرح معطل، جامد اور مجہول نہیں بلکہ فعال، متحرک و سرگرم کار ہے۔ البتہ سوال یہ رہتا ہے کہ کام دینی و ملی اعتبار سے ملی بھی ہے یا اس کے برعکس غارتگر دین و مصالح ملت؟...... اس کے تفصیلی جواب کا یہ موقع نہیں۔ اجمالاً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بعض گروہوں خصوصاً پرویزیوں اور کمیونسٹوں کی تردید میں اور عام مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حق میں تو ادارہ یقیناً مفید علمی اور ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے اور بحیثیت مجموعی اس کا شمار انھیں اداروں میں ہونا چاہئے جن کے خیر کا پہلو ان کے شر کے پہلو پر غالب ہے لیکن نکتہ چینیوں کی جو شکایت خود ادارہ کی بعض اعتقادی گمراہیوں اور بے احتیاطیوں سے ہے وہ بھی بے اصل نہیں گو مبالغہ آمیز ہو۔

اتفاق سے عین اسی زمانہ میں امرتسر میں ہاکی میچ تھا۔ اور ان آنکھوں نے دیکھا کہ تماشا دیکھنے کے لئے سارا شہر لاہور ڈھلا چلا جا رہا تھا! ریل سے، بسوں سے، سائیکلوں سے، تانگوں سے ہر ممکن سواری سے، ہزار ہا لاہوری امرتسر کے لئے راہی تھے۔ سڑکوں پر وہ ہجوم کہ راستہ چلنا دشوار۔ کبھی دو "دشمن" ملکوں میں ایک دوسرے کے کھیل دیکھنے دکھانے کا یہ گرما گرم اشتیاق کہیں اور کیوں دیکھا گیا ہو گا؟...... زندہ باد راجہ غضنفر علی خاں! آخر پرانے کھلاڑی ہیں، کھیل کھیل میں اس پاکستانی ہائی کمشنر نے اتحاد و اشتراک کا وہ تماشا دکھایا کہ فریقین کے بڑے بڑے گھاگ اہل سیاست منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

عین اسی وقت افغانیوں کے ہاتھوں پاکستان کے قومی جھنڈے کی توہین کا قصہ بھی پیش آیا تھا اور اس کے متعاقب بلوے اور فسادات، خونریزی، اور زبان و قلم سے آتشبازی! ہندوستان کا معاملہ تو اس وقت دب دبا سا گیا تھا، غصہ و جوش انتقام کا سارا رخ میں نے دیکھا کہ افغانستان کی طرف پھرا ہوا ہے۔ مختلف مجلسوں اور صحبتوں میں یہی

چرچا اور اخبارات کی سرخیوں سے گویا خون ٹپکتا ہوا...... پاکستان کی ہوا خواہی کی بنا پر دل اس خیال سے بھی لرزتا تھا کہ اپنی موجودہ بے سروسامانی اور اندرونی خلفشار کی حالت میں پاکستان کو دنیا کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سلطنت سے بھی آویزش کرنا پڑے چہ جائیکہ افغانستان جیسے مسلم ہمسایہ سے! لیکن جوش و خروش کے نقار خانہ میں صلح و آشتی کی ایک ضعیف و نحیف آواز بھلا سن ہی کون سکتا تھا!



(۷)

لاہور سے کراچی تک

دن گزرتے دیر کیا لگتی ہے۔ بات کہتے ۳ ساڑھے ۳ دن کی مدت ختم ہو گئی۔ اور ۶/ اپریل کو صبح مسافر کا قدم خیبر میل سے کراچی کے لئے اٹھ گیا۔ ٹکٹ کے سرکاری انتظامات سر فراز احمد صاحب اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر کی مہربانی سے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ اسٹیشن آیا تو علاوہ میزبان اور ان کے عزیزوں کے مولوی رئیس احمد جعفری، خواجہ شفیع دہلوی اور اشرف صبوحی وغیرہ کو موجود پایا۔ اور انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے اگلے اسٹیشن پر سر فراز صاحب بھی ملے۔ خواجہ شفیع سلمہ اللہ کی تواضع و فروتنی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اسٹیشن پر آکر اور گاڑی چھوٹتے وقت مجمع عام میں تو انھوں نے اپنی خاکساری کا مظاہرہ اس بلا کا کیا کہ میں کٹ کر رہ گیا!...... کوئی آٹھ (۸) کا وقت ہو گا کہ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب کراچی کہیں کل صبح تقریباً اسی وقت پہنچے گی ۲۳ ساڑھے ۲۳ گھنٹہ کا وقفہ اچھا خاصا سوچنے ساچنے کا مل گیا!...... ہندوستان کی گاڑیوں میں تو اکثر ہم سفر غیر مسلم ہی ہوتے تھے یہاں اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی لیکن اتفاق سے عین اسی درجہ میں ایک یورپین کیتھولک پادری صاحب سفر کر رہے ہیں۔ صلیب گردن میں لٹکی ہوئی ہے۔ مسلمانوں میں بھی گلے میں نقش، تعویذ وغیرہ ڈالے رہنے کا رواج عجب نہیں جو انھیں قوموں سے آیا ہو۔

لاہور سے مل جل کر ایک بڑا افسوسناک اور تکلیف دہ پہلو پاکستان کا نظر کے سامنے آگیا تھا۔ کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کی طرف سے صاف نہیں۔ اور عوام و خواص سب مل کر کہنا چاہئے کہ حکومت کی طرف سے غیر مطمئن۔ ہندوستان میں رہ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی طرف سے بے اطمینانی شاید یہیں کا حصہ ہے۔ لاہور

پہنچ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہاں یہ وبا وہاں سے کچھ شدید تر ہی ہے۔ اب حکومت "اپنی" ہے۔ چاہئے تھا کہ اسے ہر ہر فرد "اپنی" سمجھتا، واقعتہً صورت حال اس کے برعکس، بہ استثناء قلیل شاید کوئی بھی "اپنی" نہیں سمجھتا۔ نکتہ چینی کا انداز بالکل "غیروں" کا سا، اور لہجہ کی تلخی اس احساس مغائرت کا قدرتی نتیجہ! اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو کہتے ہوئے پایا کہ "یہاں آیا ہی کون۔ مسلمانوں کا دل دماغ تو ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ آخور کی بھرتی ہمارے نصیب میں آئی۔ مولوی ہوں یا لیڈر سب تھرڈ کلاس ہمارے حصہ میں پڑے۔ ابتری اور افراتفری اس کا لازمی نتیجہ ہونا ہی تھا"...... شکایت کا یہ جزو تمام تر بیجا اور خلاف واقعہ تھا۔ طبقۂ علماء میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد شفیع دیوبندی اور مولانا ظفر احمد عثمانی آخر یہیں منتقل ہو آئے۔ سیاسی لیڈروں میں لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، خواجہ ناظم الدین سب نے اسی ملک کا انتخاب کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے چوٹی کے لوگ ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن اور اساتذۂ فن یہیں آگئے، ڈاکٹروں، بیرسٹروں، ایڈوکیٹوں، انجینئروں، تاجروں کے چیدہ چیدہ افراد اسی سرزمین میں آکر بس گئے۔ وسیم صاحب، فیاض علی صاحب، لاری صاحب کس کس کے نام گنائے جائیں۔ بابائے اُردو عبدالحق ہندوستانی سے پاکستانی ہو گئے۔ سیماب اکبر آبادی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی، شوکت تھانوی، سیّد ہاشمی فرید آبادی، رازق الخیری اور مُلّا واحدی نے اپنا وطن اُجاڑ کر اسی سرزمین کو آباد کیا۔ میر لائق علی حیدر آبادی، شاہ صنعت و حرفت ملک غلام محمد اور خواجہ زاہد حسین جیسے ماہرین فنانس اور ڈاکٹر سلیم الزماں سا کیمیکل ایکسپرٹ سب کھنچ کر یہیں آرہے اور کوئی منتخب ناموں کی فہرست مکمل کرنا چاہئے تو میزان بیسیوں کی نہیں پچاسوں کی پہنچے گی۔ ان سب کے بابرکت وجود کو ٹھکرانا، نہ قدرشناسی کا اچھا نمونہ ہے نہ شکر گزاری کا۔ اور ان میں سے بعض اگر بہت جلد اللہ کو پیارے ہو گئے تو اُس میں بندہ کا کیا قصور......؟ اصل یہ ہے کہ امیدیں ہی قیام پاکستان سے بہت زیادہ قائم کر لی گئی تھیں اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس کے وجود میں آتے ہی مشکلات چشم زدن میں دور ہو جائیں گی، اور بغیر

انتہائی جدوجہد، ایثار و قربانی کے ہر دشواری خود بخود حل ہوتی چلی جائیں گی! افسوسناک اندرونی آویزش اور باہمی چپقلش میں قصور یقیناً مرکزی حکومت اور صوبہ دار حکومتوں کا بھی ہے۔ لیکن عام پبلک اور اس کا کوئی بھی طبقہ اپنے حصہ کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ اپنے اپنے حصہ رُسدی کے مطابق قصوروار سارے ہی فریق ہیں۔ کاش مسلسل دوسروں پر نکتہ چینی اور دوسروں ہی کی عیب جوئی کے بجائے خود تنقیدی اور احتساب نفس کے ہم خوگر ہوتے!

ادھر دماغ اسی طرح کے سوچ ساچ میں لگا ہوا تھا اور کچھ وقت مطالعہ کتب میں صرف ہو رہا تھا اور اُدھر راستہ طے ہوتا جا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن اور پھر دوسرا اور تیسرا۔ لیکن یہ ایک نئی بات کیا ہے کہ ہر پلیٹ فارم پر ایک نمایاں ستون سے بندھا ہوا ہاتھ رہنمائی کس جانب اور نشاندہی کس چیز کی کر رہا ہے؟...... یہ قبلہ نما ہے اور نشاندہی سمت قبلہ کی ہو رہی ہے! لاہور سے کراچی تک ساڑھے سات سو میل تک رہنمائی سمت قبلہ کی اسی طرح ہر اسٹیشن پر ہوتی رہے گی! دل سے جزائے خیر کی دعا حکام ریلوے کے لئے نکلی...... کم سے کم پاکستان ریلوے کا محکمہ تو کچھ لاج پاکستانی اور مسلم مملکت ہونے کی رکھے ہوئے ہے! گاڑیوں پر اُردو خط میں "پاکستان ریلوے" لکھے ہونے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسرا نظارہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر اور خوشگوار ترین قبلہ نمائی کا رہا...... مسلم مملکت برائے نام بھی بہرحال مسلم ہی مملکت ہوتی ہے۔

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

اسی مقام و منزل کا ترجمان ہے۔

لوگوں نے ڈرا رکھا تھا کہ راستہ ریگستانی ہے۔ پانی کا قحط اکثر اسٹیشنوں پر ہو گا اس لئے صراحیاں خوب خوب پانی سے بھری ہوئی ساتھ رکھنا۔ اور راہ میں گرد و غبار اڑے گا آندھی کا سماں ملے گا...... ان دونوں باتوں میں سے پہلی تو بہت ہی مبالغہ آمیز نکلی، پانی ماشاءاللہ ہر جگہ بہ افراط ملتا رہا۔ دوسری بات البتہ خاصی حد تک صحیح نکلی۔ گرد و غبار

سے سابقہ تو ریل کے تقریباً ہر بڑے سفر میں پڑتا ہی رہتا ہے مگر اس راستہ میں اور زیادہ رہا۔ لیکن کھڑکیاں چڑھا لینے سے اور ان کے نیچے کی پٹری پر جہاں وہ دروازے سے ملحق ہوتی ہے پانی ڈالتے رہنے سے بہت کچھ امن حاصل ہو جاتا ہے۔ باہر سے گرد کے فراٹے آکر وہیں پانی کی تری پا کر جم جاتے ہیں۔ درجہ کے اندر بہت کم آپاتے ہیں۔ ایک مخلص عزیز اور بڑے "صدق" نواز شیخ فہیم الزماں رامپوری (اف۔ زمان) پاکستانی ہوائیہ میں اسکواڈرن لیڈر، پشاور سے لاہور رخصت لے کر آگئے تھے اور وہاں بھی بڑے کار آمد اور بڑے کارگزار ثابت ہوئے تھے۔ انھیں نے یہ تدبیر بتائی تھی اور اپنے تجربہ میں خاصی کامیاب رہی۔

اسٹیشن پر اسٹیشن گزرتے رہے۔ یہ ملتان آیا وہ بہاولپور گزرا، یہ خانپور ملا وہ خانیوال نظر آیا، ابھی گاڑی سمہ سٹہ سے گزری اور ابھی حیدر آباد پر رکی۔ پنجاب ختم ہوا سندھ کے حدود شروع ہوئے...... ہر بڑے اسٹیشن پر ان علاقوں میں امت کی نو سو سال پرانی تاریخ کا دفتر گویا دماغ کے سامنے کھل جاتا تھا۔ سندھ میں مسلمانوں نے یوں پہلا قدم رکھا ہو گا۔ اجنبی ملک میں، اجنبی سرزمین پر کیسی کیسی دقتیں اٹھائی ہوں گی، کیا کیا مجاہدے کئے ہوں گے، صبر و ہمت کے امتحانات کیسے کیسے دیئے ہوں گے۔ دریائے سندھ کو یوں عبور کیا ہو گا، پنجاب پر رفتہ رفتہ یوں قبضہ کیا ہو گا۔ آہستہ آہستہ سارے علاقہ پر یوں پھیلتے گئے ہوں گے، کتنوں نے جام شہادت یہیں پیا ہو گا، کتنے زندہ سلامت آگے بڑھے ہوں گے، کس دل و جگر کے تھے جنھوں نے اذان کی پہلی آواز اس سرزمین پر بلند کی ہو گی! تبلیغ میں کیسی کیسی جانگداز دشواریاں شروع میں پیش آئی ہوں گی۔ کتنے گمنام غازیوں اور مجاہدوں کے لاشے اس سرزمین میں امانت ہوں گے جن کی قبروں کے نشان صدہا سال ہوئے کہ مٹ چکے ہیں۔ بہاولپور اسٹیشن کے نظارہ سے قلب نے تاثر خصوصی قبول کیا۔ پولیس کے جوانوں کی وردی کا ایک جزو "ترکی ٹوپی" تھی اب اس کی کوئی اہمیت کیا بیان کرے! آنکھیں اس کے دیکھنے کو گویا مدت سے

ترسی ہوئی تھیں۔ ایک زمانہ تھا یہ "علامت نیچریت" کی تھی۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں اسلام کا نشان بن گئی اور داڑھی کی طرح یہ بھی غیروں سے اپنوں کو ممتاز کرنے لگی اور حیدر آباد دکن میں تو کثرت سے ہندوؤں کو بھی اسے استعمال کرتے دیکھا تھا۔ گویا یہ ایک علامت اعزاز کی تھی۔ دیکھتے دیکھتے یہ زمانہ آگیا کہ یہ عنقا کے حکم میں داخل ہو گئی! یہاں تک کہ علی گڑھ جو اس کی اصلی منڈی تھی وہاں سے بھی رخصت ہو گئی۔ آج جو اس کی از سر نو بہار دیکھی گویا روح تر و تازہ ہو گئی۔ پرانی یادوں کی بھی کیا بات ہوتی ہے!

سہ پہر کا وقت تھا کہ کسی اسٹیشن پر کراچی کا مشہور انگریزی روزنامہ "ڈان" خریدا (اس سے پہلے تو لاہور ہی کے اخبارات ملتے رہے تھے) ۷/اپریل ۵۵ء کا پرچہ تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ خبروں کے صفحہ پر میرے ورودِ کراچی کی اطلاع جلی سرخی کے ساتھ درج ہے۔ غضب کر دیا اس اخبار نے بھی۔ اب جو نہ جانتے ہوں گے وہ بھی میری آمد کو جان جائیں اور اسٹیشن پر ضرور ہجوم کریں گے!...... خیر اتنا غنیمت ہے کہ کراچی کے دو اسٹیشنوں میں سے کسی کی تعین اس میں نہیں۔ کچھ لوگ یقیناً غلط اسٹیشن پر پہنچیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ گاڑی کا نام بھی اس میں غلط چھپا ہے۔ میں تو خیبر میل سے چل رہا ہوں اور اس میں چھپا پنجاب ایکسپریس ہے! بہت سے لوگ بیچارے ضرور اس سے تکلیف اٹھائیں گے اور میری تلاش میں بھٹکیں گے لیکن بہر حال استقبالی ہجوم میں تو کمی رہے گی۔ لیکن یہ کسے معلوم کہ خبر کی اشاعت "ڈان" ہی تک محدود ہے کسی اردو اخبار نے بھی اگر چھاپ دی تو اور بھی غضب ہو گا۔ صبح ہوئی اور کراچی کی دلکش فضا میلوں قبل سے شروع ہو گئی۔ اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر ست!

اور یہ شہر تو ایک نہیں خدا معلوم کتنے عزیزوں، دوستوں، مخلصوں اور بزرگوں کا مدفن ہے۔ مولانا سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مسعود عالم ندوی، گلنار بیگم، وسیم صاحب، چودھری خلیق الزماں کے دو چھوٹے بھائی سعید الزماں و مشفق الزماں، حکیم وزیر حسن لکھنوی، چودھری نعیم اللہ، تفضل کریم دریا بادی وغیرھم ورحم اللہ علیہم۔ نام کن کن کے یاد آتے چلے جاتے ہیں۔

(۸)

کراچی نمبر (۱)

مخلصوں کے جھرمٹ میں

اسٹیشن آگیا۔ اور یہ کراچی کا پہلا یعنی کنٹونمنٹ اسٹیشن ہے۔ گاڑی رُک ہی رہی تھی کہ مجمع پر نظر پڑ گئی اور ہجوم سے اندازہ ہو گیا کہ یہیں اُترنا ہے، اپنے عزیزوں اور قدیم مخلص شناساؤں ہی کی تعداد ماشاء اللہ اس شہر میں کیا کم تھی کہ اخباری اطلاع کی بنا پر نئے نئے مخلصوں اور کرم فرماؤں کا اضافہ، فلاں بھائی اور فلاں بھتیجے، یہ ملا واحدی، وہ رازق الخیری، یہ محمد عشیر چیف نیوز ایڈیٹر "ڈان"، وہ سعید الحق چیف نیوز ایڈیٹر کراچی ریڈیو، یہ ضیاء الدین احمد برنی اور وہ بشیر احمد صدیقی، یہ ابو عاصم وہ سید سلمان اور سب سے نمایاں انگریزی پندرہ روزہ الاسلام والے خواجہ عبد الوحید لاہوری ثم کراچوی اس مجمع میں ملے جلے نئے نئے چہرے یہ فلاں پارٹی کے سیکرٹری ہیں اور وہ فلاں انجمن کے نمائندہ ہیں اور اکثر سے تعارف خواجہ عبد الوحید کرا رہے ہیں۔ انھیں "صدق" نوازوں میں سے ایک صاحب ایسے بھی ملے جنہوں نے مصافحہ والے ہاتھ سے "صدق" کے پتہ کی چٹ بھی ہاتھ میں تھما دی۔ گھر پہنچ کر جب اس چٹ کو دیکھنے کی مہلت ملی تو دیکھا کہ اس کے اندر ایک معقول رقم کا نوٹ بھی صدق کی امداد کے لئے رکھا ہوا ہے! اور ذرا آگے بڑھے تو کیا دیکھا کہ بابائے اُردو ڈاکٹر عبد الحق بہ نفس نفیس چلے آرہے ہیں۔ اس سن و سال میں یہ جواں ہمتی اور اپنے ایک خورد کی عزت افزائی، ان کا کرم ہی کرم ہے۔ مصافحہ اور معانقہ کا شوق ہے کہ ابلا پڑتا ہے نو وارد مسافر کی جان غضب میں کہ اِدھر اسباب کو سنبھالے یا اُدھر ان استقبالیوں کا دل نہ تھوڑا ہونے دے! حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایتوں کی قدر ایسے ہی موقعوں پر ہوتی

ہے تاکید ہے کہ نووارد مسافر پر اکبارگی ہجوم نہ کرو، اسے اطمینان سے اتر لینے دو، سامان اُتروا لینے دو...... دل ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کہاں جانا ہوگا اور اتنے عزیزوں، مخلصوں میں سے کس کے ہاں ٹھہرنا ہوگا کہ یک بیک گورنر جنرل بہادر کے اے ڈی سی کی سفید براق وردی نمودار ہوئی۔ اور لیفٹیننٹ امام کی خوشگوار آمد نے اس تذبذب سے نجات دلادی۔ مہمان کی منزل وہی ٹھہری جو معزز میزبان کا قصر عالی تھا۔ دوسر کاری موٹر ہوا سے باتیں کرتے ہوئے روانہ ہوئے اور منٹوں کے اندر اس انوکھے مسافر کی پو۔ ی پارٹی گورنر جنرل ہاؤس میں داخل تھی!...... غالب کا مشہور مصرعہ

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یوں بھی تو پڑھا جاسکتا ہے ؎

کبھی ہم اپنے کو اور ان کے گھر کو دیکھتے ہیں!

گورنمنٹ ہاؤس کو اپنے لکھنؤ میں لاٹ صاحب کی کوٹھی کہتے ہیں۔ اور یہ تو لاٹ صاحب کی نہیں بڑے لاٹ صاحب کی کوٹھی تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس میں صوبہ کے گورنر رہا کرتے ہیں۔ یہ تو گورنر جنرل ہاؤس کہلاتا ہے۔ اس کے رقبہ کی وسعت کا، اس کے تکلفات کا، حسن انتظام کا کیا کہنا۔ لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاؤس میں جانے کا اتفاق چند بار ہوا ہے۔ نینی تال کا گورنمنٹ ہاؤس بھی دیکھا ہوا ہے۔ یہ گورنر جنرل ہاؤس قدرۃً ان دونوں سے بڑھا ہوا نظر آیا۔ اس کی ٹکر کا اگر ہے تو دہلی کا سابق وائسریگل لاج یا موجودہ راشٹرپتی بھون...... جگہ بالائی حصہ میں ان کمروں میں ملی جن میں سنا ہے کہ کبھی خود بدولت رہتے تھے (اب نیچے کے حصہ میں رہتے ہیں) کمروں میں تختی میری اور بیوی کے ناموں کی لگی ہوئی۔ بغلی کمرہ پر تختی میرے سیکرٹری کے نام کی، آب وہوا کا پوچھنا ہی کیا۔ جس موسم میں بھی رہیے موسم کی سختی کا گزر ہی نہ ہو۔ گرمی میں ٹھنڈا، ٹھنڈک میں گرم، ہر موسم میں معتدل۔ مادی آسائش کے سامان اور اس فراوانی کے ساتھ کہ گویا جیتے جی اپنے ظرف کے لائق ایک ہلکا سا نمونہ جنت کا دیکھ لیا۔ کھانے اور

ناشتہ کا پروگرام، نماز پنجگانہ کی طرح دن رات میں پانچ پانچ وقت کا...... باریابی پہلے دن آٹھ بجے شب کو ہوئی۔ وقت چند منٹ کا مقرر ہوا اور اس سے قبل اے ڈی سی آکر اپنے ہمراہ لے گئے، کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے گفتگو عام مزاج پرسی کے بعد نجی قسم کی ہوتی رہی۔ اِدھر سے سوالات صحت وطریق علاج وغیرہ سے متعلق رہے اُدھر سے ایک پہلا سوال یہ ہوا کہ کہیے دورانِ قیام میں ارادہ کیا کرنے کا ہے؟ جواب میں عرض کیا گیا کہ "اور کوئی ارادہ نہیں بجز دوستوں عزیزوں سے ملنے ملانے کے اور کسی پبلک مشغولیت کا تو بہر حال خیال ہی نہیں"۔ اس پر بڑی مسرت کا اظہار ہوا اور فرمایا کہ "بس یہ ٹھیک ہے۔ ملئے ملائیے، کھائیے پیجیے، سیر کیجیے"۔ دل نے اس پر بڑا ہی شکر ادا کیا کہ بڑی ذمہ داریوں سے نجات مل گئی۔ اور کوئی سیاسی موضوع چھڑ جاتا یا چھڑنے کی بنیاد ہی پڑ جاتی تو خدا معلوم گفتگو کیا صورت اختیار کرتی اور فریقین میں کس کو کتنا دل مارنا پڑتا۔ یا دوسرے کا دل رکھنے کے لئے خود کتنی مداہنت کرنا پڑتی۔ اللہ ٹھنڈی رکھے اس شاعر کی تربت کو جو ہم پست ہمتوں اور ناتوانوں کی کیا خوب ترجمانی کر گیا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

سید سلیمان ندوی صاحبؒ کے نقل مکانی کے بعد سے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی صدارت مجلس کارکنان کا بار بھی اسی دوش ناتواں پر ہے۔ ادارہ کے ایک مستعد کارکن اور مجلس ادارت معارف کے نائب ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے ادارۂ مذکور ہی کے کام کے لئے کراچی آئے ہوئے تھے۔ ناظم مالیات مولوی مسعود علی صاحب ندوی (ہم نیاز مندوں کی زبان میں "مسعود غازی" عمل وکارگزاری کے پتلے ہیں۔) ہندوستان میں تو بڑے لوگوں سے مل ملا کر پنڈت جی اور مولانا ابوالکلام اور رفیع قدوائی مرحوم کے اثرات سے کام لے کر وہاں اس ڈوبتی ہوئی ناؤ کو منجدھار سے نکال چکے ہیں۔ انھیں نے پاکستان میں کام کرنے اور کتابوں کے لئے کاروباری امداد حاصل کرنے کے لئے صباح الدین سلمہ کا انتخاب کیا تھا اور انھیں اس مشن پر دوچار

ہفتہ قبل روانہ کر چکے تھے۔ عزیز موصوف اپنی والی دوڑ دھوپ کر چکے تھے اسٹیشن پر ملے۔ اور میں ہجوم میں سے اکیلے انہیں کو چن کر اپنے ہمراہ گورنر جنرل ہاؤس لیتا آیا تھا۔ ان کی اس امتیازی حیثیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر حال فرودگاہ پر پہنچتے ہی قبل اس کے کہ چائے اور ناشتہ سے فراغت کی جائے انھیں سے بات چیت شروع ہو گئی اور کچھ دیر میں ان سے سارے ضروری مراتب معلوم کر لئے گئے۔ اس کے بعد اس دن تو وہ رخصت ہو گئے لیکن دوسرے ہی دن دوپہر کو ان کے کام کا انتظام بحمد اللہ ہو گیا۔ ممتاز حسن صاحب فنانس سیکرٹری حکومت پاکستان اور قدرت اللہ شہاب صاحب پرائیویٹ سیکرٹری گورنر جنرل بہادر، دونوں مہربان ہو گئے۔ صباح الدین سلمہ کو بلا کر ان سے ملا دیا گیا اور گفتگو مطبوعات دار المصنفین کی درآمد اور کتابوں کے لائسنس وغیرہ کے مسائل پر خوب کھل کر ہو گئی۔ بحمد اللہ نتیجہ خاطر خواہ ظاہر ہوا اور چند روز بعد انتظامات مکمل ہو گئے۔ اعظم گڑھ سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم علمی اور غازی مسعود ناظم مالیات دونوں کے شکریہ کے خطوط خواہ مخواہ آنے لگے، حالانکہ اس میں دخل اس نامۂ سیاہ کی سعی و جہد کا ذرہ بھر بھی نہیں۔ فضل و کرم کے بھی عجیب کاروبار ہیں خود ہی تو بات کی بات میں پتھر کو پانی کر کے بہا دیتے ہیں، لوہے کو موم کی طرح پگھلا دیتے ہیں اور نام کسی بندہ کا اُچھال دیتے ہیں! آہ، کہ کتنی نیک نامیوں، کتنی شہرتوں کی بنیاد ایسی ہی نقش بر آب ہے اور کتنی شخصیتیں ایسی ہیں جن کی ناموری ایسی ہی بے حقیقت اور تمامتر ایک دھوکہ اور سراب ہے!

گھر پہنچنا تھا کہ کرم فرما حضرات کی آمد شروع ہو گئی۔ حالانکہ رسائی ہر ایک کے لئے آسان نہ تھی اور ٹیلیفونی پیامات کی تو وہ کثرت کہ بس معاذ اللہ! گورنر جنرل ہاؤس ایک چھوٹی موٹی خود مختار ریاست سی ہے۔ یہاں کی ڈسپنسری الگ، ڈاک خانہ اور تار گھر الگ، اور اسی طرح ٹیلیفون کا مرکز بھی شہر کے ایکسچینج سے الگ۔ جن لوگوں کو آنا ہوتا، اکثر وہ اپنے مقام سے فون کر کے وقت مقرر کراتے۔ پھر جب آتے تو صدر پھاٹک پر

رُک کر وہاں سے پھر فون کرتے اور جب یہاں سے اجازت مل جاتی جب کہیں "پاس" لے کر آ سکتے تھے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ پہلے دن کون کون صاحب آئے اور کس کس کے ہاں سے فون آئے، اتنا یاد ہے کہ آنے والوں میں وہ لوگ تھے جو اسٹیشن یا تو غلط وقت کی اطلاع کی بنا پر پہنچ ہی نہیں سکے تھے اور یا بجائے کنٹونمنٹ کے سٹی اسٹیشن پر انتظار کرتے رہے! ٹیلیفون ہر ہر کمرہ میں لگا ہوا تھا۔ میں تو دو ہی چار بار کے بعد پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد فون کی ساری ذمہ داری میرے سیکرٹری عزیزی ہاشم قدوائی سلمہ نے لے لی۔ وہی اپنے کمرہ سے ایک ایک کا جواب دیتے رہے اور ان کے وقت کا بڑا حصہ اسی کام کی نذر ہوتا رہا۔ آنے والوں میں اتنا خیال ہے کہ السابقون الاوّلون میں سید جمیل احمد لکھنوی ثم کراچوی اور ان کے والد بزرگوار سید خلیل احمد تھے۔ جمیل صاحب غالبًا اکاؤنٹس میں کسی اعلیٰ عہدہ پر ہیں۔ بڑے دیندار قسم کے ہیں اور قرآن مجید کے خاص طالب علموں میں ہیں۔ دوسرے دن کے لئے اپنے ہاں چائے پر مدعو کر گئے۔ بڑی شرمندگی اس کی ہے کہ وعدہ کے باوجود ان کے ہاں پہنچنے کا وقت نہ نکل سکا (بعض اہل تکلف نے اپنے ہاں اتنا زائد روک لیا تھا) خدا کرے کہ وہ اس پبلک معذرت کو قبول فرما لیں۔ مولوی حبیب احمد ندوی (سابق سیکرٹری مولانا شوکت علیؒ) بھی اسی روز کے آنے والوں میں تھے۔ قریب شام کے اپنے ہاں سے ملنے ملانے نکلا اور سب سے پہلے لکھنؤ کے مشہور و معروف حاجی اصطفےٰ خاں (سابق مالک کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی، حنا بلڈنگ) مقیم عامل کالونی نمبر ۲ کے ہاں پہنچا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت وہ کہیں گئے ہوئے تھے اور اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔

---

(۹)

کراچی نمبر (۲)

ایک سرسری جائزہ

کراچی ٹھہرنا پورے آٹھ دن تھا۔ ۸/اپیل (۱۹۵۵ء) کی صبح سے ۱۵/اپریل (۱۹۵۵ء) کی شام تک۔ ملاقاتیں کثرت سے کرنا تھیں لیکن جس کثرت سے واقعۃً کرنا پڑیں اس کا تو اندازہ بھی نہ تھا۔ صبح سے لے کر رات گئے تک ایک سلسلہ تھا کہ ٹیلیفونی پیغامات کا لگا رہتا۔ اور ایک بار تو ایک پیام ساڑھے گیارہ بجے شب کو موصول ہوا، ڈاک سے خطوط کا سلسلہ اس کے علاوہ، اور کبھی کبھی بیرون کراچی سے جوابی تار بھی! اگر ہمہ وقتی سیکرٹری کو ساتھ نہ لاتا تو ہوش و حواس کے لالے پڑ جاتے۔ کوئی کوئی خط اس مضمون کا ہز ایکسی لینسی کے پرائیویٹ سیکرٹری کے نام ہوتا کہ "براہ کرم ہماری ملاقات کا انتظام مولانا دریابادی سے کرا دیجئے"۔ اس پر وہ خط باقاعدہ ان کے دفتر سے میرے پرائیویٹ سیکرٹری کے نام آتا اور یہاں سے جواب جاتا...... آنے والوں کا تانتا صبح سے لگ جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ گورنر جنرل ہاؤس میں رسائی ہر شخص کی آسان نہ تھی۔ روک ٹوک کے ضابطے لازمی۔ جو صاحب وقت مقرر کرا کے آتے ان کو بھی صدر پھاٹک پر رُکنا پڑتا۔ وہاں سے فون میرے سیکرٹری کے پاس آتا اور جب یہاں سے اجازت ملتی جب وہ صاحب پاس لے کر آ سکتے۔ اور واپسی میں پاس (PASS) پھر پھاٹک کے سپاہی کو دے دینا ہوتا۔ چوکی پہرا قدم قدم پر۔ بندوقچی، سنتری گویا ہر وقت گشت میں، بعض لوگ کھپیا جاتے اور یہ بندشیں سن کر ملاقات ہی سے باز آ جاتے۔ پھر بھی کرم فرماؤں کی کثرت میرے اندازہ سے تو بہرحال باہر ہی تھی!...... اس درمیان میں خود بھی جب موقع ملتا باہر نکل جاتا۔ سواری کی کوئی دقت تھی ہی نہیں۔ ادھر فون کیا اور

ادھر چند منٹ میں سرکاری موٹر آ گیا۔ کئی کئی گھنٹہ اسی طرح بڑے لاٹ صاحب کی کوٹھی سے باہر گزرتے۔ عزیزوں، دوستوں سے ملنا ملانا تھا۔ مرحومین کی تربت کی زیارت بھی کرنا تھی، بعض اداروں میں حاضری دینا تھی اور پھر دعوتوں اور پارٹیوں کی تو حد ہی نہ رہی۔ صبح کا ناشتہ اِن کے ہاں تو دوپہر کا کھانا اُن کے ہاں۔ سہ پہر کی چائے فلاں صاحب پلا رہے ہیں تو رات کے کھانے پر فلاں صاحب بہ اصرار بلا رہے ہیں اور پھر بندھے ہوئے اوقات پر بس نہیں سہ پہر کی چائے تین تین بار! صبح کا ناشتہ دو دو جگہ! حیرت اس پر ہے کہ بیمار کیوں نہ پڑ گیا!...... اب اسے برکت اہل کراچی کے اخلاص کی سمجھ لیجئے یا شہر کی سمندری آب و ہوا کی یا اور کچھ...... پھر اس بے اندازہ التفات و اکرام کے ساتھ توقعات اس مشت خاک سے کس تعداد اور کس کس قسم کی قائم!

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ　　　لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں!

مرحومین میں سب سے مقدم حاضری مرقد سلیمانی پر تھی۔ پہلے اُن مرحوم کے گھر گیا۔ اس مقام کو حسرت کی آنکھوں سے دیکھا جہاں اس مؤرخ اسلام اور فاضل جلیل نے ناسوتی زندگی کے آخری لمحے گزارے تھے، جہاں بیمار پڑے تھے، جہاں جان کا تحفہ جان آفریں کو واپس کیا تھا۔ صاحبزادہ میاں سلمان سلمہ کا شمار تو خیر ابھی بچوں ہی میں ہے البتہ سیّد صاحب کے بھتیجے اور بڑے داماد سید ابوعاصم ایڈوکیٹ سے مل کر جی خوش ہو گیا۔ ماشاءاللہ خوب پڑھے لکھے نکلے۔ اردو انگریزی دونوں میں برق۔ قدرت لکھنے پر بھی اور بولنے پر بھی اور پھر جتنے پڑھے ہوئے اتنے ہی کڑھے ہوئے بھی۔ مہذب، شائستہ، نستعلیق، مشرقی اور اسلامی رنگ کے ادب شناس، ان کی بیوی (دختر نیک اختر حضرت سلیمان ندوی مرحوم) میری گودوں کی کھلائی ہوئی ہے۔ بچپن میں بڑی پیاری تھی...... گھر کے بعد مزار پر حاضری ہوئی۔ گھر سے چند ہی فرلانگ پر ہے کچی[1] تربت کا دل پر بڑا ہی اثر ہوا، ہٹنے کو جی نہ چاہا۔ دھوپ کا وقت نہ ہوتا اور ساتھیوں

[1] ان سطور کی تحریر کے وقت اطلاع ملی کہ قبر پختہ بن گئی ہے۔

کے سبب سے عجلت نہ ہوتی تو جی میں تھا کہ لحد کے کنارے بیٹھ جایئے اور زبانی بے زبانی میں کچھ اپنی سنایئے اور کچھ اُدھر سے سنئے۔ نورانیت اس سیرت نگارِ نبوت کے مرقد پر نہ ہوتی تو اور کہاں ہوتی! ایک معمولی کچی تربت، بغیر کسی قسم کی بھی آرائش و تکلف کے عبدیت کی پوری مظہر، بیسیوں پختہ و شاندار و پر تکلف مزارات پر بھاری، غالب نے ایک دوسری لیکن اسی مقام و مرتبہ سے ملتی ہوئی کیفیت کی عکاسی کیا خوب کی ہے

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

سید مرحوم آج زندہ ہوتے تو ملاقات کا کیا رنگ ہوتا! کتنے سوال و جواب ہوتے، کیسے کیسے عقدے حل ہوتے، کیا کیا لطیفے سننے میں آتے، عرض و معروض، گلے شکوے، راز و نیاز، سب ہی کچھ رہتے اور شاید کچھ نوک جھونک بھی چلی جاتی! اب یہ سب کیا جنت ہی کے لئے اٹھ رہا؟ بشرطیکہ وہاں اُس بڑے کے ساتھ اس چھوٹے کو بھی جگہ مل گئی!...... مرحوم کا ارادہ آخر وقت تک ہندوستان چھوڑنے کا نہ تھا۔ صرف عارضی پرمٹ پر چند روز کے لئے پاکستان آئے تھے۔ واقعات و حوادث تکوینی کس کے بس کے ہیں۔ پے در پے ایسے پیش آتے چلے گئے کہ بات روز بروز بگڑتی چلی گئی اور مرحوم کو گویا اضطراراً ہندوستانی سے پاکستانی بن جانا پڑا۔

بات ذرا الگ سی ہوئی جاتی ہے لیکن سید صاحبؒ کے ذکر خیر کے ذیل ہی میں یہ ایک جملہ معترضہ بے اختیار زبانِ قلم پر آئے جاتا ہے۔ ان کے ایک مرید با اختصاص ہیں غلام محمد (عثمانیہ) دکھنی ثم کراچوی۔ قلم کے اعتبار سے ندوی اور وضع و شکل کے لحاظ سے دیوبندی۔ مولانا گیلانی کے شاگرد، بہادر یار جنگ کے شیفتہ و معتقد اور سید صاحب کے مخلص مسترشد۔ اسٹیشن پر ملے تھے اور یہاں بھی گھر پر اور مزار پر ساتھ ساتھ۔ جب تک اپنا قیام کراچی میں رہا بار بار ملتے رہتے اور اپنی فہم سلیم کا ثبوت دیتے رہے۔ رخصت کرنے جب اسٹیشن آئے تو ایک لذیذ و نفیس قسم کے حلوے کی ایک

اچاری ساتھ کر گئے۔

سید صاحب سے چند ہی فٹ کے فاصلہ پر اللہ کا ایک اور شیر خواب ابدی کے مزے لے رہا ہے! علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی نور اللہ مرقدہ مفسر، محدث، متکلم، یہ حضرت بھی اپنے قصد سے تو ہندوستان سے ٹلنے والے نہ تھے تقدیر الٰہی کی حکمتیں اور تکوینِ ربانی کی مصلحتیں کس کی سمجھ میں آسکی ہیں۔ چند روز کے ارادہ سے کراچی گئے اور واپسی کے سارے راستے بند ہوگئے۔ ارادے کرتے رہے اور یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ کا ارادہ سب پر غالب رہا۔ مزار پختہ، بلند اور خاصہ پر تکلف تھا، معتقدین کا جوش عقیدت بغیر اس کے مانتا کب ہے۔ پھر بھی صاحب قبر کی عظمت کی تجلیات غیر مخفی نہیں...... احادیث میں تو ممانعت قبور کی پختگی، بلندی اور تعمیر قبہ کی آئی ہے۔ اس سے قطع نظر ذوق و وجدان کو جو کشش سادہ خام تربیت میں معلوم ہوتی ہے وہ بڑے بڑے گنبدوں والے مزارات میں نہیں ملتی۔ لیکن بشر کا بدعتی، مشرکانہ مذاق بار بار اسی طرف لوٹا کر لے جاتا ہے۔

اسی سرزمین پر اپنے بعض عزیز بھی آسودۂ خواب ہیں۔ ان میں نمبر اوّل پر نام پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل محمد وسیم مرحوم کا آتا ہے، دیکھنے میں "مسٹر" تھے لیکن اپنی سیرت، عادات و اطوار کے لحاظ سے بہت سے مولوی صاحبان اور دینداروں سے بڑھ کر دیندار۔ لکھنؤ میں ایک بڑے کامیاب اور نامور بیرسٹر تھے، سب کچھ لٹا کر اسلام اور پاکستان کی محبت میں پاکستان آگئے یہاں ہاتھوں ہاتھ ایڈوکیٹ جنرل کے عہدے پر لے لئے گئے۔ مروت، شرافت، دیانت اور فیاضی کے گویا پتلے تھے۔ خدا جانے کتنوں کے رزق کا ذریعہ اللہ نے انھیں کو بنایا تھا اور قرض دے کر اسے واپس لینا تو جانتے ہی نہ تھے۔ قرضدار بیچارہ ہے کہ رقم شکریہ کے ساتھ واپس لایا ہے لیکن یہ واپس لیتے کب ہیں۔ شدید انکار کئے جا رہے ہیں۔ نماز کیا معنی صبح کی تلاوت تک کے شدت سے پابند۔ یہاں کے ایک بڑے جنگی قبرستان میں کسی پرانے بزرگ کے مزار کے حلقہ میں مدفون ہیں اور ان کے مزار پر آیات قرآنی کا جو کتبہ لگا ہوا ہے وہ بھی بڑا موثر ہے۔

وقت دوپہر کے قریب ہو چکا تھا جب ان کے صاحبزادہ، صاحبزادی اور بیگم کو لے کر ان کی قبر پر پہنچا۔ جی لگا اور دیر تک ہٹنے کو جی نہ چاہا...... انھیں کے متصل دو اور عزیز چودھری سعید الزماں اور چودھری مشفق الزماں بھی اس پردیس میں ابدی نیند سو رہے ہیں اور ان کی ضعیف و ناتواں والدہ ڈیڑھ ہزار میل دور لکھنؤ میں اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہیں۔

کراچی شہر میں جہاں تک نماز کا تعلق ہے اسلامیت ایسی ہی نظر آئی جیسی لاہور میں تھی۔ آٹھ دن کے عرصہ میں نمازیں متعدد مسجدوں میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مسجدیں کثرت سے ہیں اور سب آباد پائیں۔ نمازوں کے لئے مسجدوں میں انتظامات بھی کچھ اسی طرح کے ملے جیسے کبھی حیدر آباد دکن میں دیکھنے میں آتے تھے۔

ایک دن جب نشری تقریر[1] کے لئے مرکزی ریڈیو گھر جانے کا اتفاق ہوا تو اندر کے صدر دروازہ پر جلی حروف میں وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا[2] دیکھنے میں آیا اور پھر آیۂ کریمہ کا یہی ٹکڑا ریڈیو گھر کے کاغذات پر چھپا ہوا ملا۔ ریڈیو ایک سرکاری محکمہ ہے اور ریلوے پلیٹ فارموں پر سمت قبلہ کا نشاندہی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ سب شہادتیں تھیں اس کی کہ ایک مسلم مملکت کتنی ہی غافل و بے عمل سہی بہر حال مسلم حکومت ہوتی ہے قدر کے قابل۔

اسلامیت ایک بار پھر عرض ہے کہ تعصب کے مرادف ہرگز نہیں۔ کراچی میں غیر مسلموں کے نام کی سڑکیں (مثلاً گیدومل روڈ) اور باغ اور عمارتیں (مثلاً گاندھی گارڈن) سب بدستور قائم ہیں اور سننے میں آیا کہ مجوسیوں (پارسیوں) کی آبادی بھی شہر کے بعض حصوں میں اسی طرح قائم ہے۔ اسلام تعلیم عدل کی دیتا ہے اور تعصب عدل کے ساتھ جمع ہو نہیں سکتا۔

---

[1] یہ نشری تقریر ضمیمہ نمبر ۱ میں ملاحظہ فرمائیے۔ [2] اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

(۱۰)

کراچی نمبر (۳)

زہر اور اس کا تریاق

کراچی آئے ہوئے دو ہی تین روز گزرے تھے کہ وزیر اطلاعات آنریبل سردار ممتاز علی خاں صاحب کے ہاں سے دعوت پہنچی کہ سہ پہر کو وزارت اطلاعات میں چائے پیو اور مقامی اُردو اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے ملاقات کرو۔ تعمیل ارشاد کی۔ دیکھا تو مقامی صحافت کے نورتن جمع ہیں۔ یہ ایڈیٹر صاحب "جنگ" ہیں، یہ ایڈیٹر صاحب "انجام"۔ یہ ایڈیٹر صاحب "ملت" (گجراتی) اور یہ پاکستان نیوز سروس کے چیف ایڈیٹر عبدالحفیظ صاحب۔ ان سب کے علاوہ انگریزی روزنامہ پاکستان اسٹینڈرڈ کے ایڈیٹر سید فرید جعفری۔ خود وزیر صاحب موصوف تو موجود تھے ہی اور ان کے سوا ان کے محکمہ کے جائنٹ سکریٹری سید ہاشم رضا جو اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں اور اس وقت بھی ساری محفل پر وہی چھائے ہوئے تھے۔ کل دس بارہ ارباب صحافت۔ گویا ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس!

گھنٹہ سوا گھنٹہ اچھی پر لطف و دلچسپ و پر خلوص صحبت رہی۔ تخلیہ میں پورا موقع حاصل تھا کہ ہندوستان کے خلاف دل کھول کر کہہ سن لیا جاتا لیکن نہیں، ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ گفتگو کا خاصا بڑا حصہ "صدق" کی داد تحسین یا یوں کہئے کہ ہمت افزائی میں تھا۔ متعدد صاحبوں کا فرمانا یہ تھا کہ صدق کا ایک ایڈیشن پاکستان میں بھی نکلنا چاہئے۔ اور ایک صاحب نے تو یہ بھی فرمایا کہ یہ دوسرا ایڈیشن انگریزی میں ہوا کرے! گجراتی اخبار کے ایڈیٹر صاحب صدق کے خاص مخلصوں اور صدق نوازوں میں نکلے اور فرید جعفری صاحب اور عبدالحفیظ صاحب بھی خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ دوسرے

صاحبوں کی نشست ذرا فاصلہ پر تھی۔ ورنہ یقین ہے کہ ان سے بھی شرف مکالمت اسی طرح حاصل رہتا۔ لاہور کی زندہ دلی کے مقابلہ میں یہاں سنجیدگی زیادہ دیکھنے میں آئی اور وہ قہقہے، وہ چہچہے، وہ ہو حق یہاں دیکھنے میں نہ آیا جو شاید لاہوری صحافیوں کی امتیازی خصوصیت تھا...... آنریبل وزیر صاحب اطلاعات و نشریات دو روز قبل ایک شام کو گورنر ہاؤس میں خود ہی بڑھ کر مل چکے تھے۔ ان کے مزاج کی سادگی اس روز بھی نمایاں تھی اور آج دوسری ملاقات تو اور مفصل تھی۔ افسرانہ شان اور حاکمانہ تمکنت کے بجائے خدمت خلق کا جذبہ ان پر غالب معلوم ہوا اور خدا کرے کہ یہ سرسری اندازہ صحیح اور مطابق واقع ہو۔ اور سید ہاشم رضا تو اسی طرح ملے کہ جیسے کوئی عزیز قریب ملتا ہے۔ ان کے بھائیوں اور بزرگوں (سید محمد رضا مرحوم جج چیف کورٹ اودھ، سید آل رضا رضا وغیرھم) سے تعلقات بیشک رہے بھی ایسے ہی گہرے ہیں۔ اور یہ ان کی شرافت ہے کہ ان کو انھوں نے یوں نباہا۔ اسی جلسہ میں حکم ملا کہ دو ہی چار روز کے اندر کراچی ریڈیو سے تقریر کرنا ہوگی۔ میں حیراںؔ کہ ادھر یہاں کی ہمہ وقتی مصروفیت میں تقریر تیار کیونکر ہو سکے گی اور ادھر خود محکمۂ نشریات اپنے قاعدے، ضابطے توڑ تاڑ دو ہی چار دن کے اندر اس کے لئے گنجائش کیسے نکال لے گا!

کراچی کے اداروں میں شہرت "اسلامک انسٹیٹیوٹ آف مینٹل ہائجین" کی مدت سے کان میں پڑی ہوئی تھی۔ ایک بین الاقوامی اور عالمی ادارہ "مینٹل ہیلتھ ورلڈ فیڈریشن" (عالمی ادارۂ صحت دماغی) کے نام سے یورپ اور امریکہ میں مدت سے قائم ہے۔ مرکز لندن ہے اور شاخیں اطراف عالم میں پھیلی ہوئی۔ رسالے بھی انجمن مذکور کی طرف سے نکلتے رہتے ہیں اور سالانہ رپورٹیں وغیرہ بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور مطبوعات ادارہ کا موضوع محض نفسی و نفسیاتی نہیں، اخلاقی و اخلاقیاتی بھی ہے۔ کراچی کے ان اہل علم مومنین صادقین کی یہ جدت قابل داد ہے کہ انھوں نے اس ناطرفدار

ا؎ ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر (۱)

اور غیر جانبدار قسم کی علمی انجمن میں اسلامیت کا پیوند لگا کر اسے ایک علمی دینی انجمن بنا دیا اور اس کا نام اپنے ہاں "اسلامک انسٹیٹیوٹ آف مینٹل ہائجین" رکھ دیا۔ کرنل ڈاکٹر شاہ اس کے روح رواں ہیں اور غالباً صدر بھی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ایک جواں عمر مسترشد مختار احمد خاں ایم اے (علیگ) ہیں جو ایک عرصہ تک صوفیانہ و دینی ماہ نامہ "مستقبل" بھی نکالتے رہے اور شاید اب بھی نکال رہے ہیں۔ وہ آئے اور بار بار ملے اور وہی دعوت دے کر ادارہ مذکور کے جلسہ میں لے گئے۔ کرنل شاہ کے علاوہ اور بھی دو چار صاحب علم موجود تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر محمود حسن (علیگ) رفعت احمد خاں ایم اے، غلام محمد بی اے (عثمانیہ) وغیرہ زاہد حسین صاحب گورنر اسٹیٹ بنک کسی معذوری سے نہ آسکے ورنہ سنا کہ وہ اس میں خاصی دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ اس روز مذاکرہ زیادہ تر ڈاکٹر شاہ خود ہی کرتے رہے۔ قرآن مجید کی آیت تعدد ازواج والی زیر بحث تھی اور ایک صاحب شیخ محمد عبدہٗ مصری کا حوالہ دے کر تجدد کے اثر سے آیت کے معنی بالکل توڑ مروڑ کر نکالتے رہے۔ ڈاکٹر شاہ اور رفعت احمد خاں کی گفتگو بڑی معقول اور سلجھی ہوئی رہی...... ۴۰، ۴۵ منٹ کی شرکت سے طبیعت نے بہت اچھا اثر قبول کیا۔ کاش اس کی ممبری کا دائرہ اور وسیع ہوتا۔ اور اس میں انگریزی خواں خصوصاً حکام کا طبقہ بڑی تعداد میں شریک ہوتا۔ پاکستان کی سرزمین گو دینی اعتبار سے "شرانگیز" اور "فتنہ پرور" سمجھی جائے لیکن یہ بھی تو فطرت کا ایک قانون ہے جہاں زہر ہوتا ہے اس کے تریاق کی پیدائش بھی اسی علاقہ سے ہوتی ہے اور جہاں وبا پھیلاتے ہیں اس کی دوا بھی اسی سرزمین سے اگاتے ہیں، تجدد اور اس سے بڑھ کر تشکیک وارتیاب کے مریضوں کے لئے ایسا ادارہ اچھے خاصے شفاخانہ کا کام دے سکتا ہے۔ پرانے قسم کے علماء اس قسم کے اداروں کی افادیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور نہ ان کی پوری قدر و قیمت پہچان سکتے ہیں۔ ان کی اہمیت کے اندازہ کے لئے نظر بھی کسی شبیر احمد عثمانیؒ اور کسی سیّد سلیمان ندویؒ کی ہونا چاہئے۔

دینی اور اصلاحی خدمت کے لئے مصیبت یہ ہے کہ صرف چند ٹھپے مخصوص سمجھ لئے گئے ہیں اور یہ بات دلوں میں بیٹھ گئی ہے کہ ان محدود ٹھپوں سے باہر کوئی کام انجام ہی نہیں دیا جاسکتا ہے۔ غلط فہمی اور تقلید جامد کے اس طلسم کو ندوہ نے ایک حد تک توڑا تھا لیکن خود ندوہ ہی کی کامیابی محدود رہی اور دلوں سے اب تک یہ وہم پوری طرح دور نہ ہو سکا کہ "دینداری" نام محض ایک مخصوص وضع ولباس اور ظاہر کی چند پابندیوں کا ہے۔ حالانکہ دنیا صحیح یا غلط بہر حال اب جس منزل پر پہنچ چکی ہے اس کے لئے اب وہ پرانے حربے بڑی حد تک کند اور بیکار ہو چکے ہیں۔ اور اب حقائق سے آنکھیں بند کر کے انھیں متبرک و مقدس سمجھ کر تکیہ کئے رہنا ایسا ہی ہے جیسے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم والے میدان میں استعمال صرف تیر و تبر، تلوار اور نیزہ کو جائز سمجھا جائے اور دلیل یہ پیش ہوتی رہے کہ ہمارے "اسلاف" صالحین سے فتح مندیاں صرف انھیں آلات سے حاصل کی تھیں اور ملکوں اور اقلیموں کی تسخیر میں کام انھیں اسلحہ سے لیا تھا!......

مخالفین و معاندین صرف کمزور اور داغدار پہلوؤں کو چن لیتے ہیں اور روشن پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ پاکستان کی بھی بے دینی کا پروپیگنڈا کچھ اپنوں اور کچھ بیگانوں دونوں کی مہربانی سے ایسا بے پناہ اور لاہوری صحافت کی زبان میں "البرز شکن" ہوا ہے کہ باہر بیٹھ کر یہ یقین ہی نہیں آتا کہ لاہور اور کراچی میں نمازیوں کی جماعتیں دیکھنے میں آئیں گی، مسجدیں آباد ملیں گی، کچھ تھوڑی بہت عورتیں بھی پردہ نشین اور برقع پوش دکھائی دیں گی اور چند حکام بھی نشہ اور نشہ الحاد سے محفوظ ملیں گے! مشاہدہ نے اس دہشت انگیز اور مایوس کن صورت حال کا اچھا خاصا مبالغہ آمیز ہونا واضح کر دیا۔ نمازیوں کی تعداد ماشاء اللہ اب بھی بڑی ہے۔ مسجدیں خاصی آباد ہیں۔ بیویاں اور بیٹیاں بھی سب کی سب باہر نکل نہیں آئی ہیں۔ اور جہاں ایک طرف الحاد و اباحیت کو فروغ ہو رہا ہے وہیں دوسری طرف اصلاحی، تعمیری، دینی ادارے بھی مفقود و معدوم نہیں ہو گئے ہیں۔ ہاں کم ہیں اور کمزور ہیں۔ ضرورت انھیں قوت پہنچانے اور ان کے وسیع کرنے کی ہے اور انھیں میں ایک مرکزی ادارہ یہ "اسلامک انسٹیٹیوٹ آف مینٹل

...کلن" ہے۔

...بڑا دکھ یہ دیکھ کر ہوا کہ قدیم و جدید گروہوں میں بیگانگی اچھی خاصی پیدا ہو گئی ہے۔ گویا دینداروں اور روشن خیالوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے اور جب ...ہی بدگمانیاں جڑ پکڑ چکی ہیں تو یہ نتیجہ بھی بالکل قدرتی ہے کہ ایک فریق کی سیدھی ...ی بات بھی دوسرے کو تیر و نشتر ہو کر لگتی ہے۔ اور علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان ...بے اعتباری کا یہ زور ہے کہ یہ اگر دو اور دو کو چار کہیں تو وہ اِن کی ضد میں آکر بدیہی حقیقت کو بھی جھٹلا دیں! اور اقبال کی یہ شاعری کچھ حقیقت سی بن گئی ہے ؎

واعظ دلیل لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے!

...زخم کے اندمال اور چوٹ کے التیام کا کام ندوہ ہی کی قسم کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے جو روح اور مغز کے لحاظ سے قدیم ہو اور شکل و قالب کے لحاظ سے جدید۔ صراحی اور گلاس نئے ہوں اور ان کا مشروب وہی جانا پہچانا ہوا پرانا...... جب تک کوئی ندوۂ جدید میدان عمل میں آئے اس قسم کے ادارے اس کی جانشینی خاصی حد تک کر سکتے ہیں۔



(۱۱)

کراچی نمبر (۴)

خوشگوار تجربے

اسی قسم کے مفید ادارے یہاں اور بھی ہیں۔ ایک روز جبکہ قیام کراچی میں شاید ایک ہی دن کی مدت باقی رہ گئی تھی ایک صاحب ڈاکٹر بلگرامی نامی ملنے آئے غالباً لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں اردو کے معلم رہ چکے ہیں اور اب شعبۂ تعلیمات میں کسی اچھے عہدہ پر ہیں، اپنے کسی تعلیمی ادارہ کی تفصیلات کا ذکر کیا جواب ذہن میں محفوظ نہیں، لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ادارہ عملاً اچھا خاصا دینی بن گیا تھا۔ سن کر جانے اور اسے دیکھنے کا بڑا شوق پیدا ہوا۔ وقت میں گنجائش نہ نکل سکی اور اس کا افسوس رہا۔ مولانا محمد علی کی یادگار ایک محمد علی میموریل سوسائٹی جیل روڈ پر قائم ہے، اس کے نوجوان و مستعد سیکرٹری اور کارکن اسٹیشن پر مل گئے، پھر گھر پر آئے اور اپنی سوسائٹی کے لئے کچھ لکھا کر لے گئے۔ سوسائٹی کام جو کچھ بھی کر رہی ہو بہر حال انتساب تو محمد علیؒ کے نام سے رکھتی ہے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے تجارتی کاروبار اور صنعتی کارخانے شہر میں خدا معلوم کتنے ہوں گے۔ اپنے جانے کا اتفاق صرف دو جگہ ہوا اور دونوں جگہ جا کر جی خوش ہی رہا۔ ایک تو حافظ ٹیکسٹائل مل جو شہر کے ایک کنارے حرفتی رقبہ میں اپنے ہی ضلع بارہ بنکی کے ایک نابینا صاحب کی قائم کی ہوئی ہے۔ کارخانہ کی وسعت، مشینوں کی کثرت، کارکنوں کی تعداد دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ مالک بیچارہ علاوہ نابینا ہونے کے ان پڑھ سے ہیں۔ لیکن اللہ نے وہ برکت دے رکھی ہے کہ بس حیرت ہی ہوتی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ سب ثمرہ اخلاص نیت، تواضع و جذبۂ خدمت کا ہو۔ دوسرا بڑا کاروبار کمپنی کی شکل میں پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی کا دیکھنے میں آیا۔ دفتر کی

وسعت، صفائی وغیرہ سب انگریز کمپنیوں کی سی نظر آئی اور یہ یقین مشکل ہی سے آیا کہ ایسی خوش انتظامی کبھی کسی مسلم کاروبار کے بھی حصہ میں آسکتی ہے۔ چار جہاز اس وقت کمپنی کے پاس موجود ہیں۔ سفینۂ عرب وغیرہ اور ماشاء اللہ کام ترقی پر ہے۔ بحری تجارت ایک زمانہ میں مسلمانوں کی خاص چیز تھی اور بڑی بابرکت تجارت ہے۔ کلکتہ، بمبئی اور کراچی و چاٹگام کے مسلمان تاجر اگر ہمت سے کام لیں تو ہندوستان و پاکستان دونوں میں ایک نہیں متعدد بحری کمپنیاں قائم کر سکتے ہیں۔

شہر میں ایک اونچا نیم سیاسی ادارہ انڈو پاکستان فرینڈ شپ ایسوسی ایشن کے نام سے ہے۔ مقصد و موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اسی قسم کا ایک ادارہ کئی سال ہوئے دہلی میں قائم ہوا تھا۔ اب غالباً ٹوٹ گیا ہے مدت سے خبر معلوم نہیں ہوئی۔ بہر حال کراچی کا یہ ادارہ زندہ و فعال ہے، ایک دن معلوم ہوا کہ حسب الحکم انجمن مذکورہ مجھ غریب کو ایٹ ہوم دے رہی ہے۔ چھپے ہوئے کارڈ انگریزی میں کثرت سے تقسیم ہوئے۔ سہ پہر کو پہنچا۔ عمارت عالی شان بیچ لگژری ہوٹل (Beach Luxury Hotel) کی تھی جس کا شمار دار السلطنت کے اعلیٰ ہوٹلوں میں ہے۔ الگ الگ میزوں پر مجمع کوئی سو، سوا سو کا تھا۔ میرے لئے وسط میں ایک الگ میز اور صوفہ مع میکری فون کے۔ میں نے میکری فون ہٹا دیا کہ بجائے "تقریر" کرنے کے فرداً فرداً ہر میز پر چل کر گفتگو کر لوں گا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آئے اور آتے ہی انجمن کے سیکرٹری کو آڑے ہاتھوں لیا کہ کارڈ بجائے اردو کے انگریزی میں؟ ایم بی احمد صاحب آئی سی ایس، پہلے علیگڑھ میں سیشن جج تھے اور اب یہاں غالباً مجلس وضع قوانین کے سیکرٹری ہیں اور انگریزی کتاب "اسلامی ہند میں معدلت گستری" کے مصنف۔ مدت کے بعد ان سے یہیں ملاقات ہوئی۔ اکل و شرب کے بعد سیکرٹری صاحب کے ساتھ ہر ہر میز پر گھوما۔ عام طور پر گفتگوئیں اچھی رہیں۔ ایک میز پر افغانستان کے خلاف جوش بہت زیادہ تھا، مجھ سے سوال ہوا کہ "اب بھی آپ افغانستان کے خلاف جہاد کا فتویٰ نہ دیں گے؟"

عرض کیا کہ "میں رائے تو ہندوستان کے خلاف بھی جہاد کی آپ کو نہیں دیتا چہ جائیکہ افغانستان جو بہر حال ایک مسلم ہمسایہ ہے"...... ایک اور میز پر اسی سرگرمی سے اظہار خیال وزیر اعظم محمد علی کے عقد ثانی کے خلاف ہو رہا تھا۔ ایک صاحب گرما گرم ہو کر بولے کہ "ایسی بے ضرورت شادی شرعاً جائز بھی ہو سکتی ہے۔ عرض کیا گیا کہ ضرورت کا فیصلہ تو خود صاحب ضرورت ہی کر سکتا ہے۔ دوسرا اس میں داخل دینے والا کون؟"...... یہیں ایک اور میز پر ماہر القادری صاحب (ایڈیٹر "فاران") دکھائی دیے۔ "جماعت اسلامی" میں شریک ہونے سے قبل نادیدہ مہربان رہ چکے ہیں۔ تعارف ہوا لیکن قبل اس کے کہ ایک بات بھی ہو سکیرٹری صاحب کچھ ایسی جلدی میں تھے کہ ہٹا کر دوسری میز پر لے گئے اور یہیں تعارف خواجہ جمیل احمد سے ہوا جو مسلمانوں پر ادبی و ثقافتی پہلو سے اچھے اچھے مضمون انگریزی میں لکھتے رہتے ہیں اور یہاں غالباً محکمہ اطلاعات میں کسی اچھے عہدہ پر ہیں۔

رخصت ہوتے وقت کسی صاحب نے فوٹو لینا چاہا۔ میرے عذر کرنے پر رُک گئے البتہ دوسرے دن جو انگریزی اخبارات آئے تو دیکھتا کیا ہوں کہ میری تصویر کھنچی کھنچائی موجود ہے اور مجھ سے متصل فرید جعفری صاحب (ایڈیٹر پاکستان اسٹینڈرڈ) بیٹھے ہوئے ہیں!۔ شرعی پہلو سے قطع نظر اپنے کو طبعی ناگواری بھی تصویر کھنچانے سے ہے۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ زمانہ اتنی ترقی کر گیا ہے کہ صاحب تصویر کی اجازت بلکہ علم کے بغیر ہی کھٹ سے اس کی تصویر اتار لی جاتی ہے اور وہ غریب منہ دیکھتا رہ جاتا ہے!

کراچی میں اپنے عزیزوں وطن و جوار وطن والوں کی کوئی کمی نہیں، ملاقات اکثر سے ہو گئی۔ اور بعض سے تو تقسیم ملک کے بعد پہلی ہی بار ملنا ہوا۔ بیگم وسیم مرحوم، بیگم چودھری خلیق الزماں (چودھری صاحب تو انڈونیشیا میں تھے اور ان کی بڑی بیگم لاڑکانہ میں رہتی ہیں) چودھری اکبر حسین (ریٹائرڈ جج الہ آباد ہائیکورٹ) چودھری محمد اسماعیل لکھنوی (نیشنل بنک والے) شیخ صدیق الزماں حیدر آبادی ثم کراچوی،

عظیم الدین احمد قدوائی (ریڈیو انجینئر) حکیم الدین قدوائی (ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز) وہاج الدین قدوائی (پوسٹ آفس والے) وغیرہ سب عزیزوں سے ملاقات ہو گئی اور اکثر کے ہاں دعوتیں بھی کھائیں۔ سب کے نام نہ اب یاد ہیں اور نہ کوئی جامع فہرست پیش کرنا مقصود ہے۔ انگریزی روزنامہ "ڈان" کے چیف نیوز ایڈیٹر محمد عشیر ایم اے (علیگ) قریبی رشتہ سے بھانجے ہیں کیماڑی میں ان کے والدین بھی انھیں کے ساتھ رہتے ہیں اور بڑی ستھری اور مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میری بیوی گورنر جنرل ہاؤس کی مہمانداریاں چھوڑ انھیں کے ہاں جا کر رہیں اور بہت خوش رہیں۔ مینائی خاندان سے بھی قرابت ہے۔ محمد اسماعیل مینائی اچھے عہدہ پر یعنی کارپوریشن کے سیکرٹری ہیں، ان کے بھائی محمد ادریس مینائی پاکستان نیشنل بنک کے غالباً منیجر ہیں۔ اور اسرائیل مینائی اور اسحاق مینائی یہ چاروں بھائی گویا شرافت و انسانیت کی تصویر ہیں۔ خوب ملے اور بڑی بات یہ کہ ملنے جلنے، کھلانے پلانے، سب میں برابر میرے ہر مذاق و مسلک کی پوری رعایت کرتے رہے۔ دوسرے امیر زادے حسن احمد مینائی اور ان کے والد ماجد محمود احمد مینائی بھی ان سے کچھ کم نہ رہے۔ کراچی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر شیخ غلام قادر فرید سے بھی سلسلہ قرابت کا ملتا ہے، اپنے لطف و کرم سے ملنے آئے اور ایک نشری تقریر جو حسب الحکم مجھ سے کرائی اس میں پابندیوں کے بجائے ہر طرح مجھے آزادی دے رکھی۔ ایک عزیز قریب (توکل کریم) ٹی کے قدوائی بحریہ میں لیفٹیننٹ کمانڈر ہیں اور کیماڑی سے متصل چھوٹے سے جزیرہ منوڑا میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کشتی پر منوڑا تک کی خوب سیر کرائی۔ ان کے والد مولوی تجمل کریم قدوائی لاڑکانہ میں وکیل ہیں، وہ وہاں سے ملنے کو آئے...... وطنی عزیزوں میں ایک حکیم چودھری سراج احمد تھے۔ بارہ بنکی میں مسلم لیگ کے بڑے پر جوش کارکن جیل بھی اسی سلسلہ میں بھگتے ہوئے۔ یہاں بھی چودھری خلیق الزماں کی لیڈری کے زمانہ میں بہت پیش پیش رہے اب بھی وسیع تعلقات سابق اور موجودہ لیڈروں سے رکھتے ہیں۔ کئی سال کے بعد ان سے ملنا ہوا۔ ایک اور ہم وطن خواجہ علی امان صدر میں

وکٹوریہ روڈ پر چائے خانہ دریابادی کے نام سے پینے پلانے کی دوکان کھولے ہوئے ہیں اور اب ماشاء اللہ لالوکھیت میں اپنا ذاتی پختہ مکان بھی بنوالیا ہے۔ وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ جوار وطن کے ایک صاحب اور ہمنام عبدالماجد رسولوی کمیشن ایجنٹ ہیں۔ انھوں نے نہ صرف صدق کی خدمت بڑی عالی ہمتی سے اور میرے اندازے سے کہیں بڑھ کر کی بلکہ ذاتی طور پر بھی میرے ضبط اوقات کا پورا لحاظ کرتے ہوئے صرف اسٹیشن ہی پر دونوں بار ملے اور دوسری بار مع ایک بھاری ناشتہ دان کے، اخلاص کے ساتھ دولت فہم سے بھی بہرہ ور کم ہی لوگ ملتے ہیں۔

بیان کچھ خانگی یا گھریلو قسم کا ہو چلا اور سفر نامہ پر حق جتنا اندر والوں کا ہے اس سے کہیں بڑھ کر باہر والوں کا ہے...... مشاہیر کراچی میں نمبر اول بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق کا ہے۔ ان سے ایک ملاقات مفصل اور دو سرسری رہیں۔ ان کی انجمن کے کتب خانہ کو بھی سرسری نظر سے دیکھا۔ عجب جوان ہمت، یہ پیر مرد بھی ہیں، قویٰ (بجز قوت سماعت کے) اس سن و سال کے دیکھتے ہوئے ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں اور ہمت و مستعدی تو قابل رشک ہے۔ اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ ملّا واحدی دہلوی (ایڈیٹر نظام المشائخ) اور رازق الخیری (ایڈیٹر عصمت) کو سالہا سال بعد دیکھا اور سن کے اثر سے قدرۃً متاثر پایا۔ دونوں کے گھر پر بھی حاضری دی۔ ملّا واحدی اپنے محدود رنگ میں خاموشی کے ساتھ دین و ادب کی خدمت کئے جا رہے ہیں اور عصمت کا موجودہ معیار بھی "اپوا"[1] (A.P.W.A) کے دور میں برقرار رہ جانا بس رازق الخیری صاحب کی ہمت ہی کا کرشمہ ہے۔ فخر ماتری صاحب ایڈیٹر وطن (گجراتی) سے ملاقات ایک ہی بار ہوئی لیکن ان کے اخلاص کا نقش دل پر گہرا رہا اور ان کے سلسلہ کے اور لوگ بھی اسی اخلاص کو لئے ہوئے ملنے آئے۔ جلیل قدوائی صاحب ایم اے (علیگ) سے ایک زمانہ سے خاصے تعلقات تھے ابکی جو ملنا ہوا تو معلوم ہوا کہ درمیانی مدت کتنی

---

[1] آل پاکستان انجمن خواتین All Pakistan Women's Association

ہی طویل ہو اخلاص کے قیام و بقا میں حائل نہیں ہو سکتی یہاں غالباً سینئر انفارمیشن آفیسر ہیں۔ شاعری اور ادبیت کے ساتھ اسلامیت بھی خوب نکھر آئی ہے۔ ضیاء الدین کرمانی کاکوروی اور رشید احمد رزاقی بانسوی بھی غالباً ایسے ہی عہدوں پر ہیں۔ یہ دونوں بھی خوب ملے۔ سید ہاشم رضا (جائنٹ سیکرٹری انفارمیشن) اور سید کاظم رضا (سابق انسپکٹر جنرل آف پولیس) دونوں بھائی اس لطف و محبت سے ملے گویا عزیز قریب ہی ہیں۔ کرنل عون جعفری (ریٹائرڈ انسپکٹر جیل) اور نامور ڈاکٹر عبدالصمد کانپوری دونوں سے ایک دعوت میں ملاقات ہوئی اور دونوں جلد ہی شیر و شکر ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی گہری مذہبیت کے تذکرے جو سنے تھے، ملنے کے بعد وہ مبالغہ آمیز نہیں بلکہ کچھ ہلکے ہی معلوم ہوئے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ الخ۔ حیدر آباد دکن کے سید محی الدین بہاری (سابق پرنسپل اردو کالج کراچی) پرانے ملنے والوں میں ہیں۔ بڑے نیک شائستہ و دیندار مدت کے بعد اب کی تجدید نیاز ہوئی۔ ان کے ہمراہ ان کے مشہور و معروف بھائی سید تقی الدین بھی تھے "پولیس ایکشن" کے قبل کے ہیرو، انھیں دیکھ کر برابر یہ سوچتا رہا کہ کہیں کامیابی ان کے گروہ کو ہو گئی ہوتی تو آج دکن کیا معنی خود ہندوستان ہی کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی! ضامن علی گویا پیلی بھیتی، تفضل داؤد صاحب ایڈووکیٹ (مصنف "ریل شیوا جی" انگریزی) حاجی محمد یوسف بٹلہ، اثر زبیری (مصنف منظوم ترجمۃ القرآن) عبدالحیٔ عباسی، نواب شمس الحسن لکھنوی، سیفی ندوی، شاہد احمد (ایڈیٹر "ساقی") سیّد عقیل احمد جعفری خیر آبادی، نجی احمد صابر سندیلوی، سرور شاہ گیلانی (ایڈیٹر "الجماعت") سعید الحق دیسوی (نیوز ایڈیٹر پاکستان ریڈیو) شیخ محمد عنایت اللہ صاحب (تاج کمپنی) ابو بکر احمد حلیم صاحب (وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی) مولوی حبیب احمد ندوی، حکیم نصیر الدین ندوی اور ان کے نورانی شکل والے والد ماجد۔ یہ سارے نقش اس وقت حافظہ میں سینمائی تصویروں کی طرح ابھر رہے ہیں...... اور یقیناً بہت سے چھوٹ بھی گئے ہوں گے۔

(۱۲)

کراچی نمبر (۵)

شاہی ضیافت

گورنر جنرل ہاؤس پہنچ کر دم لیا ہی تھا کہ میزبان یعنی گورنر جنرل بہادر کے پرائیویٹ سیکرٹری کے نام انٹرنیشنل اسمبلی آف مسلم یوتھ (مسلم نوجوانوں کی بین الاقوامی انجمن) کی طرف سے انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا خط پہنچا کہ ''مولانا عبدالماجد دریابادی، جیسا کہ ہم کو اخبارات سے معلوم ہوا ہے کراچی آرہے ہیں اور گورنر جنرل بہادر کے مہمان ہو رہے ہیں براہ کرم مولانا سے وقت مقرر کرادیجئے کہ کسی وقت یوتھ اسمبلی کے مجمع میں خالق دینا ہال میں تقریر کریں۔ وقت ۵ بجے شام کا بہتر ہوگا''...... اخباری شہرت کا برا ہو خدا معلوم کتنوں کو غلط فہمی یہ قائم ہو گئی ہے کہ یہ گوشہ نشین اور قلم کا مزدور بھی کوئی پبلک لیڈر قسم کی مخلوق ہے یہ جہاں پہنچے اس کا استقبال زندہ باد کے نعروں سے کیا جائے، اس کا جلوس نکالا جائے، اسے جلوس میں رگیدا جائے، اس کی تقریر پر تالیاں بجائی جائیں، اس کی گردن ہاروں اور گجروں سے گرانبار کردی جائے اور اس کے ساتھ ہر وہ معاملہ کیا جائے جس کی عادی قوم اپنے ہر لیڈر کے لئے ہو چکی ہے! اور پھر چاہے دوسرے ہی دن اس کے لئے جوابی نعرے ''مردہ باد'' کے لگنے لگیں اور اسے سیاہ جھنڈیاں ہر طرف سے دکھائی جانے لگیں۔ لاہور میں یہی مصیبت رہی اور یہی صورت کراچی میں بھی پیش آتی رہی۔ ہزار انکار اور لاکھ معذرت کیجئے قوم اس کا یقین ہی کب کرتی ہے، یہ حضرات غالباً اسٹیشن پر مل بھی چکے تھے بہر حال اپنے سیکرٹری سے انگریزی میں لکھوادیا اور فون پر بھی کہلادیا کہ ''مولانا کسی بھی پبلک تقریب میں شرکت سے قطعی معذور ہیں۔ وہ یہاں تمام تر ذاتی اور شخصی حیثیت سے آئے ہیں''

معذرت واللہ اعلم قبول بھی ہوئی یا نہیں بہر حال مزید تقاضوں سے نجات رہی۔ تحریری پیام تک معاملہ پھر غنیمت رہتا ہے چنانچہ محمد علی میموریل سوسائٹی والے آئے اور بالآخر اسی پر قناعت کر گئے۔

آئے دو ہی تین دن ہوئے تھے کہ وزیر اعظم بلکہ والیٔ مصر کرنل جمال عبدالناصر کی آمد کا غلغلہ ہوا۔ شاہانہ کروفر، تزک واحتشام سے آئے اور اسی گورنر جنرل ہاؤس کے ایک حصہ میں مقیم ہوئے۔ رات کو روشنی کی وہ جگمگاہٹ ہوئی کہ ہاؤس ایک بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا اور ذرا مبالغہ سے کام لیجئے تو رات پر دن کا گمان گزرتا تھا۔ اپنا معمول ہر روز دن میں عزیزوں، دوستوں سے ملنے ملانے کے لئے باہر نکل جانے کا تھا۔ شام کے وقت یاد ہوئی کہ یہ عاجز بھی شاہی دعوت (اسٹیٹ ڈنر) میں شریک ہو۔ میں اس وقت کئی میل دور کیماڑی میں عزیزی عشیر کے ہاں تھا بلکہ وہاں بھی کہاں تھا، وہاں سے نکل کر عزیزی ٹی کے قدوائی (لیفٹیننٹ کمانڈر) کے ساتھ کشتی پر ان کے مستقر جزیرہ منوڑا کو جا چکا تھا۔ ادھر میری طلبی میں ٹیلیفون کی گھنٹی پر گھنٹی بج رہی تھی، ادھر میں اس سے قطعاً بے خبر سیاحت سمندری میں مصروف، نماز مغرب اسی جزیرہ میں پڑھی۔ اس کے بعد جب بہ اطمینان کیماڑی پہنچا تو سب کو سخت مضطرب پایا کہ طلبی اتنی دیر سے ہو رہی ہے اور تم غائب! فون پر فون لگاتار آرہے تھے، کہ اتنے میں اسٹاف کے ایک صاحب تلاش گمشدہ میں بہ نفس نفیس بھی آگئے۔ خیر سرکاری ہی موٹر پر بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ ایک مضطرب الحال اے ڈی سی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور کہنا چاہئے کہ کشاں کشاں ڈنر ہال تک پہنچایا۔ غنیمت ہوا کہ ابھی کھانے کے وقت میں کچھ دیر تھی ورنہ حقیر سے حقیر مہمان کی بھی بلاوجہ غیر حاضری پر آئی گئی کسی اے ڈی سی کے سر ہوتی...... شاہی دعوتوں، ضیافتوں کے ضابطے ہی ہیں کچھ ایسے بے رحم!

میزبان و مہمان سب کی تعداد ملا کر کوئی سوا سو کے قریب ہو گی۔ دونوں ''سرکاروں'' کے برآمد ہونے میں کچھ وقفہ تھا۔ اور ہم سب بڑے اور چھوٹے (چھوٹا

یہاں میرے سوا اور تھا ہی کون۔ سب بڑے ہی تھے) ایک دوسرے بڑے ہال میں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ اسٹیٹ ڈنر میں شرکت کا زندگی میں پہلا موقع تھا۔ جگمگاہٹ اور ہر قسم کے تکلفات کی آب و تاب الفاظ میں کیا بیان ہو، چیز دیکھنے کی ہے سننے کی نہیں۔ مختلف گوشوں میں نیزہ بردار سپاہی ایک مخصوص قسم کی وردی میں ملبوس در و دیوار سے پیوستہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے کہ انسان سے کہیں زیادہ پتھر کے نصب شدہ بت نظر آتے تھے۔ مہمان آپس میں مل جل رہے تھے، ہنسی چہل ہو رہا تھا۔ سارے مجمع میں سب سے زیادہ بے جوڑ ان سطور کا راقم ہی تھا اور تماشائی سے کہیں بڑھ کر اس وقت تماشا بنا ہوا تھا۔ کھدر کی خلافتی ٹوپی، رنگین عبا، بے ہنگم داڑھی۔ اس وضع و قطع کا شخص، زرق برق، چست لباس والوں، سوٹ پوشوں کے درمیان اگر ہیولا یا مضحکہ بن کر نہ رہ جائے تو آخر کیا ہو۔ مہذب و شائستہ لوگ تھے۔ زبان سے کسی نے کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل میں جتنا بھی ہنس رہے ہوں کم ہے۔...... ہاں میرے سوا کچھ مستثنیات اور بھی تھے۔ عربی لباس عقال و عبا میں دو بزرگ غالباً سعودی سفیر اور ان کے نائب ہوں اور ایک شیروانی اور پاجامہ میں ملبوس اور چہرہ پر داڑھی لئے ہوئے سر محمد ظفر اللہ خاں...... عورتیں نہیں لیڈیاں بہت بڑی تعداد میں تو نہ تھیں کوئی ۲۵ ہوں گی لیکن الحمد للہ کہ سب بے حجاب نہ تھیں۔ بعض اچھے خاصے ساتر لباس میں ملبوس اور اسلامی حیا و شرافت کی لاج رکھے ہوئے تھیں بعض بین بین۔ صرف چار یا پانچ ایسی تھیں جو پوشاک ساتر سے زیادہ عریاں زیب تن کئے ہوئے خاص الخاص فرنگی انداز میں ہنس بول رہی تھیں اور خوش فعلیوں میں مشغول۔

اتنے بجکر اتنے منٹ پر دونوں "سرکار" برآمد ہوئے اور کسی افسر (غالباً ملٹری سیکرٹری) نے پکار کر انگریزی میں وہی کہا جسے شاہی درباروں کے نقیب کسی زمانہ میں "نگاہ روبرو" یا "باادب ہوشیار" سے ادا کرتے تھے اور اب خاص والئ مصر سے سب کا تعارف ایک آدھے آدھے منٹ میں فرداً فرداً کرایا گیا۔ جب اس سے فراغت ہوئی تو

کھانے کی میز پر بیٹھنے کی باری آئی۔ ہر مہمان کے لئے الگ الگ کرسی مشخص ہوتی ہے اور اس کے سامنے میز پر اس کے نام کا کتبہ لگا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں چھپی ہوئی فہرست مہمانوں کو دے دی جاتی ہے جس سے وہ اپنا نمبر تلاش کر لیتا ہے۔ میں جس کرسی پر تھا اس سے متصل ایک مصری کپتان تھے۔ ان سے انگریزی میں تھوڑی بہت گفتگو رہی، زیادہ مصری اور پاکستانی کھانوں سے متعلق، کھانے زیادہ تر انگریزی اور پاکستانی مذاق کے تھے۔ بریانی، شیرمال، مچھلی، مرغ مسلم اور طرح طرح کے کباب وغیرہ۔ مصری مہمان انھیں بڑے شوق سے کھا رہے تھے۔ میز کے تکلفات کا کہنا ہی کیا۔ آخر شاہی دعوت کی میز تھی لیکن کھانے میں کوئی ممنوع چیز کم سے کم میرے علم میں نہ تھی۔ بعض لوگوں کو کہتے ہوئے سنا تھا شراب ضرور ہو گی۔ اپنے تجربہ میں تو اس کو بالکل غلط پایا ...... انگریزی دعوتیں یوں بھی وقت بہت لیتی ہیں چہ جائیکہ شاہی دعوت! باجا برابر بج رہا تھا، برقی شعاعیں ڈال ڈال کر فوٹو پر فوٹو کھینچ رہے تھے، اکل و شرب کے ساتھ ساتھ بات چیت کرتے اور بات بات پر قہقہہ لگاتے رہنا عین داخل تہذیب ہے! پھر کھانے کے نئے نئے کورس خاصی دیر دیر کے بعد لائے جاتے تھے۔ غرض خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور "طعام" کے بعد "کلام" کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی تقریر میزبان گورنر جنرل بہادر کی طرف سے ہوئی جوان کے بجائے وزیر اعظم محمد علی صاحب نے انگریزی میں ادا کی۔ تقریر تلفظ و طرز ادا کے لحاظ سے بھی خاصی تھی اور بڑی بات یہ کہ اس میں اسلامیت کا اظہار اچھا خاصہ تھا۔ مصر و پاکستان کے درمیان رشتہ اشتراک اسلام ہی کو بتایا تھا، جوابی تقریر مناسب الفاظ میں خود کرنل ناصر نے انگریزی میں کی۔ اور اب مہمان اٹھے۔

ابھی روانگی کا اذن عام نہ ہوا تھا اس لئے برابر والے ہال میں، پھر کچھ دیر کے لئے ٹہلنا، بیٹھنا، کھڑے رہنا تھا۔ ایسی شاید نظریں مجھ کھدر پوش پر کچھ اور زیادہ ہی پڑیں۔ پاس سے ایک بلند قامت سوٹ پوش گزرے اور خود ہی اپنا تعارف کرا کے دو چار منٹ گفتگو فرمائی۔ یہ سر ملک فیروز خاں نون، اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔ ملک

صاحب کا ایک آدھ مرتبہ ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں رہ چکا تھا۔ لیکن اول تو اس کو بھی ایک زمانہ گزر گیا اور دوسرے اس وقت بھی نوبت کچھ زیادہ شناسائی کی نہ آئی تھی۔ ملک صاحب کے جاتے ہی ایک دوسرے سوٹ پوش بھی تشریف لائے اور اپنا تعارف کرایا۔ یہ آنریبل محمد ایوب کھوڑو صاحب وزیر اعلیٰ سندھ تھے۔ یہ نسبتاً زیادہ التفات سے پیش آئے اور اس وقت کی سرسری ملاقات میں تو اچھے ہی نظر آئے...... نماز عشاء آج وقت معمول سے ہٹ کر ذرا دیر میں پڑھی، حسب معمول مختصر سی جماعت کے ساتھ۔

دعوت کے درمیان اور دعوت کے بعد برابر یہ سوچتا رہا کہ دولت کا استعمال انسان کس بیدردی سے کرتا ہے۔ امیر و غریب کا فرق تو فطری ہے۔ اسلام نے اسے مٹایا نہیں، پوری طرح جائز رکھا ہے۔ بعض انبیاء سابقین سے قطع نظر خود ہمارے رسولؐ کے صحابیوں میں لکھ پتی بھی گزرے ہیں اور فاقہ کش بھی۔ امیر کو پورا حق ہے کہ اپنی دولت سے فائدہ اٹھائے اور اچھے اچھے کھانے کھائے لیکن اسراف کا سوال بہرحال رکھا ہوا ہے اور اعتدال و توازن بڑی نعمت ہے۔ آدمی خود اچھا کھا کر بہتوں کو اس میں شریک کر سکتا ہے اور بہتوں کو اسی طرح کا اچھا یا اس سے کچھ کم اچھا کھلا سکتا ہے۔ یہ کیا کہ خود تو اتنا اچھا کھالیا کہ اس کی تیاری ہی میں سینکڑوں ہزاروں پھنک گئے اور سینکڑوں ہزاروں بھائی بند ایسے رہ گئے جنھیں ان کھانوں کی خوشبو تک نصیب نہ ہوئی! اس کا نام بشریت نہیں، یہ بشریت کے حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ ۳۵،۳۰ سال کی بات ہے مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم کے ہاں ایک دعوت بڑی دھوم سے ہوئی تھی (غالباً ان کے یوپی کے ہوم ممبر ہونے پر) اس وقت بھی یہی سوچتا رہا تھا کہ کھانا بچ کر جتنی مقدار میں جا رہا ہے یہ آخر ہو گا کیا؟ اسی کو اگر تقسیم کر دیا جاتا تو دو چار گھر نہیں ایک آدھ محلّہ کے لئے کافی ہو جاتا...... اسلام یقیناً راہبوں، سنیاسیوں اور ترک دنیا کرنے والوں کا مذہب نہیں لیکن دوسری طرف وہ مسرفوں اور شکم پرستوں کا بھی مذہب

نہیں۔ کھاؤ اور کھلاؤ، جتنا کھاؤ اتنا کھلاؤ بھی۔ اسی تعلیم پر عمل اگر عام ہو جائے تو آج کتنی رنجشوں، کتنی خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو جائے اور یہ عمل کچھ بھی دشوار نہیں، فطرت انسانی کی پکار خود اسی جانب ہے کسی شدید مجاہدہ کی حاجت ہی اس کے لئے نہیں۔ قارون شامت کے مارے کو اہل حق نے جب نصیحت کی تو یہ نہیں کہا کہ تو دولت دنیا پر یکسر لات مار دے بلکہ یہ کہا کہ:

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۔(سورۃ القصص، رکوع ۸، پارہ ۲۰)

ترجمہ: دنیا میں جو تیرا حصہ ہے اسے بھلا نہ دے ہاں بس اتنا کر کہ جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حسن سلوک کیا ہے تو بھی دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہ۔



(۱۳)

کراچی نمبر (۶)

پرانی یادیں نئے نظارے

والیٔ مصر کا ایٹ ہوم دوسرے دن سہ پہر کو گورنر سندھ نواب سید افتخار حسین خاں والیٔ ممدوٹ کے ہاں تھا۔ کارڈ میرے نام آیا۔ میں حسب دستور سہ پہر کو باہر گیا ہوا تھا۔ رات گئے جب واپس آیا تو دعوت نامہ اپنی میز پر رکھا ہوا پایا۔ گورنر صاحب کو معذرت کا فون کر دیا کہ یہ صورت واقع ہوئی۔ جواب آیا کہ کل سہ پہر کو گورنر صاحب کے ساتھ چائے پیجئے۔ وقت پر پہنچا اور سرسری نظر سے گورنمنٹ ہاؤس کو دیکھا۔ یہاں کی اصطلاح میں گورنمنٹ ہاؤس (لاٹ صاحب کی کوٹھی) اسی کو کہتے ہیں۔ بڑے لاٹ صاحب کی کوٹھی گورنر جنرل ہاؤس کہلاتی ہے۔ اس کی وسعت بے پایاں کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ باقی بجائے خود یہ گورنمنٹ ہاؤس بھی کچھ کم نہیں۔ اے ڈی سی بڑے خوش اخلاق، ہنس مکھ نظر آئے۔ میرے سیکرٹری سمیت مجھے اتارا اور کئی کمرے طے کرتے ہوئے بالاخانہ کے ایک ملاقاتی کمرہ میں جا بٹھایا۔ نواب صاحب کے برآمد ہونے میں چند منٹ کا عرصہ تھا جب تک نماز عصر سے فراغت کر لی۔ اتفاق سے اسی حصہ میں سامنے کی طرف کوئی تصویر بھی نہ تھی۔ ہز ایکسیلنسی برآمد ہوئے ایک حسین و خوش نما چہرہ، جسم پر سادہ مشرقی لباس، ملے تو اس انداز سے کہ گویا اجنبی نہیں بلکہ پہلے کے ملاقاتی ہیں اور گویا کوئی اونچے حاکم نہیں۔ برابر کے ملنے جلنے والے ہیں۔ دیر تک روکے رکھا اور گفتگو ہر قسم کی، بے تکلفی سے جاری رکھی اور جب اٹھنے کی اجازت دی تو اس کا وعدہ لے لیا کہ دوسرے دن شب کو کھانے پر ملاقات ہوگی...... یہ دوسری ملاقات بھی ہوئی۔ اور قدرۃً بہت دیر تک جاری رہی۔ کھانے پر اور کئی صاحب بھی تھے۔ علمی، مذہبی گفتگوئیں

خوب آزادی سے ہوتی رہیں۔ یہیں مولانا عبدالحامد بدایونی (صدر جمعیۃ علماء پاکستان) بھی مل گئے۔ ملاقات آٹھ نو سال کے بعد ہوئی۔ گلے لگا کر محبت کی گرمجوشی سے ملے۔ ان کے بڑے بھائی مرحوم اپنے وقت کے مشہور خطیب و خوش بیان میرے ہم نام مجھ سے بالکل عزیزانہ بلکہ برادرانہ تعلق رکھتے تھے۔ یہیں بے شان و گمان مولانا جمال میاں سلمہٗ فرنگی محلی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ہیں اب تک ضابطہ کے لحاظ سے ہندوستانی بلکہ لکھنوی۔ لیکن غیر کراچی کے لئے بھی نہیں اور ڈھاکہ تو کہنا چاہئے کہ ان کا مستقر ہی ہے "میں ادھر بھی ہوں میں اُدھر بھی ہوں" کی زندہ قابل رشک تفسیر۔ اپنی ذات سے شرافت کے پتلے۔ یہ جہاں اور جسے مل جائیں سمجھئے کہ اسے بہت کچھ مل گیا...... دو سوا دو گھنٹہ کے بعد جب صحبت برخاست ہوئی تو دل نواب صاحب کی دلکش شخصیت سے متعلق بڑا خوشگوار اثر لے کر چلا۔ گفتگو، لب و لہجہ، چہرہ مہرہ کہیں سے بھی نہ تمکنت نہ بناوٹ۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ صوبے کے گورنر ہیں۔ سادگی و بے تکلفی ہر ادا میں۔ کاش پاکستان کا ہر حاکم اپنی ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے ایسا ہی ہوتا؟

کراچی میں بچھڑے ہوئے خدا جانے کہاں کہاں کے اور کب کب کے مل گئے۔ مولانا شوکت علیؒ کے چشم و چراغ اور محمد علیؒ کے بھتیجے اور داماد زاہد علی کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ برسوں ہو گئے تھے کہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن وہ بھی تھا کہ ان کا شمار اپنے عزیزوں میں تھا۔ ایک دن یک بیک فون آیا کہ میں اس وقت کراچی ہی میں ہوں، میاں بیوی دونوں۔ اور ہم لوگ شعیب صاحب (سفیر پاکستان برائے عراق) کے بنگلہ میں مقیم ہیں"۔ دل باغ باغ ہو گیا پتہ لگا کر اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کے ہاں پہنچا (کراچی میں مکانوں کا پتہ لگا لینا آسان نہیں) زاہد کے ساتھ ہی زہرابی بھی ملیں۔ اپنے سن سے کہیں زیادہ بوڑھی۔ یہ مولانا محمد علیؒ کی صاحبزادی اور اب تنہا زندہ صاحبزادی ہیں۔ کیا ربط و تعلق ان سے ہونا چاہئے تھا اور کیا ہے! حوادث تکوینی پر بس کس کا چلا ہے؟ یہیں ان دونوں کے فرزند طارق سلمہٗ سے

بھی ملاقات ہوئی تھی اس کو دہلی میں دفتر ہمدرد کامریڈ میں دیکھا تھا جب بچہ تھا اور کہاں اب ماشاء اللہ شادی شدہ جوان اور خود صاحب اولاد ہے!...... شوکت مرحوم کے نواسہ خالد شوکت علی سے بھی ملاقات یہیں کراچی میں ہوئی۔ جرنلزم کی ٹریننگ ولایت میں حاصل کر کے اب انگریزی کے صحافی ہیں اور حکومت پاکستان کے پریس اتاشی۔ اب تک غالباً امریکہ وغیرہ میں تھے۔ اب دہلی کے سفارت خانہ پاکستان میں جا رہے ہیں۔ گورنر جنرل ہاؤس آکر ملے اور بڑی خوشی یہ معلوم کر کے ہوئی کہ محمد علی مرحوم پر انگریزی میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ بات چیت زیادہ تر اسی موضوع پر رہی۔ ان کے پرانے ساتھیوں کی پوچھ پاچھ کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی اب اس عالم میں کہاں موجود!...... شعیب صاحب کے بنگلہ پر پہنچ کر ان کی اہلیہ گلنار مرحومہ (مولانا کی چھوٹی صاحبزادی) کا تصور آ جانا بالکل قدرتی تھا۔ انھیں کمروں میں رہتی سہتی ہوں گی۔ کھانے کی اسی میز پر کھاتی پیتی ہوں گی۔ یہیں کہیں جان دی ہو گی۔ جنازہ یوں اٹھا ہو گا، بچیاں یوں شیون و بین کر رہی ہوں گی۔ تصور کہاں کہاں گیا اور تخیل میں نقشے کیسے کیسے بنتے اور بگڑتے رہے۔

زاہد سلمہٗ، قد و قامت و جسامت میں گو اپنے والد ماجد سے کہیں پیچھے ہیں تاہم چہرے کی شباہت خصوصاً بات کرتے وقت بالکل ان کی ہو جاتی ہے اور جب بولتے ہیں تو بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہیں شوکت مرحوم بول رہے ہیں۔ باتیں وہ دیر تک کرتے رہے لیکن کان ان کی آواز پر نہیں آنکھیں چہرہ پر جمی رہیں۔ باتیں کچھ یوں ہی سی تھیں۔ کچھ سنیں اور کچھ ان سنی رہ گئیں۔ آنکھیں ان کے چہرہ سے نہ ہٹیں۔ سالہا سال کے بعد چہرہ گویا شوکت مرحوم کا سامنے تھا اور اپنی آنکھیں اس منظر سے متاثر ہو کر بے اختیار ڈبڈبا آئیں۔ زاہد سلمہٗ کا بھی دھیان اِدھر گیا یا نہیں، اگر کہیں انھوں نے دیکھ لیا ہو گا تو خدا جانے کیا خیال قائم کیا ہو گا!

ایک روز رات کے وقت بیٹھا ہوا تھا کہ حیدر آباد سندھ سے جوابی تار آیا

نواب محمد علی آف تاجپور اور ان کے بھائی کی طرف سے تھا۔ آنے اور ملاقات کی اجازت چاہی تھی۔ جواب لکھوا دیا کہ فلاں دن، فلاں وقت آیئے۔ آئے اور اس وقت تک میرے لئے گویا اجنبی ہی تھے۔ ملے تو پیکر خلوص و محبت نکلے۔ "صدق" و مدیر "صدق" کے ساتھ وہ مبالغہ آمیز حسن ظن کہ العظمۃ للہ مجھے حیرت اس لئے اور بھی کہ "صدق" کی زبان سندھ کے دیہات میں پوری طرح سمجھ میں کیسے آتی ہو گی۔ آخر میں مجھے تاجپور مدعو کیا اور یہاں سے وہاں تک موٹر کی سواری کے بھی انتظام پر آمادہ ہو گئے تاکہ میری واپسی کے پروگرام میں خلل نہ پڑے اور میں اپنی طے کی ہوئی ٹرین سے حیدر آباد اسٹیشن سے سوار ہو جاؤں۔ خیر جب اس سے معذوری ظاہر کی گئی تو چٹ جیب میں سے ایک معقول رقم نکالی اسے بطور نذرانۂ دعوت پیش کر دیا! واللہ کہ میں اس کے لئے بالکل ہی تیار نہ تھا دنگ رہ گیا اور اب ایک باقاعدہ میدان شروع ہوا۔ اِدھر سے انکار اُدھر سے اصرار۔ اِدھر سے یہ عذر کہ میں کوئی پیشہ ور مولوی مشائخ نہیں جو نذریں قبول کرتا پھروں۔ اُدھر سے یہ جواب کہ یہ رقم تو آپ کو تاجپور لانے اور دعوت کرنے کے لئے بہر حال نکال ہی چکے تھے۔ کشمکش دو ایک منٹ نہیں خاصی دیر تک جاری رہی اور بالآخر فتح انھیں اہل اخلاص کو حاصل رہی۔ خیال بھی نہ تھا کہ ہندوستان سے باہر اور ایسے دور دراز علاقوں میں ایسے ایسے مخلص پڑے ہوں گے!

ایسے ہی ایک روز رات کو فون پر ٹرنک کال خاص حیدر آباد سے آیا۔ یہ مولانا گیلانی کے بیٹے محی الدین گیلانی کا تھا جو یہاں کنٹونمنٹ مجسٹریٹ تھے۔ تاریخ اور وقت کا تعین ہوا اور وہ مع ایک اور عزیز کے آئے۔ انھیں ان کے بالکل بچپن میں حیدر آباد دکن میں دیکھا تھا۔ دوبارہ زیارت آج ہوئی۔ قرآن مجید میں ایک بزرگ شخصیت سے متعلق آیا ہے زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ علم کی بڑائی تو مولانا کے حصہ میں جس حصہ تک آچکی ظاہر ہی ہے لیکن جسم کی بڑائی سے مولانا اپنے زمانہ شباب میں بھی محروم رہے اس کمی کی تلافی ماشاء اللہ صاحبزادہ کے حصہ میں مقدر تھی...... "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کی ایک نئی شرح!

(۱۴)

کراچی نمبر (۷)

جوش وہوش

ایک روز صبح معلوم ہوا کہ پاکستان کے مشہور سابق وزیر خارجہ سر ظفر اللہ بھی آج کل امریکہ سے آئے ہوئے ہیں اور اسی لق ودق گورنر جنرل ہاؤس کے کسی حصہ میں مہمان ہیں۔ ان کی قانون دانی کی غیر معمولی شہرت اور یورپ وامریکہ میں اس کا اعتراف سن کر دل ان سے ملنے کو عرصہ سے چاہ رہا تھا۔ نوبت آج تک نہ آئی تھی۔ اب یہ موقع خداداد ہاتھ آگیا۔ ان کے ہاں جانے ہی کو تھا کہ خود ان کا فون آگیا کہ میں ملنے آرہا ہوں۔ اِدھر سے مکرر معذرت کرائی کہ آپ زحمت نہ کریں میں خود آیا جاتا ہوں لیکن وہ نہ مانے اور چند منٹ بعد تشریف لے ہی آئے۔ تصویر بارہا کی دیکھی ہوئی تھی اس لئے پہچاننے میں دقت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہی بشرتی چہرہ، وہی چہرہ پر داڑھی، گفتگو پہلے تو کچھ ذاتی اور نجی قسم کی رہی۔ مثلاً یہ فرمایا کہ "میں تو آپ سے ملنے کا شوق ۱۹۱۴ء سے رکھتا تھا۔ اسی سال بیرسٹری پاس کر کے ولایت سے آیا تھا۔ پنجاب کے فلاں صاحب قلم نے آپ کے مضامین پڑھ کر آپ سے ملنے کی ہدایت کی تھی" اور پھر کچھ دیر گفتگو سیاسیات پر رہی۔ سیاسی گفتگو پاکستان کے عہدہ داروں سے کرنے میں اب تک بڑی احتیاط برتی تھی۔ ان سے اس احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ یہ اب پاکستان کے عہدہ دار نہیں آزاد تھے۔ باتیں خاص اونچی رہیں اور ان کی بین الاقوامی شہرت کے مطابق۔ بات کر کے جی خوش ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ گفتگو کسی بلند سیاسی شخصیت سے ہو رہی ہے۔ بڑی خوشی اس کی ہوئی کہ ہندوستان وپاکستان کے باب میں موصوف مایوس نہیں بلکہ اچھے خاصے پرامید نظر آئے اور یہ ایک بڑی فال نیک معلوم

ہوئی......

ذکر احمدیوں کا چل نکلا ہے تو ایک آدھ لطیفہ بھی اور سن لیجئے۔ دو "احمدی" صاحب اور ملنے آئے اور ایک تیسرے صاحب سے ملاقات انڈو پاکستان انجمن کے ایٹ ہوم میں ہو گئی۔ صدق کی جرأت اخلاقی کی داد خوب ملتی رہی۔ اور خیر یہ تو حسب توقع تھی لیکن ایک صاحب نے تو کمال کر دیا۔ مجھ سے اظہار محبت فرماتے فرماتے کہنے لگے کہ "آپ ہمارے مرزا صاحب کے عزیز بھی تو ہوتے ہیں!" سبحان اللہ کیا تحقیق ہے! کہیں ایسی ہی وہمی تحقیقات نے تو ان حضرات کو "قادیانیت" کے چکر میں نہیں پھنسا رکھا ہے!...... ایک صاحب نے دعوت دی کہ کسی وقت ہماری انجمن احمدیہ میں آکر چائے پیجئے۔ خیر ان سے تو معذرت کر ہی دی لیکن دل نے کہا کہ یہ حضرت اچھے دوست نکلے بیچ شہر میں میرے پٹوانے کی فکر میں ہیں!

کراچی آکر یہاں کے علماء میں خاص اشتیاق مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سے ملنے کا تھا۔ افسوس ہے کہ پورا نہ ہو سکا۔ مولانا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ شخصاً اتنا متواضع اور تحریر میں اتنے سنجیدہ ومحتاط علماء اب کم ہی نکلیں گے۔

واعظ شہر مولانا احتشام الحق کا نام مدت سے سننے میں آرہا تھا۔ زیارت پہلی بار ہوئی اور ملاقاتیں متعدد رہیں۔ زاہد خشک نہیں بڑے باغ وبہار نکلے۔ صورۃً اور صوتاً دونوں طرح حضرت تھانویؒ سے اشبہ۔ اور میری کشش کے لئے یہی بہت تھا ایک جہری نماز ان کے پیچھے پڑھی جی میں آیا کہ

یہ پڑھیں اور سنا کرے کوئی

فن تجوید کی تو ابجد سے بھی اپنے کو واقفیت نہیں البتہ لحن کی دلکشی تو ہر عامی بھی محسوس کر سکتا ہے۔ وہ بالکل حضرت تھانویؒ کی سی محسوس ہوئی۔ لوگ ان کے بارے میں مختلف رائیں رکھتے ہیں اور کسی پبلک شخصیت کے لئے ایسا ہونا کچھ بعید بھی نہیں۔ انسان کی پوری سیرت وکردار کا تجربہ لمبے اور گہرے سابقہ کے بعد ہی ہوتا

ہے۔ بقول حضرت اکبر

اکبر کی برائی اچھائی پوچھ اس کے محلہ والوں سے
ہاں شعر وہ اچھا کہتے ہیں دیوان تو اُن کا دیکھا ہے

بہر حال اپنی جو چند صحبتیں ان سے رہیں وہ تو بڑی خوشگوار نکلیں...... انھیں کی مجلس میں ملاقات سیفی ندوی اور اسد ملتانی صاحب سے رہی اور اسد صاحب کے کلام سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ اثر زبیری لکھنوی ثم کراچوی کا شمار تو اپنے ہی لوگوں میں ہے، باہر والوں میں نہیں لیکن کلام ان کا بھی اسی مجلس میں سننے میں آیا۔ مولانا احتشام کے بڑے بھائی عزیز الحق صاحب اسلامی شاعر سے ملاقات دہلی کی تھی یہاں تجدید ہوئی۔ کسی اچھے سرکاری عہدہ پر ہیں۔

یہیں حسن اتفاق سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ان کی طرف سے مایوسی تھی کہ وہ یہاں نہیں۔ ایک دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور وہاں جانے کا وقت کہاں تھا۔ لیکن اللہ نے سن لی اور میرے قیام کی آخری تاریخوں میں انھیں کسی ضرورت سے یہاں بھجوادیا۔ قیام مولانا احتشام الحق ہی کے ہاں تھا اور یہاں ان سے مل کر تھانہ بھون کی یاد تازہ ہوگئی۔ مولانا ہی کی مجلسوں میں ایک اور صاحب سے نیاز حاصل رہا۔ سفید ریش، عابد و مرتاض، حضرت تھانویؒ سے تعلق رکھنے والے، نام یاد نہیں آیا۔ یہاں اور واحدی صاحب کی مجلسوں میں دونوں جگہ ان سے ملاقات رہی۔ (واحدی صاحب بھی اسی پڑوس میں رہتے ہیں) بڑے صاحب فہم معلوم ہوئے اچھا اثر ان کے ملنے کا پڑا۔ افسوس ہے کہ مولوی حاجی شبیر علی صاحب تھانوی کی زیارت نہ ہو سکی اور زیادہ حسرت اس کی ہے کہ اس وقت وہ یاد ہی نہ پڑے ورنہ کوئی صورت ملنے کی شاید نکل ہی آتی۔ ان سے ملاقات تھانہ بھون کی آدھی حاضری کے مرادف تھی۔ مولانا عبد الحامد بدایونی کا شمار میرے لئے علماء کے ذیل میں نہیں آتا۔ بحیثیت ایک قدیم دوست و مخلص کے بڑے تپاک سے ملے اور یہاں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک عالم دین سے کہیں زیادہ بحیثیت ایک لیڈر کے معروف و روشناس ہیں

لیکن بہر حال جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے صدر ہیں اور ان کی اس حیثیت سے قطع نظر کیسے کر لی جائے۔ اپنے ہاں جو پارٹی دی اس میں درویشانہ و مشائخانہ سادگی سے کہیں زیادہ لیڈرانہ دھوم دھام تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس پارٹی میں بکثرت اشخاص سے ملاقات ہوگئی۔ راجہ صاحب محمود آباد، سردار عبد الرب نشتر، وائس چانسلر ابو بکر احمد حلیم، منصور عالم صاحب کسٹوڈین، جمال میاں فرنگی محلی، حافظ فضل الرحمٰن انصاری ایم اے (علیگ) ایڈیٹر "وائس آف اسلام" وغیرھم۔ تاہم ہجوم کا ایک لازمہ چپقلش ہوتی ہی ہے۔ تصویر کشی کا حملہ میرے اوپر کراچی میں پہلے بھی ہوا تھا لیکن وہ انگریزی قسم کا ایٹ ہوم تھا۔ وہاں توقع بھی اسی کی تھی، بے شان و گمان اس سے کہیں زیادہ شدید حملہ تو یہاں ہوا یعنی عین جمعیۃ علماء اسلام کے دفتر میں! جسے میں بجا طور پر پناہ گاہ سمجھ سکتا تھا۔ مشہور مصرعہ "چو کفر از کعبہ برخیزد" کا پورا مصداق! اور اب یہ کیا بیان ہو کہ حملہ ہوا بھی تو کس کے ہاتھ سے!...... بہر حال جب تیزی کے ساتھ رخصت ہوا ہوں تو معزز مہمانوں کی صف بندی گروپ فوٹو گرافی کے لئے ہو رہی تھی!

مولانا مودودی کی جماعت اسلامی میں اپنے ملنے والے خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں مخلص ترین مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تھے جو قبل اس کے کہ بڑھاپے تک پہنچیں دنیا ہی سے رخصت ہو گئے۔ اس جماعت کی تشدد مزاجی کے بنا پر توقع نہ تھی کہ اس کے کوئی سے بھی رکن اب اس نیاز مند سے ملنا جلنا گوارا کریں گے لیکن اس کے برعکس کئی صاحب ملنے آئے ان میں سب سے نمایاں نام حسن ریاض صاحب کا ہے، بلند شہر کے رہنے والے بڑے پرانے صحافی ہیں۔ مولانا محمد علیؒ کے ہمدرد مرحوم میں بطور جونیئر کام کئے ہوئے۔ پھر جالب مرحوم کے روزنامہ "ہمت" (لکھنؤ) میں شریک ہو کر ان مرحوم کے بعد تک بھی ہمت محض اپنی بلند ہمتی سے نکالتے رہے اور بھی کئی پرچوں سے متعلق رہے۔ مخلص مسلمان اور سنجیدہ نویس ہمیشہ سے رہے۔ ایک زمانہ میں سخت مسلم لیگی تھے بلکہ دہلی سے نکلنے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سرکاری پرچہ

"منشور" کے ایڈیٹر تھے۔ رفتہ رفتہ جماعت اسلامی میں شریک ہو گئے[1] آئے اور اچھی طرح ملے۔ جماعت سے متعلق دو ایک جونیئر طالب علم بھی آئے۔ دسویں اور انٹرمیڈیٹ کے پڑھنے والے کمسنی کے تقاضے سے کچھ باتیں جماعتی تشدد کی بھی کر گئے لیکن جب ان کی جمعیۃ طلبہ کے اونچے نمائندہ خورشید احمد ایم اے[2] مع اپنے دو ایک ساتھیوں کے ملے تو وہ بڑے شائستہ و مہذب نظر آئے اور ان سے مل کر جی خوش ہوا۔ تبلیغی جوش جس جماعت کا بھی ہو اگر ہوش کی آمیزش سے خالی ہے تو اپنے مقاصد کو بجائے نفع کے کچھ نقصان ہی پہنچا دیتا ہے۔

---

[1] عین ان سطور کی نظر ثانی کے وقت حسن ریاض صاحب کا ایک طویل رجسٹرڈ مکتوب ملا جس میں جماعت اسلامی میں اپنی شرکت سے کامل تبری کی ہے۔

[2] ان صاحب کا مکتوب ان سطور کی اشاعت کے بعد آیا کہ ان کی جماعت، جماعت اسلامی سے علیحدہ اپنا کام مستقل حیثیت سے کر رہی ہے۔

(۱۵)

کراچی نمبر (۸)

اس قبلہ رُو جماعت کا انتشار دیکھو

تاج کمپنی کے مینجنگ ایجنٹ بلکہ عقل کل شیخ محمد عنایت اللہ صاحب سے جب ملاقات ہوئی اور انگریزی تفسیر کی سالہا سال سے ملتوی چھپائی سے متعلق تقاضا کیا گیا تو جواب میں ارشاد ہوا کہ "صرف اچھا کاغذ نہ ملنے سے کام رُکا ہوا ہے آپ اپنے معزز میزبان سے کہہ کر کاغذ کا لائسنس دلوا دیجئے تو کام ابھی شروع کروں"۔ یہ جواب وہ پہلے بھی بعض خطوں میں لکھ چکے تھے۔ خیر محترم میزبان سے کہنے کا نہ تو موقع ملا اور نہ ان سے اس قسم کی کوئی فرمائش مناسب معلوم ہوئی البتہ شیخ صاحب سے کاغذ کی قسم و مقدار نوٹ کرا لینے کے بعد جی میں یہ آئی کہ اس کا تذکرہ کسی وزیر باتدبیر سے کیجئے اور لائسنس ان سے لے لیجئے اور قرآن مجید کے کام کے لئے کون سے آنریبل منسٹر ایسے ہوں گے جو تامل روا رکھیں گے لیکن بالآخر رائے وزیر اعظم کے نام پر جمی۔ دل یوں بھی مسلم مملکت کے سب سے بڑے وزیر سے ملنے کو چاہ رہا تھا اور شاید بالکل قدرۃً۔

فون کر دیا، وقت مقرر ہوا۔ صبح کے غالباً ۹ بجے کا۔ وقت پر پہنچا لیکن ابھی اصل کوٹھی نہیں اس کے صدر دروازہ ہی تک رسائی ہوئی تھی کہ حکومت کے رعب و داب، چوکی پہرے، دودبک کا اندازہ ہو گیا۔ سندھ کے لاٹ صاحب کی کوٹھی پر بجائے پوچھ گچھ کے میرے سیکرٹری ہاتھوں ہاتھ لئے گئے تھے۔ یہاں پھاٹک ہی پر گورنر جنرل ہاؤس کی کار کو روک کر پولیس کے ادنیٰ اہلکار میرے سیکرٹری سے (جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سیاسیات کے معلم ہیں) ان تیوروں...... کے ساتھ پیش آئے کہ بجائے شکر کے صبر کا خاصا امتحان ہو گیا اور دل نے کہا کہ حکومت پاکستان صرف

شان جمال ہی نہیں پر تو جلال بھی رکھتی ہے۔ بہر حال ٹھیک وقت مقررہ کے بعد بھی انتظار خاصی دیر کرنا پڑا اور طلبی اس کے بعد ہوئی۔ کیبنٹ کے اجلاس روز ہو رہے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ غیر معمولی مصروفیت اس کا نتیجہ ہو۔ خیر سامنا ہوا جس طرح ایک حاکم کے سامنے ایک عامی کا ہوتا ہے۔ دو ہی ایک منٹ کے بعد حاضری کی غرض بیان کر دی گئی اور تفسیر مطبوعہ کا نسخہ ہاتھ میں دے دیا گیا۔ تو اسے دیکھ کر وزیر اعظم صاحب متاثر ہوئے۔ اب ملتفت ہوئے اور کاغذ پوری مقدار میں دلا دینے کا وعدہ کھلے دل سے کھلے الفاظ میں کیا۔ غرض ملاقات کا انجام اس کے آغاز سے بہتر رہا اور کم سے کم اس خدمت قرآنی کی حد تک حاضری پوری طرح کامیاب رہی۔ ایک اور صاحب کا کام بھی قرآن مجید ہی کے سلسلہ کا تھا اس کی بابت عرض کیا گیا۔ اس گزارش کی پذیرائی بھی توجہ والتفات کے ساتھ ہوئی۔

روانگی میں ایک دن باقی تھا کہ ریڈیائی تقریر کا وقت مقرر ہوا۔ عنوان اس رواروی میں قدرۃً میرے ہی اوپر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کوئی سیاسی یا نیم سیاسی موضوع تو یوں بھی خارج از بحث تھا۔ کسی ادبی یا علمی موضوع پر بھی گفتگو کے لئے فرصت کی ضرورت تھی۔ برجستہ ذہن میں آپ بیتی کا عنوان آیا۔ "مولانا کہلانے سے قبل[1]" وقت مقرر پر ریڈیو گھر پہنچا۔ عمارت عظیم الشان اور ہر طرح دار الحکومت کے شایان شان تو خیر ہوتی ہی، دل یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ اندر کے صدر دروازہ پر قرآن مجید کی آیت کا ایک ٹکڑا وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا کندہ ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ میز پر جو سرکاری سادہ کاغذ رکھے ہوئے تھے ان پر بھی یہی مونوگرام درج تھا۔ حکومت پاکستان کی بے دینی کا پروپیگنڈا اپنوں اور بیگانوں دونوں نے اتنا بے پناہ کیا ہے کہ مذہبیت اور دین داری کی ہلکی نشانیاں بھی جو ملیں، جی نہیں مانتا کہ انھیں بے ذکر کئے گزر جایا جائے...... تقریر ہوئی ۱۲، ۱۳ منٹ کے اندر اپنے طالب علمی کے دور کی گمراہیوں کی سرگزشت اور الحاد

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر (۱)

صریح سے اسلام کی طرف بازگشت کی روئیداد مختصر الفاظ میں سنا دی گئی۔ تقریر اس وقت ریکارڈ کر لی گئی اور اخبارات میں اعلان کے بعد دوسرے دن شام کو عین میری روانگی کے وقت نشر کر دی گئی۔

کراچی ریڈیو کے سٹیشن ڈاکٹر غلام قادر فرید رامپوری اپنے بالواسطہ عزیزوں میں ہوتے ہیں۔ کئی سال بعد ملاقات کی نوبت آئی اور یہیں حفیظ ہوشیارپوری سے بھی ملاقات کی تجدید ہوئی۔ ۱۳، ۱۴ سال ہوئے لاہور میں ایک بار ملنا ہوا تھا۔ سعید الحق دیسوی چیف نیوز ایڈیٹر تو اسٹیشن ہی پر ملاقات کو پہنچ گئے تھے اور پھر گورنر جنرل ہاؤس میں بھی آکر دیر تک رہے تھے۔ بہر حال یہ نشری تجربہ کامیاب و خوشگوار رہا۔

چودھری خلیق الزماں ایک زمانہ میں یوپی خصوصاً لکھنؤ کی مسلم سیاسیات کی جان تھے۔ کانگرس، خلافت، مسلم لیگ ہر تحریک میں مسلمان انھیں کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے رہے اور ان کی قیادت سال دو سال نہیں ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء سے لے کر ۴۶ء و ۴۷ء تک ۲۵، ۲۶ سال مسلسل قائم رہی اور اپنے ذاتی و قرابتی تعلقات ان سے ان کی اس پبلک حیثیت کے علاوہ۔ سفر کراچی کا جب خیال آتا تھا تو سب سے پہلا تصور انھیں کا آتا۔ اللہ کی مشیت کہ اب جب واقعی جانے کی صورت بنی تو چودھری صاحب کراچی سے ہزاروں میل دور انڈونیشیا میں مقیم نکلے۔ بہر حال ان کی حسرت ملاقات کراچی کے قیام بھر خلش پیدا کئے رہی۔

باقی جن لوگوں سے کراچی میں ملنے کی آرزو تھی ان میں ایک اونچا نام خواجہ ناظم الدین صاحب سلمہ اللہ (مرحوم وزیر اعظم و مرحوم گورنر جنرل) کا تھا اور افسوس ہے کہ یہ آرزو جوں کی توں رہی۔ پروگرام کچھ اس طرح جکڑا کسا رہا کہ ان کے ہاں حاضری کا کوئی وقت ہی نہ نکل سکا اور خود انھیں اپنے ہاں طلب کرنے کی تو ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی اسلامیت کے شہرے ایک ایک کی زبان پر تھے اور عبرت کی آنکھ کے لئے یہ نظارہ کچھ کم نہ تھا کہ ابھی کل تک پاکستان میں جو سب کچھ تھا وہ آج کچھ

بھی نہیں؟اور پھر انقلاب ہوا بھی تو کیسا دفعتہً کیسا آناً فاناً!...... دوسری جس ہستی سے ملنے کا شوق تھا وہ سردار عبدالرب نشتر کی تھی۔ ان سے ان کی مشہور و معروف اسلامیت کے علاوہ دوسرا رشتۂ اشتراک حضرت اکبر الہ آبادی سے عقیدت مندی کا تھا۔ بظاہر کوئی صورت ان سے بھی ملنے کی نہیں رہی تھی کہ بالکل آخری دن روانگی سے دو تین گھنٹہ قبل ایک پارٹی میں ملاقات ہو گئی۔ ایک تو وقت تنگ اور پھر ہجومِ بزم گفتگو قدرةً بہت تشنہ رہی۔ پھر بھی جتنی رہی اچھی رہی اور بحیثیت مجموعی قلب پر بڑا خوشگوار نقش نشتر صاحب کا رہا...... ایک پرانے کرم فرما محمد امین صاحب زبیری مارہروی ثم کراچوی صاحبِ "ضیائے حیات" ہیں، ان سے ملنے کا پہلے تو خیال ہی نہ آیا اور جب آخر میں ان کی طرف سے یاددہانی ہوئی جب بھی ملاقات کی عملی صورت نہ نکل سکی اور صرف حسرت ملاقات لئے واپس چلا آیا...... اور لیجئے ایک نام تو چھوٹا ہی جا رہا تھا، خوب وقت سے یاد پڑ گیا۔ یہ چوتھا نام مولوی تمیز الدین صاحب صدر اسمبلی و صدر "جمعیت الفلاح" کا تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق اسلامیت کی بنا پر خواجہ صاحب ہی کی طرح ان سے بھی ملنے کا اشتیاق تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ حسرت ہی رہی، شوق پورا ہونے کی کوئی صورت نہ نکل سکی اور اس کی اصل ذمہ داری اپنے ہی سہو و نسیان پر ہے...... اور اسی فہرست میں ان دو ناموں کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ ایک شعیب قریشی صاحب (سفیر پاکستان برائے عراق) دوسرے خواجہ شہاب الدین صاحب (سفیر پاکستان برائے حجاز) شعیب صاحب سے ذاتی نیاز مندی بہت قدیم ہے اور خواجہ صاحب کی شہرۂ آفاق اسلامیت نے ان کی زیارت کا مشتاق عرصہ سے بنا رکھا تھا۔ ڈاکٹر زبید احمد ایم اے، پی ایچ ڈی (سابق استاد عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی) کا ذکر اب تک نہ آسکا۔ یہ فروگزاشت ناقابل معافی ہے۔ اپنے علم و فضل، اپنی سیرت و کردار، اپنے جوش ایمانی ہر اعتبار سے ملنے کے قابل ہستی تھی۔ باوجود پیر میں تکلیف کے آخری روز ملنے آئے اور کچھ دیر تک اپنی گفتگو سے مستفید کیا۔

کراچی رہتے اب آٹھ دن ہو چکے تھے اور ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں کافی

ہو چکی تھیں۔ کراچی یا لاہور، دونوں شہروں میں ایک بڑا تکلیف دہ احساس اس کا رہا کہ بے اطمینانی اور بے چینی عام ہے۔ ہر فریق دوسرے سے بدگمان، اپنی حالت پر غیر مطمئن اور سب مل کر کہنا چاہئے کہ حکومت و حکام سے غیر مطمئن، بات بات پر ان پر نکتہ چینی اور ان کی جانب سے بدگمانی...... گویا حکمراں بھی اپنے میں سے نہیں بلکہ باہر سے لے آئے گئے ہیں!...... یہ ذہنیت کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں معلوم ہوئی۔ مسلمان کہیں کے بھی ہوں اب ان کا ذہن گویا مستقل طور پر اسی سانچہ میں ڈھل گیا ہے اور اپنوں پر نکتہ چینی اور ان سے بدگمانی تو جیسے ملت کی رگ رگ میں گھس گئی ہے۔ انھیں اپنے لیڈر تو فرشتے چاہئیں، ہر تخریبی اور محض جوشیلے مشغلہ میں سب سے آگے، نعرے لگانے اور جھنڈے نکالنے میں پیش پیش لیکن ادھر تعمیری کام کے حدود شروع ہوئے اور ادھر آپس ہی میں الزام تراشی اور دل آزاری کی بنیاد پڑ گئی۔ بانیٔ پاکستان بیچارہ خوش قسمت تھے کہ جلد ہی اپنے رب سے جا ملے۔ زندہ رہ گئے ہوتے تو کیا اپنوں کے زخم لسان سے بچے رہ سکتے تھے؟ بہر حال یہ تو اپنا کچھ قومی خاصہ ہی سا بن چکا ہے لیکن اس عمومی سبب کے علاوہ ایک خصوصی سبب یہ بھی ہے کہ پاکستان کے اکثر اعلیٰ ارکان حکومت مثلاً وزیر خزانہ، وزیر داخلہ، وزیر دفاع اور خود وزیر اعظم "پبلک" آدمی نہیں بلکہ شروع سے اب تک صرف سرکاری آدمی رہے ہیں اور سرکاری آدمی بالفرض کارگزار اور فرض شناس بھی ہوں جب بھی پبلک کے معتمد علیہ درجہ کامل میں تو نہیں ہو سکتے۔ سرکاری خدمات ہی میں نیک نامی، کارگزاری، فرض شناسی اگر کافی ہوتی تو اس معیار پر غلام محمد صاحب تو بہر حال پورے اتر ہی سکتے ہیں لیکن قوم "اچھی حکومت" سے بڑھ کر "اپنی حکومت" ڈھونڈھتی ہے اور یہ پیاس دفتر کی فائلوں سے نہیں بجھتی چاہے وہ کتنی ہی قابلیت سے مرتب کی ہوئی ہوں۔ وہ تو بجھتی ہے عیدگاہ میں بغلگیر ہونے سے، مسجدوں میں ایک صف میں بیٹھنے سے، سر راہ علیک سلیک ہوتے رہنے سے، اور شادی و غم کی محفلوں میں شرکت سے۔

اپنی صحافتی برادری کے جن لوگوں سے ملنے کا اشتیاق تھا ان میں ایک ممتاز ذات حافظ فضل الرحمٰن انصاری ایم اے، بی ٹی ایچ (علیگ) ایڈیٹر انگریزی ماہنامہ "وائس آف اسلام" کی تھی۔ ملاقات آخری دن ہوئی۔ گو بہت ہی تشنہ و ناتمام رہی...... جمال میاں فرنگی محلی سلمہ اللہ، کسے توقع تھی کہ وہ بے شان و گمان یہاں مل جائیں گے۔ ملے اور حسب توقع خوب ہی ملے، وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں گویا اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا کے مصداق۔ اور ان کا مل جانا ایک ہی وقت میں ایک مخلص دوست، ایک عزیز قریب، ایک شریف ترین انسان، ایک متوازن و صائب رائے رکھنے والی شخصیت اور ہندوستان اور پاکستان دونوں کے دوست سے مل جانا ہوتا ہے۔ بڑی باموقع اور مؤثر تقریر انھوں نے ایک عصرانہ کے موقع پر کی۔ جب مہمانوں کی طرف سے جوابی تقریر کے لئے نامزدگی انھیں کی ہوئی۔ انھوں نے کہا:

"اللہ کی نعمت کی ناقدری جب کی جاتی ہے تو وہ نعمت چھن جاتی ہے۔ آپ لوگوں کو ایک مستقل حکومت کی جو نعمت مل گئی ہے اس کی قدر کرنا سیکھئے۔ ہر وقت شکوہ شکایت میں لگے رہنا اس نعمت کی قدر نہ ہوئی ناقدری ہوئی"۔

جمال میاں سے بھی بڑھ کر اچانک اور غیر متوقع ملاقات ایک دوسرے فرنگی محلی عزیز اور لکھنؤ کے خوش بیان مقرر مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید سے ہوئی۔ لکھنؤ اور لکھنویت کا ایک مثالی نمونہ۔ جہاں کہیں بھی مل جائیں بس سمجھئے کہ وہیں لکھنؤ ہے۔ یہ اترے بھی آکر تو کہاں؟ حاجی اصطفٰی خاں صاحب (مشہور کارخانۂ عطر اصغر علی محمد علی لکھنوی کے سابق مالک) کے ہاں جو خود لکھنویت کے عطر مجسم ہیں! لفظ "دو آتشہ" کے استعمال کا صحیح محل شاید یہی ہے! ان کی تقریر کے شائقوں اور قدر دانوں نے انھیں لکھنؤ سے لاہور کسی جلسہ کے لئے بلایا تھا۔ کراچی کی کشش انھیں یہاں لے آئی۔ کاش یہاں بھی ان کے دو ایک بیان ہو گئے ہوتے...... خاں صاحب نے اپنے مکان کا نام "گل ولا" (Gul Villa) انگریزی قسم کا خدا معلوم کیوں رکھا اس سے تو

"گلکدہ" اچھا رہتا۔ اسی گلکدہ میں ہومیو پیتھ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ سالہا سال کے بعد۔ اور ان سے مل کر تھانہ بھون کی یاد تازہ ہو گئی۔ حضرت تھانویؒ کے ایک ممتاز خلیفۂ مجاز ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا جنازہ انھیں سے پڑھوایا گیا تھا۔

کراچی کی صحبتوں کا ذکر اب ختم ہونے پر آ رہا ہے۔ بڑی ناشکری ہو گی اگر دو صاحبوں کا ذکر خیر خصوصی طور پر نہ کیا جائے۔ ان میں سے ایک خواجہ عبدالوحید لاہوری ثم کراچوی ہیں۔ ضابطہ سے محکمہ اطلاعات میں منسلک، لیکن در حقیقت خدا معلوم کتنی اسلامی تحریکوں کے روح رواں اور انگریزی کتابی معلومات کے ایک چلتے پھرتے قاموس اور دوسرے خان بہادر ضیاء الدین احمد برنی دہلوی ہیں جو کبھی بمبئی کے تھے اور اب کراچی کے ہو چکے ہیں۔ میرے قدیم کرم فرما اور بڑے فعال مستعد و کارگزار۔ ان دونوں نے اپنا گویا سارا وقت اس نیاز مند ہی کے لئے وقف کر رکھا تھا، ہر وقت موجود ہر جگہ ساتھ۔ تنخواہ دار مقامی سیکرٹری رکھے ہوتے تو وہ بھی ان دونوں سے بڑھ کر کارگزار ثابت نہ ہوتے۔



(۱۶)

کراچی سے لاہور

گفتگو طول میں کھنچتی ہی چلی گئی اور جو بات شاید چند سطروں میں بھی کہی جا سکتی تھی ورق پر ورق بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوئے! درازنفسی کے لئے خصوصیت کچھ واعظ غریب کی نہیں، واقعات کی بجائے خود کثرت و فراوانی اور پھر ان کا گوناگوں تعدد اور اس پر مستزاد تنوع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ واقعات کے ساتھ ساتھ واردات خارجی کے نقوش کے قدم سے قدم ملائے قلب کے تاثرات! شعر بڑھ کر دو غزلہ کی حد تک نہ پہنچ جائے اور مضمون رسالہ کی ضخامت نہ اختیار کر لے، تو اور کیا ہو۔

یوں ہی فسانۂ شب غم تھا بہت طویل
اور اس پہ بیچ بیچ میں پھر داستان دل!

کہنے کو یوں تو بہت سی باتیں کہنے میں آگئیں لیکن خود میزبان سے متعلق بات چیت کچھ یوں ہی سی رہی۔

جانے سے پہلے خیال یہ تھا، اور اپنے ملک کے گورنروں کے حالات سے جو تھوڑی بہت واقفیت تھی، وہ اس خیال کی تائید میں تھی کہ گورنر جنرل کا عہدہ بس ایک طرح کا اعزاز ہی ہے۔ نام بہت بڑا کام بہت تھوڑا۔ ملک غلام محمد صاحب کی عیش سے گزر رہی ہو گی۔ جوانی کے سن کی محنتوں کا کفارہ اب ہمہ وقتی آرام سے کر رہے ہوں گے۔ مملکت کا کام سارا وزیر صاحبان اور ان کے سیکرٹری کرتے رہتے ہوں گے اور ان کے سر صرف یہ ہو گا کہ احکام پر دستخط کر دیئے، کبھی کبھی مسودہ پر ایک نظر کر لی۔ کبھی کچھ ذاتی ہدایات حکام ماتحت کو دے دیئے، باقی سارا وقت تفریح کی نذر...... آکر جو دیکھا تو صورت حال اس کے برعکس ہی پائی۔ صبح کام، شام کام، جب دیکھئے کام، اور عیش و تفریح کے لئے فرصت برائے نام۔ ابھی معلوم ہوا کہ فلاں سیکرٹری کاغذات لے کر

گئے ہوئے ہیں، ابھی سنا کہ فلاں محکمہ کے افسروں کی پیشی ہو رہی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اتنے اونچے مرتبہ پر پہنچ کر اُمت محمدی کا ایک فرد تو اپنے جوانی کے زمانہ کی ذہانت و فرض شناسی کی روایتوں کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

ملک صاحب گورنر جنرل ہاؤس میں بیٹھ کر گویا بادشاہی کرتے ہیں۔ ان کے ذاتی سٹاف میں شاید سب سے بڑے افسر ملٹری سیکرٹری کہلاتے ہیں۔ پھر پرائیویٹ سیکرٹری کا نمبر آتا ہے اور ان کے دو دو اسسٹنٹ ہیں۔ اے ڈی سی، ایک ایک نہیں چار چار کی تعداد میں، چاروں کام کے لئے چلتے پھرتے نہیں، یہ کہئے کہ دوڑتے رہتے ہیں۔ ملک صاحب کا رعب داب سب پر قائم! یہ بات بھی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے ورنہ عام طور سے خیال تو یہی پھیل گیا ہے کہ رعب داب انگریزوں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور اب نہ ڈسپلن کا وجود باقی ہے نہ کام میں مستعدی کا۔ ہر عہدہ دار اپنی جگہ پر احدی اور کام چوری، کاہلی اور فرض فراموشی کا پتلا بنا ہوا۔ گو پنڈت جواہر لال اور ان کے گرد و پیش کی حد تک ہندوستان میں بھی یہ کلیہ صحیح نہیں۔

میزبان کی حیثیت سے بھی ملک صاحب ایک اعتبار سے مثالی میزبان ثابت ہوئے۔ کھانے پینے کی خاطروں اور ہر طرح کے مادی، آرام اور آسائشوں کا تو خیر کہنا ہی نہیں، اس کا کچھ اندازہ تو پہلے ہی سے تھا، باقی بڑی چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ مہمان کے مذاق طبیعت کا خیال خاص طور پر رکھا۔ یہ بات بہت کم میزبانوں کے حصہ میں آتی ہے۔ بس رسمی خاطروں اور اندھادھند فرمائشوں کی بھرمار رکھی جاتی ہے۔ یہاں معاملہ اس کے برعکس رہا۔ فرمائشیں وہ کرائیں جن کی تعمیل بغیر دل پر کسی قسم کا بار ڈالے کر سکتا تھا۔ مثلاً ایک نشری تقریر، یا کراچی کے اردو ایڈیٹروں سے ملاقات کی تقریب، یا انڈو پاکستان انجمن کی طرف سے ایٹ ہوم، اتنا لحاظ کون میزبان کس مہمان کا رکھتا ہے اور پھر جب میزبان اتنا عالی مرتبہ ہو اور مہمان ایک گمنام گوشہ نشین! اس سے بڑھ کر یہ کہ میرے وقت کو بالکل آزاد رکھا۔ جہاں چاہتا آزادی سے جاتا آتا اور جس سے جتنی دیر چاہتا ملتا جلتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے پاس باریابی کے مواقع کچھ واجبی ہی

سے دیے۔ دربارداری کا جس کو سلیقہ نہ ہو اس کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ دربار سے تعلق ہی کم سے کم رکھے۔ زیادہ گفتگو ہوتی تو خدا معلوم کون کون سی اخلاقی، سیاسی یا مذہبی بحثیں چھڑ جاتیں۔ اللہ نے اس کڑے امتحان سے بالکل محفوظ رکھا...... میں کوئی مشیر یا اتالیق بن کر گیا بھی نہ تھا محض ایک ذاتی نیاز مند کی حیثیت سے گیا تھا اور الحمد للہ کہ اسی ذاتی نیاز مندی کو لئے ہوئے واپس ہوا۔

سٹاف کے بڑے چھوٹے جتنے لوگوں سے اپنا سابقہ رہا۔ بحمد اللہ وہ اچھے ہی ثابت ہوئے۔ عہدہ داروں میں نمبر اول پرائیویٹ سیکرٹری قدرت اللہ شہاب صاحب آئی سی ایس ہیں۔ انہوں نے میرے زمانۂ قیام میں تو بہر حال موقع کسی شکوہ کا نہ دیا اور کچھ بڑھ کر خوشگوار تجربے دونوں اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹریوں فرخ امین صاحب اور ایس اے غوری صاحبان سے متعلق بھی رہے۔ میری خاطر داری اے ڈی سی لیفٹیننٹ امام سے متعلق تھی۔ بیچارہ کو میری وجہ سے خاصی زحمت اٹھانا پڑی ہو گی۔ ذاتی سٹاف میں ایک خاتون بھی تھیں انگریز یا امریکی۔ ان کا عہدہ تو شاید اسٹینو گرافر کا تھا۔ بہر حال وقت مقرر کرانے کے سلسلہ میں ٹیلیفونی سابقہ ان سے بھی رہا۔ اور وہ برابر مہربانی ہی کرتی رہیں۔ آنے والوں اور وقت مقرر کرانے والوں کا جو تانتا لگا رہا اس سے ٹیلیفون ایکسچینج کے آپریٹر کو یقیناً زحمت ہوئی ہو گی۔ ان کا اور سٹاف کے اور چھوٹے عہدہ داروں کا جو میرے کام ہنسی خوشی کرتے رہے ان سب کا شکریہ اس تحریر کے ذریعے پیش ہو رہا ہے...... عہدہ داروں کے ذکر میں ایک صاحب کا نام خصوصیت کے ساتھ لینا ہے یہ مرکزی حکومت کے فنانس سیکرٹری ممتاز حسن صاحب ہیں ان کی ہمدردی و مہربانی سے نہ صرف دار المصنفین کا کام پورا ہو گیا بلکہ میرے ذاتی معاملات بھی ان کی توجہ سے حل ہو گئے۔ مدت دراز سے ایک رقم ایک پبلشر کے ذمہ چلی آ رہی تھی وہ وصول ہوئی۔ صدق کی قیمتیں متعدد خریداروں نے ادا کیں۔ غرض کہ چلتے چلتے ایک معقول رقم ادھر سے لانے کے لئے جمع ہو گئی تھی۔ اس کے لانے کی کوئی جائز قانونی

صورت بہت آسان نہ تھی (پاکستان و ہندوستان دونوں ملکوں کی رعایا کے واسطے ایک تکلیف دہ ترین صورت یہی مالی بندش کی ہے) اس کا حل انھیں نے نکالا۔ یہ اگر اتنا آڑے نہ آجاتے تو مشکلات میرے حل کئے تو بہر حال نہ ہو پاتیں۔

آٹھ دن کے اندر کراچی دیکھ لینا جس حد تک ممکن تھا، دیکھ لیا گیا۔ شہر اور مضافات کے اکثر حصہ نظر سے سرسری طور پر گزر گئے۔ بڑے بڑے بازاروں اور گزرگاہوں پر چھچلتی ہوئی نگاہ پڑ گئی۔ بڑے اور چھوٹے اور منجھولے تقریباً ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں ہو لیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ظاہر ہے کہ بالکل تڑ پڑ ہوا تاہم اپنے ظرف و بصیرت کے مطابق سمجھنے سمجھانے اور پھر کہنے کہلانے کا حق تو ہر جلد باز کو حاصل ہی رہتا ہے۔

کراچی ماشاء اللہ شہر ہے، بہت اچھا۔ خوشنما، کشادہ، آباد، پر رونق، پاکستان جیسی کم عمر مملکت کے شایان شان البتہ وسیع، عالی شان و سربفلک عمارتوں کے ساتھ ساتھ تنگ و تاریک، غلیظ گلیاں اور گری پڑی جھونپڑیاں بھی نظر میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔ لیکن جو صورت حالات شہر کی تشکیل میں پیش آتی چلی گئی اس لحاظ سے ایسا ہونا شاید کچھ ناگزیر ہی تھا...... مسجدیں لاہور کی طرح یہاں بھی آباد نکلیں۔ عصر و مغرب کی نمازیں عموماً مسجدوں ہی میں پڑھیں۔ ہر مسجد میں نمازی بڑی تعداد میں ملے۔ عورتوں کی بے حیائی کی خبریں جس شد و مد سے سننے میں آئی تھیں وہ بھی اچھی خاصی مبالغہ آمیز نکلیں۔ ہو سکتا ہے کہ شہر کے کسی حصہ میں بے حیائی عام ہو لیکن عموماً یہ کیفیت اس وقت تک بحمد اللہ ہرگز نہیں رہی۔ محض بے پردگی، وہ ہے۔ لیکن اتنی عام وہ بھی نہیں جو دور بیٹھے سنائی دے رہی تھی اور جتنی بھی ہے اس اظہار حقیقت کو گوارا کیا جائے کہ اس میں ایک حد تک دخل بعض علمائے کرام اور مخصوص جماعتوں کی شدت پسندی کو ہے۔ اگر ادھر سے اتنا اور ہمہ جہتی تشدد نہ برتا جاتا تو ادھر سے بھی اتنی ضد نہ پیدا ہوتی۔ عورت کی بے مہار آزادی کا اندازہ یہاں کے اخبارات کے مراسلاتی

کالموں سے ہوتا ہے۔ اخبار انگریزی ہی کے نہیں بعض اردو اخبارات سے بھی۔

ایک بڑی بات یہ کہ لاہور کی طرح یہاں بھی عمارتوں، باغوں، سڑکوں وغیرہ کے نام اب تک ہندوؤں، مسیحیوں، مجوسیوں کے نام کے ساتھ قائم ہیں۔ گاندھی گارڈن، ڈاکٹر گیدومل روڈ، وکٹوریہ روڈ، اس کی مثالیں یاد رہ گئیں۔

آٹھ دن کی بساط ہی کیا تھی، بڑی بڑی طویل عمریں، عمر کی بڑی سے بڑی مہلتیں دیکھتے ہی دیکھتے تمام ہو جاتی ہیں۔ اتھوارا پلک جھپکتے ختم ہو گیا۔ ۷/اپریل ۱۹۵۵ء کو صبح یہاں داخلہ ہوا تھا ۱۵/اپریل ۵۵ء کی شام بات کہتے آگئی ؎

کٹی رات حرف وحکایات میں
سحر ہو گئی بات کی بات میں

اور محبت کرنے والوں کے اس شہر کو بہرحال چھوڑنا پڑا۔ اور آٹھ سے قبل کا وقت تھا جب پوری پارٹی اسٹیشن پہنچ گئی۔ ابکی یہ سٹی اسٹیشن تھا جو کراچی کا آخری اسٹیشن ہے۔ رخصت کرنے والوں کا ہجوم حسب توقع اچھا خاصہ تھا۔ نام سب کے نہ اب یاد نہ دُہرانے کی ضرورت۔ اتنا یاد ہے کہ ابکی مجمع میں علاوہ عزیزوں، دوستوں، شناساؤں کے کچھ اجنبی حضرات بھی تھے۔ دو ایک دیندار چہرہ والوں نے نصیحت کے لئے خاص طور پر درخواست کی اور اس بے پناہ حسن، ظن پر یہ بے عمل کٹ کر رہ گیا۔ ایک صاحب نے عین گاڑی چھوٹتے وقت ایک اچھے قسم کا فاؤنٹین پن (روشنائی دار قلم) پیش کر دیا۔ اب ان کا نہ نام ذہن میں ہے نہ چہرہ مہرہ۔ اجر خالص ان کے حصہ میں رہا۔ ناشتہ کے نام سے کھانے کے ذخیرے ایک نہیں متعدد مہربانوں نے ساتھ کر دیئے اور رخصتی اس طرح ہوئی کہ جیسے کوئی پردیس سے اپنے وطن کو نہیں بلکہ وطن سے باہر جا رہا ہو۔ وطن شاید مٹی کے ذرات اور مٹی چونے کے درودیوار سے بڑھ کر نام محبت کرنے والوں کا ہے!

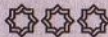
ایک عزیز خاص اسکویڈرن لیڈر ایف زماں (ہوائی فوج کے فہیم الزماں علیگ رامپوری) کا نام قیام لاہور کے سلسلے میں آچکا ہے۔ کسی سرکاری ضرورت سے پشاور

ے کراچی آئے ہوئے تھے۔ فرشتہ رحمت بنے ہوئے یہاں سے ساتھ ہو گئے اور راستہ ھر برابر خدمت کرتے اور ہر طرح آرام پہنچاتے رہے۔ کچھ عزیز کراچی کنٹونمنٹ ک ساتھ آئے اور یہاں ایک اور جماعت رخصت کرنے والوں کی ملی۔ گاڑی قریب ۱۱ بجے شب کے حیدر آباد سے گزری اور ایسے ناوقت بھی چار یا پانچ صاحب پلیٹ فارم پر موجود! ایک وہی مولانا گیلانی کے صاحبزادہ اور دو تاجپور کے مخلص جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور ایک آدھ صاحب اور!

رات گزری اور دن نکلا اور اسٹیشنوں کے سارے وہی منظر اپنے کو دُہراتے رہے جو ادھر سے جاتے ہوئے پیش آئے تھے۔ بہاولپور، ملتان، مانٹگومری، خدا معلوم کتنے مقامات سے بوئے محبت آئی۔ لیکن جی کا ہر چاہا ہوا پورا ہونا انسان کے مقدر میں کہاں رکھا گیا ہے؟ زندگی کے سارے سفر میں کتنے مقامات کو بس نگاہ حسرت سے ہی دیکھتے ہوئے گزر جانے پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ غالب نے تو ناجائز حسرتوں کی بھی داد ملنے کی تمنا کی ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

خیر یہ تو ممکن ہے کہ نری شاعری ہو لیکن بہرحال جائز حسرتیں تو ہر مومن کے لئے ایک بڑا ذخیرۂ آخرت ہوتی ہی ہیں۔



(۱۷)

لاہور نمبر (۴)

۱۶/ اپریل۔ شام کے آٹھ بج چکے تھے کہ سواد لاہور شروع ہو گیا اور منٹوں کے اندر اسٹیشن کا پلیٹ فارم آگیا۔ چند حضرات اس وقت بھی موجود تھے یعنی علاوہ میزبان اور ان کے عزیزوں کے مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی، سید اشرف صبوحی دہلوی، خواجہ بدر السلام فروغی وغیرہم اور ایک مجسٹریٹ میزبان کے نمائندہ کی حیثیت سے۔ یہ فروغی صاحب میاں اسلم صاحب کے مشہور ناشر ہیں اور انھیں کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ دیکھنے میں "صاحب نما" لیکن اندر سے مسلمان ہی مسلمان۔ سواری کا انتظام بھی حکومت ہی کی طرف سے۔ قیام حسب معمول انھیں میزبان، میجر صدیقی (نمبر ۸۷ مانٹگومری روڈ کنٹونمنٹ) کے ہاں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ مجسٹریٹ صاحب نے نمائندگی کے فرائض پوری طرح ادا کئے اور اپنی وسعت اخلاق سے دیر تک بیٹھے رہے۔ جعفری صاحب بھی اچھا خاصہ وقت گزار کر واپس گئے اور صبح جب آئے تو ایک اور صاحب کو ساتھ لئے ہوئے۔ یہ صاحب کوئی "تابع مہمل" نہ تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی تھے خاصے پرانے اہل علم اور بزم ثقافت میں جعفری صاحب کے ہم بزم۔ ان سے کوئی ۱۴-۱۵ سال پہلے اسی لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اس وقت بالکل جوان تھے اب پہچانے نہیں جاتے تھے۔ مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث۔ لیکن اعتقادی، کلامی، فقہی، ہر غلو ندوی "کلچر" سے دبا ہوا۔ مہذب، شستہ اور شائستہ، گشت ان صاحبین کے ساتھ شروع ہوا۔ آج ناشتہ فروغی صاحب کے ہاں تھا۔ ناشتہ دعوت نما ہونا ہی تھا اور یہی ہوا۔ ناشر صاحب مصنف صاحب سے دب کر کیوں رہنے لگے تھے۔ خاصا مجمع تھا اور صاحبوں کے نام اب ذہن میں نہیں۔ اور میاں صاحب کی موجودگی تو بہر حال ضروری تھی ہی۔ فروغی صاحب کے کاروبار کو دیکھا۔ ماشاء اللہ

فروغ پر ہے۔ امت کی بڑی خدمت اس دور میں اسلامی واصلاحی ناول وافسانہ کے ذریعہ سے بھی کی جاسکتی ہے اور اس میں میاں صاحب اور ان کے ناشر دونوں لگے ہوئے ہیں ...... خیال ایسا ہوتا تھا کہ ترقی پسندی کی آندھی نے اسلامی واصلاحی ناول کا چراغ مدت ہوئی گل کر دیا ہوگا اور اس جنس کے تاجر کسمپرسی کے عالم میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں گے لیکن فروغی صاحب کے کاروبار کا فروغ دیکھ کر دل خوش ہو گیا کہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ خریدار اور قدر دان اس قسم کے ادب کے بھی ماشاءاللہ اچھی بڑی تعداد میں موجود ہیں...... آج اس بیسویں صدی مسیحی کے وسط میں دین کی حمایت میں کن کن محاذوں پر لڑنا ناگزیر ہے اور ان میں سے ایک اہم ترین مورچہ شعر وادب کا ہے۔

راستہ میں دور سے حضرت میاں میرؒ کا مزار دکھائی دیا۔ اقبال کا کون پڑھنے والا ان کے نام نامی سے ناواقف رہ سکتا ہے۔ موٹر ہی سے فاتحہ پڑھ دیا۔ دوپہر کے قبل جب گھر واپس آیا تو کچھ ہی دیر بعد مولانا مودودی کے برادر بزرگ (گو خورد نما) مولوی ابوالخیر صاحب مودودی نے کرم فرمایا۔ دو اور صاحب بھی انھیں کی جماعت کے ان کے ہمراہ تھے۔ جی تو خود مولانا ہی سے ملنے کو چاہتا تھا وہ اس وقت تک جیل سے رہا نہیں ہوئے تھے مجبوراً پانی کے پیاسے کو شبنم پر قناعت کرنا پڑی...... جی چاہتا تھا کہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہٗ سے ایک بار اور نیاز حاصل ہو جاتا اور مولانا شاہ محمد جعفر ندوی سے بھی ملاقات تشنہ ہی رہی اور کسی طرح ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، میکش صاحب اور احسان دانش صاحب اور امین احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات کی صورت نکل آتی۔ ان آرزوؤں میں سے کوئی بھی پوری نہ ہو پائی اور دوپہر کو اسٹیشن آگیا...... اور لیجئے گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق استاد ڈاکٹر شیخ محمد عنایت اللہ کا نام ایسا ذہن سے نکلا کہ پاکستان کے قیام بھر یاد نہ پڑا نہ اس کے ہفتوں بعد۔ ذہن میں آیا تو اب اگست کی ۱۱/ تاریخ کو سفر نامہ کی یہ قسط لکھتے وقت! بشر اپنی کس چیز پر ناز کرے۔ جس حافظہ پر اتنا وثوق واعتماد ہوتا ہے! اس کا یہ حال ہے۔ لاہور میں نام یاد پڑ جاتا تو کم سے کم

یہی دریافت کر لیتا کہ موصوف اب ہیں کہاں۔ اتنا گہرا علم ولایت پلٹ دکاترہ میں ذرا کم ہی ملے گا۔

اسٹیشن پر کئی کئی صاحب موجود۔ عزیزوں کے علاوہ جعفری صاحب کا ہونا تو خیر لازمی تھا۔ میاں اسلم صاحب اور اشرف صبوحی صاحب (جنھوں نے یہ پیام پہنچایا کہ ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں، ورنہ ضرور آتے) مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا محمد اسحاق ایڈیٹر "الاعتصام" یہ اہل حدیث کا ہفتہ وار پرچہ ہے، گویا مولانا ثناء اللہ مرحوم کے مشہور "اہل حدیث" کا جانشین۔ ایک مذہبی پرچہ کی ادارت کے باوجود یہ خشک و عبوس نہیں، اچھے خاصے شگفتہ معلوم ہوئے اور ہر طرح ہونہار اور صاحب فہم ابھی جواں عمر ہیں۔ ایک بزرگ اور بھی تھے اور از راہ محبت بہت پہلے سے آگئے تھے افسوس ہے کہ اس وقت پورا تعارف نہ ہو سکا۔ بعد کو خیال آیا کہ حافظ نذر احمد صاحب تھے۔ غالباً اسلامیہ کالج میں استاد ہیں۔ اسلامی تاریخ و جغرافیہ پر ان کے کئی مضمون عرصہ ہوا پڑھے تھے۔ قابل قدر تھے اور تحریری تعارف اسی وقت ہو گیا تھا...... رخصتی کا منظر عموماً مؤثر ہوتا ہے، آج بھی تھا۔ کراچی اور لاہور دونوں شہر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ پردیس کے ہیں اپنے ہی معلوم ہوتے رہے، یہ رشتہ تو کم و بیش ہر مسلم ملک کے ساتھ ہے پھر پاکستان تو جغرافی حیثیت سے بھی اپنا ہی ہے علیحدگی جو کچھ بھی ہوئی ہے وہ سیاسی حیثیت سے ہے۔ مخلصوں، عزیزوں، دوستوں کی وہ کثرت کہ اپنا وطن یہی معلوم ہو رہا تھا۔ ٹرین حرکت میں آئی تو یہ محسوس ہونے کے بجائے کہ روانگی وطن کو ہو رہی ہے ایسا محسوس ہوا کہ روانگی وطن سے ہو رہی ہے۔ وطن کے حقوق اپنی جگہ پر مسلم لیکن یہ جذبہ بھی ہر گز منافیٔ وطنیت نہیں۔

گاڑی دوپہر کے بعد چلی اور اسی گاڑی سے عبدالرؤف عباسی صاحب ایڈیٹر روزنامہ "حق" لکھنؤ سابق منیجر "صدق" بھی کراچی سے لکھنؤ واپس ہو رہے ہیں۔ کئی مہینہ سے آئے ہوئے تھے...... گاڑی چلی اور دل اس سوچ میں پڑ گیا کہ دیکھئے اب پھر

کب یہاں آنا ہوتا ہے اور سرے سے دوبارہ آنا مقدر رہے بھی یا نہیں۔ اسی مرتبہ آجانے کی توقع کس کو تھی اور ظاہری اسباب تھے ہی کیا؟ یہ محض ایک غیبی القاء تھا کہ جس سے بے شان و گمان گورنر جنرل بہادر کے قلب میں ایک ادنیٰ اور قدیم نیاز مند کو دعوت دینے کا داعیہ پیدا ہوا اور اس گوشہ نشین نے بھی تامل و تذبذب کے بعد اسے منظور کر لیا اور آنے جانے کی صورت پیدا ہو گئی۔ بیشک جو قادر مطلق ایک بار پر قادر تھا وہ دوسری بار پر بھی اسی آسانی سے قادر ہے لیکن بہرحال جہاں تک اسباب ظاہر کا تعلق ہے وہ جتنے ضعیف تھے اب ان سے بھی ضعیف تر ہو گئے ہیں۔

بات کی بات میں جلوا اسٹیشن آگیا۔ وہی جہاں پاکستان کی طرف سے زبردست چیکنگ ہوتی ہے اور عام مسافر اس کے نام سے ہول کھاتے ہیں۔ اپنا تجربہ ایک بالکل خصوصی استثنائی طور پر یہاں پہلی بار بھی خوشگوار رہا تھا اور ابکی تو اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوشگوار رہا۔ پہلے کسٹم کے ایک افسر ملے وہ بھی مہربان تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اختر حسین زیدی آگئے اور وہ تو یکسر لطف و کرم ہی نکلے۔ دوسروں کو دیکھ رہا تھا کہ بیچاروں کو رتی رتی سامان کے ساتھ اتر کر جانا پڑ رہا تھا اور ہر طرح تکلیف ہی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے کو سرے سے نہ خود اُترنا پڑا نہ کوئی سامان اُتارنا پڑا۔ قلی ولی جو لپک کر آئے مایوس واپس گئے۔ اُلٹی ہم لوگوں کی خاطریں بھی چائے پانی سے ہوتی رہیں۔ میرے سیکرٹری ہی جا کر ضابطہ کی شرطیں پوری کر آئے اور پھر جب ٹرین چلنے لگی تو انھیں زیدی صاحب نے گارڈ سے کہہ دیا کہ دیکھئے مولانا کو کوئی زحمت نہ اٹاری میں ہونے پائے اور نہ امرتسر میں۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے ساتھ ساتھ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کا نظارہ ناسوت سے رخصتی اور برزخ میں داخلہ کے وقت تو ہوتا ہی ہے اس کا ہلکا سا نمونہ کبھی کبھی جیتے جاگتے اسی حواسوں کی دنیا میں بھی دیکھنے میں آجاتا ہے۔

اٹاری اسٹیشن کے آجانے میں دیر ہی کیا لگتی۔ یہ ہندوستان کا چیکنگ اسٹیشن ہے۔ پچھلی بار ادھر سے گزر جانے میں اس کے جو تلخ تجربے ہو چکے تھے اس نے نام ہی کو دہشت ناک بنا دیا تھا۔ گاڑی رُکی لیکن الحمد للہ کہ ابکی یہ منزل بھی آسانی ہی سے گزر

گئی۔ سامان ضرور اُترا اور اس کا جائزہ بھی لیا گیا لیکن ہم میاں بیوی گاڑی ہی میں بیٹھے رہے...... ٹرین باری باری ایک روز ہندوستان کی ہوتی ہے ایک روز پاکستان کی۔ آج ہندوستان کی ٹرین کا دن تھا۔ اسٹاک (گاڑیاں) اور اسٹاف (عملہ) سب ہندوستان کا تھا۔ گارڈ بیچارہ بہت شریف تھا اس نے یہاں کے کسٹم والوں سے بھی کہہ دیا اور آگے چل کر امرتسر پر بھی خیال رکھا۔

امرتسر آگیا۔ پنجاب میل پلیٹ فارم نمبر ایک پر تھا۔ خاصہ وقت وہاں تک پہنچنے میں لگا۔ کتابوں کے گڈ کے گڈا کی ساتھ تھے اور سامان بھی کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ اس پنجاب میل کے ساتھ بھی کیا کیا یادیں وابستہ ہیں۔ امرتسر ابھی کل کی بات ہے کہ لاہور ہی کی طرح ایک اسلامی شہر تھا۔ لاہور و امرتسر دونوں گویا بھائی بھائی تھے۔ آج ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تک رہ چکے ہیں۔ یہی پنجاب میل تھا کہ پنجاب کو یوپی، بہار، بنگال سے ملانے والا تھا۔ کلکتہ سے چل کر لکھنؤ ہوتا ہوا لاہور جا کر رُکتا تھا۔ اب امرتسر پر ختم اور یہیں سے شروع ہو کر تفریق کی یاد دلانے والا ہے۔ تحریک خلافت کا دور سامنے آگیا۔ پشاور اور لاہور سے چل کر کیسی ٹولیاں مخلص کارکنوں کی اسی پنجاب میل سے لکھنؤ آیا کرتی تھیں!......

اب وہ سب خواب و خیال ہے!

جالندھر، لدھیانہ، سرہند، انبالہ یہ سارے اسٹیشن حسب معمول رات میں گزر گئے اور ۱۸/اپریل کی ٹھیک دوپہر کو یہ مسافر پورے ڈھائی ہفتہ بعد لکھنؤ اسٹیشن پر وارد ہو گیا...... آج پیشوائی کے لئے کوئی مجمع نہ تھا۔ صرف گنتی کے قریبی اعزہ موجود تھے۔ مجمع کیوں ہوتا۔ مسافر اپنی ذات سے اکیلا گیا تھا اسی طرح واپس آگیا۔ ''اعجوبہ'' اور سنسنی خیز صفات اضافی اپنے ساتھ لگا کر نہ لایا۔ جب تماشا ہی سرے سے نہ تھا تو تماشائیوں کے ٹھٹ کیوں لگتے!

اصل سفر نامہ کی قسطیں تمام ہو گئیں۔ جس طرح ایک دن اصل سفر شروع ہو کر ایک دن ختم ہو گیا تھا اسی طرح خود زندگی کا سفر بھی شروع ہو کر ایک دن ختم ہونا ہی ہے اور اس کا سفر نامہ یعنی ''سفر نامہ حیات'' آہ! کہ گو اس کی ذمہ داری بہت کچھ مسافر کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے پھر بھی اس کی مفصل و مکمل تحریر انسان کے نہیں فرشتوں ہی کے ہاتھ کی ہو سکتی ہے! اور اپنی حیات ناسوتی میں رہ کر آپ بیتی کے پڑھنے کی اجازت کس کو!؎

تن ز جاں و جاں ز تن مستور نیست
لیک کس را دید جاں دستور نیست



(۱۸)

معروضاتِ خصوصی

حاصلِ سفر

روداد سفر خدا خدا کر کے ختم ہوئی۔ کسے توقع تھی کہ زندگی میں کبھی بھی اس کا موقع ملے گا۔ اس مختصر سیاحت کا اور اس کی اتنی مفصل روئیداد نگاری کا! اب اس کے خاتمہ پر جی میں ہے کہ چند مختصر گزارشیں بطور حاصل سفر کے عرض کر دیجئے اور چونکہ ممکن ہے کہ بعض طبائع کو ان معروضات میں شیرینی سے زیادہ تلخی نظر آئے اس لئے بہتر ہو گا کہ شروع ہی میں اقبال کے مشہور مصرعہ کا بھی استحضار کر لیا جائے ع

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

بڑے دکھ اور دلی کرب کے ساتھ یہ محسوس ہوا کہ جس اتحاد اُمت، یکدلی یکجہتی کو وجود میں لانے اور اسے ترقی دینے کے لئے پاکستان بنا تھا، خود ہی مفقود ہے۔ قدم قدم پر انتشار، بات بات میں اختلاف اور سب سے مہلک زہر رگ رگ میں سرایت کیا ہوا صوبائی تعصب کا! حسرت ہی رہی کہ کسی پنجابی کی زبان سے کسی بنگالی کے حق میں کلمۂ خیر سنا ہوتا۔ کسی بنگالی نے کسی سندھی کا نام خوشدلی سے لیا ہوتا۔ کسی سندھی نے کسی سرحدی پر اعتماد ظاہر کیا ہوتا!...... حد یہ ہے کہ مہاجرین تک مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کی طرف بجائے محبت واخوت کے رقابت بلکہ دشمنی کی نظر سے دیکھنے والے "رُحَمَاءُ کے بجائے اَشِدَّآءُ کے مصداق۔ یوپی والے، بمبئی والے، بہاری، دکھنی سب الگ الگ پارٹیوں میں تقسیم، تنظیم سے کوسوں دور! اس زہر کا توڑ صرف ایک ہی تھا ایمانی اخوت۔ یہی سب کو ایک سانچہ میں ڈھال سکتی ہے اور وہی ناپید۔

پھر یہ تفریق تو صرف وطنی بنیاد پر تھی۔ خود مذہبی حیثیت سے بھی ایک انتشار کا عالم طاری۔ نئے اور پرانے ملا کر خدا معلوم کتنے فرقے تیار اور کس کثرت وتنوع کے ساتھ دینی دعوتیں بڑے بڑے زبردست داعیوں کی طرف سے جاری! بعض جدید تحریکیں یقیناً اصلاح، اتحاد و مرکزیت ہی کا مقصد لے کر اٹھیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ خود ایک مستقل فرقہ، ایک تخریبی عنصر بن گئیں...... شکوہ کس کس کا کیا جائے اور کس ایک گروہ یا جماعت کا نام لے کر ذمہ داری اس کے سر ڈال دی جائے۔ کسی میں اخلاص ہے تو تدبر نہیں، اور کہیں اگر جوش ہے تو وہ ہوش سے عاری! یہ تذکرہ ہرگز خوشگوار نہیں لیکن اسے نظر انداز کر جانا بھی کیونکر ممکن ہے؟

ایک اور چیز اس سے ملتی جلتی ہوئی ایک مرکزی شخصیت کی افسوسناک کمی ہے۔ مسلمان یوں بھی اپنے کسی لیڈر کو لیڈری کے منصب پر قائم رکھنے کے قائل نہیں رہے ہیں۔ مولانا محمد علیؒ کے زمانہ سے یہی تماشا ہندوستان میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ہر لیڈر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے قصور پیدا کرو، اس کی ہر لغزش، ہر بشری کمزوری کی اس مبالغہ کے ساتھ تشہیر کرو، اس کے ہر عیب کا اس طرح خوردبینی معائنہ کرو کہ اس میں ہر طرح کیڑے ہی کیڑے نظر آنے لگیں۔ صرف ایک قائداعظم جناح کی ذات پر سواد اعظم کا کسی طرح اتفاق ہو گیا تھا۔ بس ان کے بعد سے پھر وہی افراتفری اور پاکستان بھر میں کوئی ذات ایسی نظر نہیں آتی جس کی سرداری پر سب کا اجماع تو خیر کیا ہوتا پچاس فیصدی کا اتفاق ہو گیا ہوتا۔ لے دے کے اگر کوئی شخصیت کسی درجہ میں اس وقت متفق علیہ تسلیم کی جاسکتی ہے تو وہ گورنر جنرل ملک غلام محمد ہی کی ہے۔

ہندو پاکستان کے باہمی تعلقات یہ دیکھ کر دل بہت ہی کڑھا کہ محض آپس کی ضدم ضدا نے اس درجہ خراب کر رکھے ہیں۔ نفس تقسیم ملک ہرگز دشمنی کو مستلزم نہیں۔ حقیقی بھائیوں کے درمیان جائیداد کی تقسیم ہوتی رہتی ہے اور بارہا اس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدتوں کے بگڑے ہوئے تعلقات از سر نو سدھر جاتے ہیں بعینہٖ یہی صورت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی ممکن تھی اور آج بھی ناممکن نہیں ہے۔

لاہور کراچی دونوں جگہ یہ محسوس کر کے دل کو کس درجہ کوفت اور اذیت ہوتی تھی کہ گرد و پیش کے سارے محبت کرنے والے ہی جمع ہیں۔ بہت سے تو عزیز ہیں اور جو عزیز نہیں وہ بھی فرط اخلاص کی بنا پر عزیزوں ہی میں شمار کے لائق۔ لیکن اس ساری یگانگت کے باوجود پھر اجنبی، پھر غیر، پھر بیگانے!...... مور جنگل میں اپنے خوشنما پر پھیلا پھیلا کر خوش ہو رہا تھا، ناچ رہا تھا کہ یک بیک نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی، اور دل کی کلی معاً مرجھا کر رہ گئی!

مطالبۂ قیام پاکستان کا ماحصل کل یہی تھا نہ کہ ایک خطۂ زمین پر مسلمانوں کو اپنی آئیڈیالوجی اپنے دینی اصول کے مطابق و ماتحت حکومت قائم کرنے کا پورا موقع حاصل ہو۔ مان لیجئے کہ یہ مطالبہ سو فیصدی صحیح تھا اس سے یہ لازم کہاں سے آتا ہے کہ زندگی یا کم سے کم سیاسی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ میں اشتراک کی نفی ہو گئی؟ شریعت کے اوامر و نواہی، فرائض و واجبات اور ممنوعات و محرمات کا تعلق تو سیاسی زندگی کے بھی چند ہی شعبوں سے ہے اور چند نہ سہی اکثر سہی باقی شعبے جو مباحات کے دائرہ میں ہیں اور جن کا تعلق بلا قید مذہب و ملت عام انسانی فلاح و بہبود سے ہے، وہ تو بہر حال پھر بھی کھلے رہ جاتے ہیں اور للہ کوئی بتائے کہ ان میں اشتراک، تعاون و اتحاد سے کونسا امر مانع ہے؟...... چور کو یقیناً اپنے ہاں اسلامی سزا دیجئے، شراب کی بندش اپنے ہاں یقیناً یکسر کیجئے، فواحش پر سختی سے سخت قدغن ضرور لگایئے، سود خوری کا نام و نشان تک مٹا دیجئے، ترکہ کی تقسیم تمام تر شریعت کے تحت میں لایئے، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی فضا سر تا سر اسلامی قالب میں ڈھالیئے لیکن ریل، ڈاک، تار، سڑکوں کی تعمیر، راستہ کی صفائی، حیوانات کی نگہداشت، بیماریوں کے علاج، شفاخانوں کے قیام، جغرافی معلومات، ریاضیات و طبیعیات کی تحقیقات وغیرہا۔ بیسیوں غیر اختلافی انتظامی شعبوں میں کوئی تفریق و اختلاف کو کیوں راہ دیجئے؟ اور کیوں نہ اہم مشترک مسائل میں دونوں ہمسائے ملک ایک زیادہ سے زیادہ مشترک پروگرام تیار رکھیں؟ ان مسائل میں آخر اختلاف و نزاع کی بنیاد کہاں سے قائم ہوتی ہے۔ تاوقتیکہ عقل سلیم کو ضد کا غلام نہ

بنا دیا جائے۔ سب سے بڑھ کر کڑی آزمائش ہندی مسلمانوں کے لئے ہے۔ وہ ہندوستان میں رہ کر ایک طرف اپنی وطنیت کو کیسے بھلا دیں؟ اپنے اس جغرافی، سیاسی، قانونی وطن کے حقوق کی طرف سے کیسے غداری بے وفائی اختیار کریں؟ دوسری طرف پاکستان ان کی دینی برادری والوں اور عزیزوں کا وطن ہے، اس سرزمین کے تہذیبی معاشرتی برادرانہ روابط کو وہ کیا کریں؟ خونی رشتوں کی طرف سے کیسے آنکھ بند کر لیں؟ مجنوں غریب کی جان کے لئے تو صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ دونوں "عذاب" الٰہی کا حکم رکھتے ہیں۔

دونوں ملکوں کے اونچے طبقات میں کیا مخلص اہل فہم بھی ایسے نہیں جو اس اشتراک مع الاختلاف کے موضوع کو اپنا کے اس کی عملی صورتیں نکالیں؟ اور اس طرح لاکھوں نہیں کروڑوں بندگان خدا کی دعائیں اپنے لئے حاصل کریں؟ کتنا مبارک و خوش آئند ہوگا اس دن کا طلوع جب ہندوستان پاکستان کو اپنا قوت بازو اور اپنی مغربی سرحد کا محافظ و پشتیبان سمجھے گا اور پاکستان از سر نو ہندوستان کو اپنا شریک جسم و جان اور ایک مخلص حلیف سمجھنے لگے گا!

متاع وصل خسرو ...... بس گراں است

گر ایں سودا بہ جاں بودے چہ بودے!

ایک طرف غلام محمد، دوسری طرف جواہر لال ان دونوں کے عہد سے بڑھ کر ساعت سعید اس یوم عید کے لئے اور کب آسکتی ہے!



ضمیمہ نمبر (۱)

مولانا کہلانے سے قبل

نشریہ۔ نشرگاہ کراچی سے ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء۔ بوقت شام وقفہ ۱۱ منٹ

نیم حکیم خطرۂ جاں کے وزن پر نیم ملا خطرۂ ایماں کی کہاوت بھلا کس نے نہ سنی ہوگی۔ آج اسی طرح کے ایک بنے ہوئے اور نام کے مولانا کی داستان حیات کا ایک ٹکڑا چند منٹ میں خود اسی کی زبان سے سن لیجئے۔

اپنی آنکھ جس ماحول میں کھلی وہ اچھا خاصا مذہبی تھا۔ گھرانا کھاتا پیتا ساتھ ہی پورا دیندار، یہ قصہ اٹھارویں صدی آخر کا ہے یا پوری گنتی سننا چاہتے ہوں تو ۱۸۹۲ء کا۔ عادتیں اپنی بھی قدرۃً مذہبی قسم کی پڑ گئیں۔ نماز روزہ کی پابندی، قرآن مجید کی تلاوت، دینی کتابوں کا مطالعہ وغیرہ اور یہ سب بطور خشک معمول کے نہیں بلکہ عقائد میں پختگی اور جوش بھی ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کو دین کی تبلیغ بلکہ ان سے مباحثہ و مناظرہ بھی۔ اسکولی زندگی میں اسلامیت کا یہی عالم رہا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی گویا پیدائشی تھا۔ عنوانات مذہبی بھی پیش نظر رہے اور باتیں خود سے سوچتا تو خیر کیا اوروں کی لکھی ہوئی پڑھتا اور انھیں کو اپنے قلم سے دہرا دیتا۔ اب کسی کو یقین آئے یا نہ آئے واقعہ بہرحال یہی ہے کہ بری بھلی مضمون نگاری بارہ سال کے سن سے شروع ہو گئی تھی۔

ہائی اسکول پاس کر کے داخلہ کالج میں ہوا۔ اب ۱۹۰۸ء آ گیا۔ اب مستقل رہنا سہنا لکھنؤ میں شروع ہوا جہاں کمی نہ کتابوں کی تھی اور نہ انگریزی قسم کے کتب خانوں کی، ادھر لپکا کتب بینی کا پڑا ہوا تھا جو کتاب بھی سامنے پڑ گئی، بس اسے کتاب کے کیڑے کی طرح چاٹ گیا۔ کوئی یہ بتانے والا تھا نہیں کہ کتاب ہے کس نوعیت اور کس پائے کی۔ اتفاق کی بات کہ شروع ہی میں سابقہ جس کتاب سے پڑا وہ ایک سخت ملحد قسم کے انگریز ڈاکٹر کی کتاب (Elements of Social Sciences) تھی۔ الحاد کا راز تو بہت دنوں

بعد کھلا۔ ظالم نے پیرایہ بیان تمام تر عملی یا بقول خود سائنٹفک اختیار کیا تھا، بظاہر مذہب سے یقیناً یا اثباتاً اسے کوئی تعلق ہی نہ تھا لیکن حقیقۃً اس کی ہر تعلیم کی زد آ کر مذہب ہی پر پڑتی تھی۔ خصوصاً دینی اخلاق پر۔ سولہ برس کے سن کی بساط ہی کیا۔ تاثر کے شباب کا زمانہ جوں جوں مطالعہ آگے بڑھا طبیعت اثر قبول کرتی گئی۔ یہاں تک کہ چند سو صفحہ کی کتاب جب ختم کی ہے تو اندر ہی اندر چپکے ہی چپکے قلب میں ایمان کی نورانیت کی جگہ الحاد کی ظلمانیت لے چکی تھی۔

بنیادیں ہل پڑیں۔ تائیدی اسباب قدم قدم پر ملتے گئے۔ ایک لائبریری میں ایک کتاب اور نظر پڑی، موضوع مذہب نہیں تاریخ اور ادب تھا۔ دنیا کے مشاہیر کے ادب پارے اس میں درج تھے اور اسی سلسلہ میں قرآن مجید کے اقتباسات بھی۔ اسی کتاب میں پورے صفحے پر تصویر نعوذ باللہ عرب مصنف قرآن کی یعنی ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درج تھی۔ اور یہ نہ پوچھئے کہ وہ کس درجہ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ جسم پر عبا، سر پر عمامہ لیکن کمر میں ایک طرف پیش قبض، دوسری طرف تلوار اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شانے پر ترکش اور کمان! تیوروں پر بل پڑے ہوئے اور چہرے سے خاکم بدہن تمام تر خشونت ٹپکتی ہوئی! تصویر کسی پیغمبر یا رحمت عالم پیمبر یا پیمبر کی تو خیر کیا ہوتی، کسی معمولی درجہ کے شریف اور رحمدل انسان کی بھی ہرگز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صاف ایک جلاد قسم کے ڈاکو کی معلوم ہوتی تھی۔ نیچے تصویر کا تاریخی حوالہ بھی درج تھا۔ تصویر کے نقلی اور فرضی ہونے کی طرف ذہن تو اس وقت جا ہی نہ سکتا تھا قدرۃً صاحب تصویر کی شخصیت سے متعلق انتہائی بد عقیدگی پیدا ہو کر رہی۔ انا للہ۔

جب بی۔ اے میں پہنچا تو فلسفہ اور نفسیات کی کتابوں کے پڑھنے کا ہو کا تھا۔ ایک نامور ڈاکٹر کی دو ضخیم کتابیں معقل فزیالوجی اور معقل پیتھولوجی کے نام سے مطالعہ میں بڑی عقیدت کے ساتھ آئیں ان میں بدبخت نے یہ کمال کیا تھا کہ مرض صرع (Epilepsy) کا بیان کرتے کرتے ایک دم سے (بیان) اس میں یہ لے آیا کہ انبیاء کی بعض مشہور ترین اور عظیم ترین ہستیاں بھی اس قسم کے دوسرے مرض میں مبتلا رہی

ہیں چنانچہ نزول وحی کے وقت کے آثار و علامات کا شمار آثار مرض میں کر ڈالا۔ اب فرمائیے کہ ایک سادہ دل مسلم نوجوان کے دل و دماغ پر پیہم حملے جب اسی قسم کے ہوں تو وہ بیچارہ اپنے ایمان کو کب تک سلامت رکھ سکتا تھا نتیجہ قدرۃً وہی نکلا جو نکلنا تھا۔ قلب میں الحاد اور ارتیاب پیوست ہو گیا اور دماغ اپنے کو مسلم کہلانے کے بجائے "نیشنلسٹ" اور "ایگناسٹک" کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔

مل، اسپنسر، ہکسلے وغیرہ کی تصانیف اس کڑوے کریلے کو اور نیم چڑھا بناتی گئیں۔ عام مولوی، ملّا اور مشائخ ایسے مرض کا علاج قطعاً نہیں کر سکتے، ان کے علاج مفید ہونے کے بجائے الٹے مضر ہی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ نشہ دو ایک دن نہیں کوئی آٹھ دس سال متواتر جما رہا۔ اللہ کا فضل اتنا رہا کہ اس ساری مدت میں تعلق عقیدت حضرت اکبر الہ آبادی سے بھی قائم رہا اور وہ حضرت کمال حکمت سے کھل کر نہیں لیکن چپکے ہی چپکے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں کے ذریعہ سے دین کی تبلیغ برابر کرتے گئے اور اپنے کلام بلاغت نظام سے مادیت اور فرنگیت سے مرعوبیت دماغ سے ہٹاتے گئے۔ دوسری رہنما ہستی اسی زمانہ میں مولانا محمد علیؒ جوہر ایڈیٹر "کامریڈ" کی ہوئی اس وقت تک وہ خود مولانا نہ تھے محض آکسن تھے لیکن ان کا جوش اسلامی اس وقت بھی بھلا تبلیغ کئے بغیر کب ماننے والا تھا۔ جب ملتے یا خط لکھتے اس نا مسلم کو مسلمان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ یہ دونوں ضابطہ سے نہ مولانا تھے نہ مشائخ لیکن سننے کی بات صرف یہ ہے کہ ایک بھاگے ہوئے غلام کو اس کے مالک کی طرف پھیر کر لانے میں حد درجہ معین ہوتے رہے۔

ہوتے ہوتے ۱۹۱۸ء آ گیا اور اپنی توجہ کی باگ پہلے بدھ مذہب اور پھر ہندو فلسفہ (خصوصاً تھیاسوفسٹ اسکول) کی طرف مڑ گئی۔ مسز بسنٹ، آربندو گھوش، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاراج تلک اور اینڈ منڈ ہومز، سال چھ مہینے کے مسلسل مطالعہ رُوحانیت نے مادیت والحاد کا طلسم توڑ کر رکھ دیا اور صاف نظر آنے لگا کہ ایک زبردست علم روح اور روحانیت کا بھی ہے۔ عین اسی زمانہ میں شبلی کی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اوّل شائع ہوئی جس نے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری نہ سہی تاہم مصلحانہ عظمت

و برتری کا پوری طرح قائل کر دیا۔ اس دور میں اتنا بھی بہت غنیمت تھا۔ اس کے معاً بعد خوش بختی سے رسائی مولانا روم کی بے مثل مثنوی تک ہو گئی۔ اس کے کانپوری ایڈیشن کے چھیوں ضخیم دفتروں کو اوّل سے آخر تک پڑھ ڈالا گو سمجھ میں بیشتر حصہ نہ آیا، پھر بھی اب کیا عرض کیا جائے کہ اس نے کیسی قلب ماہیت کر دی اور پڑھنے والے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور دل ابھی مثنوی کے مزے لے ہی رہا تھا کہ مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی تفسیر ترجمۃ القرآن ۱۹۲۰ء میں میری نظر کے سامنے آ گیا اور جو کچھ از سرِ نو مسلمان ہونے میں باقی رہ گئی تھی وہ پوری ہو گئی۔ انگریزی ترجمہ کا اثر ہی انگریزی خوانوں پر کچھ اور ہوتا ہے۔

اس ساری سمع خراشی سے مقصود صرف یہ عرض کرنا تھا کہ جس طرح ضلالت کے اسباب بے شمار ہیں اور الحاد کیسے کیسے مخفی راستوں سے آتا رہتا ہے اسی طرح ہدایت کے راستے بھی بے شمار ہیں اور روشنی دکھانا ضابطہ کے علماء اور مشائخ کے ساتھ مخصوص ہرگز نہیں۔ اپنے اس دور گمراہی میں میں علماء کے سائے سے بھاگا نہیں، ان سے ملتا رہا، ان کی کتابیں بھی پڑھتا رہا لیکن اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑا۔ اصلاحی اثر پڑا تو انھیں لوگوں کا جن کے نام ابھی عرض ہو چکے ہیں۔

کاش یہ ایک چھوٹی سی، ننھی سی آپ بیتی دوسروں کے لئے سبق کا کام دے!



ضمیمہ نمبر (۲)

سفر اور سفرِ آخرت[1]

ہندوستان سے پاکستان جانے اور لاہور و کراچی کا سفر اختیار کرنے کا موقع پہلی بار اس اپریل ۱۹۵۵ء میں پیش آیا۔ لکھنؤ سے امرتسر تک چین ہی چین رہا۔ اٹاری سرحد ہند کا آخری اسٹیشن ہے۔ ایک چھوٹا سا اسٹیشن یہاں ٹرین کے بڑے چھوٹے سارے مسافروں کو مع چھوٹے سے چھوٹے سامان کے اترنا پڑا اور گاڑی ایک دم سے خالی کرنا پڑی۔ جانچ ہر مسافر کے پاسپورٹ کی ہوئی اور جائزہ (Checking) ہر ایک کے سامان کا لیا گیا کہ کہیں کوئی ناجائز چیز تو ساتھ نہیں جا رہی ہے اور ایک لمبی مدت خاصے اضطراب میں گزری...... اللہ اکبر! منظر انسان کے سفر آخرت سے کتنا مشابہ تھا۔ سفر حیات کی آخری منزل میں بھی تو فکر کی چیز اور کام آنے والی چیز تو یہی ایمان کا پروانۂ راہداری ہوگا! جس نے اس کو سلامت رکھا وہ کس طرح بے کھٹکے عالم ناسوت کو عبور کر کے دار آخرت میں پہنچ جائے گا اور جس نے اپنے اعمال کو کفر و نفاق کی غل و غش سے پاک و صاف رکھا اسے یہ بوجھ کوئی بوجھ ہی نہ معلوم ہوگا اور وہ کس طرح ہلکا پھلکا رضوان الٰہی کی مملکت میں داخل ہو جائے گا۔

گاڑی تیزی سے بڑھتی اڑتی اور درمیان کے ایک آدھ اسٹیشن چھوڑتی چلی گئی، یہاں تک پاکستان کا جانچ والا (Checking) اسٹیشن جلو آ گیا اور یہ پتہ بھی نہ چلنے پایا کہ ٹھیک کس وقت مسافر ایک مملکت سے دوسری میں منتقل ہو آیا۔ اس ملک کے آئین و قوانین جداگانہ، احکام جداگانہ، دین و ملت جداگانہ لیکن مسافر کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ وہ آناً فاناً کس طرح ایک ملک سے دوسرے میں منتقل ہو آیا ہے!...... ناسوتی زندگی

[1] منقول از صدق جدید لکھنؤ مورخہ ۶ / مئی ۱۹۵۵ء

سے آخرتی زندگی میں انتقال کو جن لوگوں نے لازمی طور پر سخت تکلیف دہ سمجھ رکھا ہے وہ اس نظیر کو نظر میں رکھیں۔ اللہ کا فضل و کرم اگر شامل ہے اور انسان ایمان کے کیل کانٹے سے درست ہے تو یہ کسی طرح محسوس بھی نہ ہونے پائے گا کہ روح کی یہ ناسوتی منزل ختم کس وقت ہوئی اور روح اس عالم کیف و کم سے نکل کر عالم مجردات میں داخل کس گھڑی ہو گئی!



بمبئی

چار دن بمبئی میں

سفر اور پھر لمبے سفر کی عادت اب ایسی چھوٹ سی گئی ہے کہ جب کبھی ایسا اتفاق پیش آہی جاتا ہے تو سب سے بڑھ کر حیرت تو اپنے ہی کو ہوتی ہے۔

غیر کیا خود مجھے حیرت مرے اسفار پہ ہے

اخیر ہفتہ اپریل (۱۹۷۲ء) میں اس طرح کا اتفاق پیش آکر رہا۔

ادارۂ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے نام نامی سے اب مسلمان پڑھے لکھوں میں کون ناواقف ہوگا؟ مولانا شبلی نعمانی کے دماغ کی پیداوار، مولانا سید سلیمان ندوی کی ساری عمر کی علمی کاوشوں کی یادگار، مسلم ثقافت کے چمن کی بہار، ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے مسلّم و شاندار۔ ۱۹۱۵ء (بلکہ شاید ۱۹۱۴ء) میں بنیادی ممبروں کی جو کمیٹی بنی تھی اس میں زندہ باقی اب صرف یہی بدنام کنندہ نکونامے چندرہ گیا ہے اور پھر اس کے ارکان عاملہ کی جو ننھی منی مجلس ہے اس کی صدارت کی تہمت بھی اس بے علم کے سر سالہا سال سے چلی آرہی ہے۔ اس ادارہ کی مالی حالت برسوں سے جو زبوں و سقیم چلی آرہی ہے اس کی داستان خود مستقل دردناک ہے۔ ہندوستان میں ہر اردو ادارہ پر جو وقت پڑا ہے اور جو کچھ بیت رہی ہے اس کا حال سب پر ظاہر ہے۔ پھر پاکستان سے خریداری کا دروازہ سرے سے بند۔ جہاں دیدہ و خوش تدبیر مولوی مسعود علی ندوی منیجر کی پہلے تو معذوری اور پھر وفات، اور سرکاری سطح پر جو لیس پوت کرنے والے تھے مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود ان دونوں کا بھی رخصت ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسباب متعدد و مختلف کی بناء پر حالت اب یہ ہو گئی ہے کہ ماہانہ مشاہرے اور مطالبے بل کے ادا ہونے دشوار ہو گئے اور ریزروفنڈ تک جواب دے گیا۔

رائے بالآخر یہ ٹھہری کہ جلسۂ انتظامیہ اب کی بمبئی میں کیجئے اور اس عروس البلاد کے جو اہل خیر ہیں ان کی قدردانی اور فیض و کرم کا تماشا دیکھئے۔ مجلس انتظامیہ کے آخر

دو ممبر "بمبئی وال" ہی ہیں۔ ایک علامہ سلیمانؒ کے ہم وطن و عزیز شہاب الدین دیسنوی (میری زبان میں شہاب ثاقب) پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنیک بمبئی اور دوسرے علامہ شبلی کے وطن اور برادری کے عبدالعزیز انصاری اعظم گڑھی اور بمبئی کے ایک بڑے تاجر۔ شہاب صاحب کو سن گن ملی تو انھوں نے بمبئی کی مشہور انجمن اسلام کا تار بھی اس سے جوڑ دیا کہ "بہ یک کرشمہ دو کار" کی مثل صادق آجائے اور انصاری صاحب نے میزبانی کا دسترخوان بچھادیا۔ پبلک اجتماع ۲۸/۲۹ اپریل کے سہ پہر کے لئے طے پا گیا اور ۳۰ر کو قبل دوپہر۔ یہ شہاب صاحب آدمی بڑے کارگزار ہیں اور ہر طبقہ میں رسوخ اُدھر آرٹ نوازوں میں شامل ادھر ہم دقیانوسیوں سے واصل۔

باباشراب خورد و بزاہد نماز کرد

کو اپنا دستور العمل بنائے ہوئے میرے لئے مقالہ کا عنوان لکھ بھیجا "تفسیر قرآن کے جدید تقاضے" اور رفیق محترم علی میاں کے لئے سرخی ٹھہرادی "ہندوستانی سماج پر مسلمانوں کا اثر" پر کوئی تقریر، ناظم دارالمصنفین (شاہ معین الدین ندوی) اور نائب ناظم (سید صباح الدین عبدالرحمن دیسنوی) کے بھی مقالوں کے کچھ تاریخی عنوان طے پاگئے۔

لکھنؤ سے بمبئی کا سفر ۲۸، ۲۹ گھنٹہ کا وقت لیتا ہے اور دہلی سے جو پنجاب بمبئی میل چلتا ہے اس میں لکھنؤ سے چلنے والے جھانسی میل کی دو تین بوگیاں کاٹ کر لگا دی جاتی ہیں۔ دریاباد سے روانگی ۲۵/ اپریل کو تاگر پر تھی۔ ۲۶ر کی صبح کو لکھنؤ سے چلی ۲۷ر کی دوپہر کو بمبئی پہنچنا ہو گیا۔ بمبئی پہنچ گیا کہنے یا لکھنے میں چند سیکنڈ بھی نہیں صرف ہوئے لیکن دل سے پوچھئے کہ اس پر کیا کیا گزر کر رہی اور کتنی منزلیں اسے طے کرنا پڑ گئیں! بمبئی کے مناقب و فضائل آج سے کوئی ۶۵ سال قبل، مولانا شبلی کی زبانی سنا کرتا تھا اور ان کے ہر سال سفر بمبئی (سیکنڈ کلاس کی ایک برتھ مخصوص کرا کر) کو رشک و شوق سے دیکھتا اور للچاتا رہ جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں آج سے پورے ساٹھ سال قبل پہلی بار اپنا بمبئی آنا ہوا تھا۔ والد صاحب مرحوم حج کو ایک پورے قافلہ کے ساتھ جا رہے تھے

انھیں پہنچانے بمبئی گئی تھا، حاجی صابو صدیق کا مشہور مسافر خانہ حجاج اسی سال تعمیر ہو رہا تھا۔ اسی عالیشان اور آرام دہ عمارت کا کیا کہنا، اپنی عمر کا بیسواں سال تھا اور اسی سال بی اے کیا تھا، ایم اے کے لئے علی گڑھ جانے کی فکر میں تھا، حج و زیارت سے اس وقت کیا واسطہ تھا عقیدہ بھی اسلام سے کہیں بڑھ کر الحاد اور ریشنلزم (عقلیت) کا تھا۔ محض بمبئی دیکھنے کا شوق تھا جو والد مرحوم کے ہمراہ چلا آیا تھا۔ جہاز چھوٹنے میں ابھی کئی دن کی دیر تھی، انگریزی کتابوں کی دوکانیں گھوم پھر کر اپنا ارمان نکالتا رہا۔ ایک بار پھر کبھی مولانا محمد علی سے ملنے آیا تھا۔ پھر آخری سفر خود اپنے سفر حج کی آمد و رفت کے سلسلہ میں دوبار ہوا تھا۔ خلافت ہاؤس میں ٹھہرنا ہوا تھا مارچ اور مئی ۱۹۲۹ء میں۔ یہ نیا پھیرا گویا ۴۲، ۴۳ سال کے بعد ہوا۔ ان دو پشتوں کے اس وقفہ میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، آنکھ کان کی مادی دنیا بھی اور دل و دماغ کی معنوی دنیا بھی!

اور بمبئی پہنچنے میں تو ابھی دیر تھی۔ درمیان کے بڑے اور چھوٹے اسٹیشنوں پر کیا کیا گزری اور دل کن کن خیالات میں ڈوبا رہا۔ ممناً جب پہلی بار حیدر آباد جانا ہوا تھا ۱۹۱۷ء میں تو اسی راستہ سے گیا تھا (اس وقت تک یہی ایک راستہ تھا) اور ۱۹۱۸ء میں واپسی بھی اسی راستہ سے ہوئی تھی۔ نظام حیدر آباد کی عملداری اس سے کچھ ہی دور شروع ہو جاتی تھی اور انگریزی اور مغلئی حکومتوں کا امتزاج ایک عجیب بہار دکھاتا تھا۔ نظام کی حکومت یقیناً "اسلامی" نہ تھی پھر بھی ثقافت اسلامی اور تہذیب اسلامی کی بہت کچھ بو باس اپنے اندر رکھتی تھی اور چند ہی اسٹیشن کے بعد اورنگ آباد، بابائے اردو عبدالحق کے دم سے ایک عجیب کشش ہر اُردو والے کے لئے رکھتا تھا۔ اور بھوپال اسٹیشن کی جاذبیت تو کچھ پوچھئے ہی نہیں، ملّی و ذاتی دونوں قسم کی یادوں نے کیسا کیسا ہجوم کیا، بیگمات بھوپال اور آخری نواب اور صدیق حسن خاں قنوجی اور امین زبیری اور مسعود جنگ اور سر لیاقت علی اور شعیب قریشی اور سلیمان ندوی اور "مائی لارڈ" حیات (علیگ) کے اسلامی تقاضوں نے اس زمین کو کس کس طرح رشک آسمان بنا کر رکھا...... اور شاہ یعقوب مجددیؒ کے دم سے زندہ دلوں کا مرکز ابھی کل تک یہی شہر بنا ہوا تھا...... اور

تاج المساجد آج بھی اس کا نام دنیائے اسلام میں اونچا کیے ہوئے ہے۔ کانپور اور جھانسی دو جنکشن ذاتی حیثیت سے ایسے کہ ان خوشگوار یادوں کو یاد رکھنا مشکل ہے۔ شہر باندہ ان دونوں راستوں سے پہنچا جا سکتا ہے جہاں ایک گوشہ میں ایک قبر ۵۱، ۵۲ سال کی رفاقت کے بعد ایک مرجع شوق و مرکز آرزو بنی ہوئی ہے۔ ایک سراپا عفت، قلب غفلت میں اب بھی بیداری کی کچھ جھلک پیدا کر دیتی ہے۔

۲۷ر کی دوپہر کو بمبئی پہنچنا ہوا اور الحمد للہ کہ اسٹیشن پر میرے مخلصین کا مختصر سا مجمع تھا اور جلوس وغیرہ کے جھمیلے سے نجات مل گئی بات صرف پھولوں کے چند ہار تک محدود رہی۔ اتنے بڑے سفر کے بعد غسل تو واجبات میں ہوتا ہے۔ اصل مقالہ پر نظر ثانی کا وقت نہیں نکل سکا تھا۔ ۲۵/۲۶ر صفحہ کا صاف شدہ مسودہ تھا اور اپنی آنکھ کی روز افزوں کمزوری کے باعث اس کا خود سے سنانا بھی ممکن نہیں تھا، رفیق محترم علی میاں نے ایک ندوی عزیز کو پڑھنے کے لئے تیار کر دیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا وقت صرف کر کے اسے درست کیا اور پھر ان صاحب کو پڑھوا دیا۔ لوگوں سے ملنا جلنا بہر حال ہونا ہی تھا۔ لیکن الحمد للہ میزبان اور دوسرے مخلصوں نے اس "مردم بیزار" کے شیوۂ مردم بیزاری کا پورا لحاظ رکھا اور زیادہ مجمع کسی صورت میں نہ ہونے دیا۔ حیدر آباد سے مخلص قدیم حاجی بہاء الدین بے بہا چل کر اور رخصت لے کر آگئے تھے۔ ہر وقت کی خدمت اور دیکھ بھال انھیں کے ہاتھ میں رہی۔

حسن اتفاق سے پرانے جامعی سعید انصاری اعظم گڑھی سے اسٹیشن ہی پر ملاقات ہوئی اور چار دن تک برابر ساتھ رہا۔ ہماری مجلس انتظامیہ کے یہ بھی ممبر ہیں انھیں دیکھ کر بڑی خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں اور پھر اس وقت کے ایک دوسرے جامعی معین الدین حارث بھی مل گئے۔ سالہا سال تک مشہور نیشنلسٹ اخبار "اجمل" نکالتے رہے اور مہاراشٹر کونسل (ایوان اعلیٰ) کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔ ان دونوں صاحبوں کو اور ان کی اسلامیت اور تواضع و انکسار کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ قرون اولیٰ کے جامعی دور مجیبی کے حامیوں سے کس قدر مختلف ہوتے تھے اور صنم تراشی سے کتنے متنفر و بیزار اور کتنے

پختہ مسلمان...... مجلس کے رکن مولانا علی میاں ندوی، حافظ محمد عمران خاں ندوی بھوپالی اور مولانا محمد اویس ندوی نگرامی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوہ تھے، اور کئی کئی گھنٹہ ان سے یکجائی رہا کی۔ ان کے خلوص اور ہم صحبتی نے پردیس کو وطن بنادیا۔ اور ایک دن ہماری مجلس کے کرنل بشیر حسین زیدی (سابق ممبر پارلیمنٹ و سابق وائس چانسلر علیگڑھ) بھی شریک بزم رہے۔ ہمارے ادارے کے یہ بھی ایک سرگرم و زبردست ساعی و ہمدرد ہیں۔ اور اپنے ذاتی تواضع وانکساری میں کسی سے کم نہیں۔ قاضی محمد اطہر مبارکپوری اسلامیات کے ایک معلوم و معروف فاضل ہیں اور مدت سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ جتنا وقت ان کے ساتھ کٹا اچھا ہی کٹا۔ شاعر جلیل سکندر علی وجد اورنگ آبادی سے کوئی ۳۲، ۳۵ سال کے بعد ملنا ہوا۔ ان کی نوعمری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ سیشن ججی کے عہدہ تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے ہیں۔ لکھنوی شیعہ لیڈر سید ابو محمد ایڈیٹر "کاروانِ حیات" سے ملاقاتیں اچھی رہیں۔ ایک بڑے پرانے شناسا مولانا عبدالحمید نعمانی مالی گاؤں سے تکلیف اٹھا کر ملنے کے لئے آئے اور اپنے اخلاق کا نقش دل پر چھوڑ گئے۔ شہر میں جماعت اسلامی خاصا کام کر رہی ہے۔ اس کے روح رواں شمس پیرزادہ ایک معروف و مالوف و مانوس ہستی ہیں۔ اپنے دفتر میں مدعو کر گئے۔ بڑی بات یہ کہ جب ہم لوگ پہنچے تو اپنے وعدہ کے پابند رہے۔ گفتگو محض نجی حیثیت تک محدود رکھی۔ ملاقات کو تقریب نہیں بنایا اور سادگی کے ساتھ واپس کر دیا۔ یہ بات معمولی نہیں بڑی ہے اور اسی لئے اسے خاص طور پر لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ ہر ملاقات ہمارے یہاں ایک تقریب بلکہ ایک تماشا بن کر رہتی ہے اور یہ تماشا پسندی بھی قوم میں ایک مرض کی طرح پھیل گئی ہے۔ تمیز داری تہذیب و شائستگی اور صحیح قسم کی خاطر و مدارات میں دوسرے کو یہاں کی جماعت اسلامی سے سبق لینا چاہئے۔ مہاراشٹر کے وزیر صحت رفیق زکریا صاحب کے انگریزی مضمون بمبئی کے پرچوں میں سالہا سال سے نظر پڑ رہے تھے۔ ۲۸ر کی شام کو جلسہ میں پہلی بار مضمون نگار کی بھی زیارت ہوئی۔ ملاقات کی مدت کل دو ہی ایک منٹ کی رہی، لیکن دل کی کشش اتنی ہی

دیر میں ان کی جانب محسوس ہوئی۔ عجب نہیں کہ سوٹ میں ملبوس کوئی روح سعید ہی ہو۔

بمبئی کو باب الکعبہ کہا گیا ہے، حاجیوں کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ سال کے چھ مہینوں میں تو ضرور جاری رہتا ہے۔ تاجر عموماً اہل خیر و مہمان نواز ہیں نمازی بھی کثرت سے ہیں جیسا کہ مسجدوں کی سرسری سیاحت سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ محرم اور ربیع الاوّل میں اپنی خوش عقیدگی کا مظاہرہ بھی خوب کر لیتے ہیں۔ باہر سے واعظوں اور خطیبوں کو بلا کر انھیں خوب نذرانے دے دے کر اور مذہبی رنگ کے جلوس نکال نکال کر اور ان میں نعرے لگا لگا کر...... لیکن صحیح دینداری، خداترسی اور احساس عبدیت کا قحط جیسا سب کہیں ہے یہاں بھی ہے۔ بلکہ یہ دیکھ کر بڑی ہی عبرت ہوئی جہاں ہزارہا ہزار مکان عالیشان کئی کئی منزلے موجود ہیں انھیں کے عین پائیں میں ہزارہا بندگان خدا ایسے بھی ہیں جنھیں سونے کے لئے ایک گوشہ اور ایک چارپائی تک نصیب نہیں۔ عمر کی ساری راتیں سڑکوں ہی پر گزارتے رہتے ہیں اور بیچاروں کو مکان کے نام سے کوئی تنگ و تاریک کوٹھڑی تک نصیب نہیں...... خیر یہ تو بمبئی غریب کا قصور نہیں، امارت کے پہلو بہ پہلو شدید افلاس تو شاید ترقی و تمدن کا خاصہ ہے۔

آج کا دن بھی حسب معمول مخلصوں سے ملنے ملانے میں گزرا، حاجی عبدالستار کا خلوص شاید سب سے زیادہ رنگ لایا۔ کیوں نہ ہو آخر غریب صاحب مرحوم کے عزیز قریب ہی ہیں۔ شہر بمبئی میرے مخلصوں کی سرزمین ہے لیکن غریب صاحب مرحوم اس بزم کے سید الطائفہ تھے۔ بمبئی پہنچ کر کسی کے نہ ملنے کی حسرت سب سے زیادہ دل میں رہی تو انھیں مغفور کی تھی۔ تقسیم ملک سے پہلے یعنی آج سے کوئی تیس سال قبل اس بندۂ خدا نے میرے پاس کئی ہزار کی رقم چپکے سے بھیج دی صرف یہ لکھ کر آپ جسے چاہیں اس رقم میں سے دیں اور اسے جس صرف میں چاہیں لائیں اور پلٹ کر پھر کسی حساب کتاب کا نام تک نہ لیا، اس درجہ کے مخلص قسمت سے ہاتھ آتے ہیں ان کی دوکان نمبر ۲۳ کٹلری بازار کی طرف سے جب گزرنا ہوا تو معلوم ہوا کہ کسی نے سینہ

میں برچھی چبھودی۔ حاجی عبدالستار آخر انھیں کے تو عزیز قریب ہیں اور انھیں سے ملتے جلتے ایک دوسرے صاحب نکلے۔ حاجی اسماعیل ہاشم اور ان کا شمار بھی مرحوم غریب کے رفیقوں میں تھا، ان کی خوبو کیسے نہ رکھتے۔ ان کی اخلاص مندی کے تقاضوں کو دیکھتا تھا تو دل شرمندہ ہو ہو کر رہتا تھا کہ خدائے ستار کیسا پردہ ڈالے ہوئے ہے اور صحرا اور بیاباں کو خلقت کی نظر میں کیسا گل و گلزار دکھائے ہوئے ہے۔

می نماید نور ونار و نار نور
ورنہ دنیا کے بدے دار الغرور (رومی)

دعوتیں دن کو بھی رہیں اور رات میں بھی اور کیسے کیسے پر تکلف رئیسانہ کھانے، کھانے میں آئے۔ لیکن الحمد للہ کہ ایک معاملہ میں میزبانوں نے اس بدذوق مہمان کی بڑی رعایت ملحوظ رکھی یعنی دستر خوان کو بہت سے کھانوں سے باردار نہیں کر دیا کھانے لذیذ جتنے بھی ہوں ان میں مضائقہ نہیں لیکن یہ کیا کہ ایک ہی وقت میں ان کی پوری دکان لگادی! دو ایک بالکل کافی ہو سکتے ہیں، زیادہ ڈھیر لگا دینے سے حرص و ہوس کو بھی تسکین نہیں ہو پاتی خواہ مخواہ طبیعت کو انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ جو کھانے بھی تھے سیر ہو کر کھائے گئے اور دل سے شکر گزاری کے جذبات بھی اسی مناسبت سے پیدا ہوتے رہے۔

ایک اور صاحب صوفی عبدالرحمٰن سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ سیٹھ عمر بھائی چاند بھائی کے صاحبزادہ ہیں اور سیٹھ صاحب کی وفات ابھی چند ہی ہفتے قبل ہوئی ہے۔ سیٹھ صاحب خلافت کمیٹی کے پرانے خزانچی تھے ان کا نام آتے ہی کتنی خوشگوار یادیں مارچ ۱۹۲۹ء کے حج بیت اللہ کی، جہاز کی، خلافت ہاؤس کی سب نظر کے سامنے پھر گئیں۔ رہے نام اللہ کا۔ ایک صاحب محمد حسین توفیق نامے کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے، خوب یاد پڑ گئے۔ مسافر خانہ حاجی صابو صدیق سیٹھ اور انجمن خدام النبی کے خاص کارکن۔ "مسافر خانہ" میرے لئے مقامات مقدسہ سے کم محترم نہیں، دیکھ کر دل پوری طرح بھر آیا جس جس حصہ سے میرے والدین گزرے تھے، جی میں آتا رہا کہ ان کو آنکھوں سے

لگائیے اور ہو سکے تو پلکوں سے جھاڑو دے دے کر خوب دل کھول کر رو دیجیے۔ اس ناشدنی نے اس وقت نہ ان کی کوئی خدمت کی نہ قدر۔ اب کفارہ تلافی کی صورت ہی کیا ہو۔

ایک صاحب اشفاق حسین نامی (مالک ایکسپریس بلاک) کے اشفاق نامے پہلے مل چکے تھے۔ اب جو خود ملے تو مجسم "اشفاق" نکلے، ان کے بھائی صاحب اپنی جسمانی معذوری کے لحاظ سے ایک تصویر عبرت ہیں چلنا کیا معنی کھڑے ہونے سے معذور، مستقل کرسی نشین...... کسے خبر کہ ان تکوینی تکلیفوں کا معاوضہ کل کیا کیا مل کر رہے گا، لکھنؤ کے ڈاکٹر آصف قدوائی بیچارے جسمانی معذوری میں ان سے کہیں بڑھے ہوئے یاد پڑ گئے۔ خطیب صاحب جامع مسجد بڑے باخبر UP TO DATE نکلے مجھے انگریزی زبان میں شائع ہونے والی ایک خاص خبر کا تراشہ انھیں حضرت نے دیا جس سے میں بے خبر ہی رہ جاتا اور ان کے نائب مولوی شوکت علی صاحب بھی توجہ و التفات سے بڑھ کر ملے۔ مولوی امام الدین تو اپنے ہی جوار اودھ کے ہیں لیکن اب ان کا شمار بمبئی والوں میں کرنا پڑ رہا ہے ملے اور کام کے آدمی ثابت ہوئے۔ مولوی مختار احمد ندوی، حکیم نسیم (میوائمہ والے) اور مالیگاؤں کے ضیاہانی اور کئی صاحب ایسے ملے جو کہنا چاہئے کہ چھپے رستم سے کم نہ تھے۔ سورت کے ایک سیٹھ احمد دادا بھائی داؤد جی میرے قدیم محسنوں، مخلصوں میں تھے۔ اب سالہا سال ہوئے ہندوستان کی سکونت ترک کر کے ملائیشیا جا بسے تھے اور ان کے بھائی اور بھتیجے بھی ملے۔ اور قدیم رشتہ محبت کو تازہ کیا، خلافت ہاؤس کے بڑے پرانے کارکن مرزا عبدالستار بیگ ملے جو اب خود قابل زیارت ہیں انھیں کے مخلصانہ اصرار پر سہ پہر کے وقت خلافت ہاؤس جانا ہوا۔ وہاں اب کیا ہے سوا بیگم محمد علیؒ کی قبر کے۔ قدامت کے لحاظ سے تو "صدق" کے سب سے بڑے قدرداں ملا عبدالغفور پنچواسی ملے۔ اب اپنے لڑکے کے پاس کناڈا ہجرت کر کے جانے کو تھے پوری طرح سوٹ پوش لیکن باتیں سب دینداروں ہی کی طرح کرتے رہے۔

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

آج دن میرے مقالہ کا تھا۔ عنوان یہیں سے لکھ کر گیا تھا۔ "تفسیر قرآن کے جدید تقاضے" مدت لکھنے کے لئے کم ملی تھی (لوگ یہ لحاظ نہیں کرتے کہ مسودہ کی صفائی بھی کئی دن لیتی ہے اور مسودہ صاف کرنا ہر ایک کا کام بھی نہیں) پورا ہونے پر صاف شدہ مسودہ ساڑھے ۲۶ صفحوں کا ہو گیا تھا۔ ایک بڑا مسئلہ اب یہ پیدا ہو گیا تھا کہ اسے پڑھ کر کون سناتا۔ صرف چند سال پہلے میں خود ہی سناتا تھا اور خاص کر ادبی یا شعری موضوع پر تو میرے سوا اور کوئی سنا سکتا بھی نہ تھا۔ اب یہ صورت ممکن نہ تھی۔ مقالہ کتنا ہی صاف اور خوشخط لکھا ہوا ہو ممکن نہیں کہ جب تک اس کو آنکھ سے بالکل ہی قریب نہ لے آؤں اسے پڑھ سکوں۔ اس لئے کسی دوسرے سے پڑھوانا ناگزیر ہو گیا۔ مولانا علی میاں سلمہٗ نے ایک ندوی غلام جیلانی صاحب کو اس پر آمادہ کر لیا اور انھوں نے ایک بار میرے سامنے اسے پڑھ کر پھر حاضرین کو سنایا...... وقت سے ذرا قبل ہم لوگ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے احاطہ میں پہنچ گئے اور فیضی صاحب سے مل لئے۔ میری ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ بڑی تہذیب و شائستگی سے ملے اور اردو خوب شستہ بولتے رہے (خیال تھا کہ جس طرح لکھنے میں انھیں اردو کی مشق نہیں شاید بولنے میں بھی نہ ہو) ذرا دیر بعد ہم لوگ بالاخانہ پر انسٹیٹیوٹ کے لق و دق ہال میں پہنچے۔ آج صدارت کرنل بشیر حسین زیدی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کر رہے تھے اور انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں خاصا وقت لیا۔

مقالہ ان شاءاللہ ان صفحات میں نقل ہو گا، خلاصہ یہ تھا کہ جدید مفسر کو تاریخ سے، جغرافیہ سے اثریات (آرکیالوجی) سے، مذاہب غیر سے اور دنیا کے دیگر علوم و فنون سے واقف ہونا لازمی ہے اور آخر میں سائنس کی موٹی موٹی تعلیمات سے۔ اس لئے کہ قرآن مجید صرف عقائد و احکام کی ہدایت روحانی و اخلاق کی کتاب نہیں۔ گو اصلاً وہ یہی ہے اس میں غیر مذہبوں کے عقیدوں (خصوصاً اہل کتاب کے) کا کہیں صراحۃً ذکر ہے اور کہیں ان کی طرف اشارہ اور تلمیحیں بھی ہیں، اور سائنسی واقعات کا بھی ناگزیر حد تک ذکر ہے مفسر جب تک ان سب پہلوؤں پر نظر نہ رکھے گا دوسروں کو کیا سمجھائے

گا اور خود قرآن سمجھنے کا حق درجہ اوسط میں بھی ادا نہ کر پائے گا...... نماز مغرب کا وقت شروع ہونے کو تھا جب جا کر مقالہ ختم ہوا۔ صدر کی زبان سے بڑے ہی ہمت افزا الفاظ نکلے، اور اس سے پہلے خود فیضی صاحب اٹھ کر آئے اور میرے کان میں کہا کہ "آپ نے کمال کر دیا میں تو ہائی بلڈ پریشر کا بیمار تھا، ڈاکٹروں نے کہہ رکھا تھا کہ کوٹھے پر نہ چڑھنا میں بدپرہیزی کر کے کوٹھے پر آیا اور آپ کا مقالہ سنتے سنتے اچھا ہو گیا، میرا بڑھا ہوا بلڈ پریشر سب جاتا رہا"۔ دل نے کہا کہ الحمدللہ ثم الحمدللہ فیضی صاحب ذوق تجدد کی بنا پر دینداروں میں کچھ اچھی نظر سے دیکھے نہیں جاتے۔ جب ان کے دل کو اللہ نے کھول دیا تو ان شاءاللہ بہتوں کے دل کھول کر رہے گا اور یہ سرٹیفکیٹ آج کام آئے نہ آئے کل ان شاءاللہ ضرور کام آ کر رہے گا...... اللہ میں قدرت ہے کہ جس جاہل سے چاہے کام عالم کا لے لے اور اپنے کلام کی تائید اور نصرت کے لئے جس زبان کو بھی چاہے گویا اور متکلم بنا دے!

ایک میرے دشمن بصورت دوست غازی حامد الانصاری ملے۔ خلافت ہاؤس اور دوسری جگہوں میں بھی اپنے سے خدمت ہی کون سی بن پڑتی ہے لیکن خیر تھوڑی بہت جو کچھ کبھی اتفاق سے ملتی بھی ہے تو اجر کے سب سے بڑے لٹیرے یہی حضرت نکلتے ہیں، وہ داد وہ مداحی وہ قصیدہ گوئی قصیدہ خوانی کہ گویا میں کوئی امیر باتوقیر ہوں یا کوئی درباری شاعر تو جو کچھ اجر ملا بھی وہ سب یہی حضرت چھین چھان کر لے گئے اور مجھے سر بزم کھکھ اور شرمندہ چھوڑ گئے! ایسے کو رہزن اور "بٹ مار" اگر نہ کہئے تو اور کیا کہئے!

بمبئی میں میری اصل دلچسپی کی چیزیں یہاں کے کتب خانے تھے پبلک لائبریریاں بھی مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری یا پھر انگریزی اور عربی کے بڑے بڑے کتب فروش، اس لحاظ سے یہ سفر تمام تر ناکام ہی رہا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے لئے نہ کوئی رہبر ملا اور نہ وقت ہی نکل سکا، طبیعت کے عام یاس و انقباض کو بھی اس میں دخل

ہے اور کتب فروشوں تک بھی رسائی نہ ہو پائی۔ بڑا اشتیاق ایک زمانے میں شرف الدین الکتبی مرحوم کی دوکان کا تھا۔ دوکان جو شاید موجود بھی نہیں الکتبی مرحوم بھی اب زندہ نہیں اور عبدالصمد نے بمبئی سے باہر بھمیڑی میں کوئی پریس بڑے پیانہ پر کھولا ہے۔ لیڈن (ہالینڈ) تک کے مطبوعات کا انتظام یہی کرتے ہیں اور تیسرے لڑکے حاجی خلیل ندوی جامعی سننے میں آیا کہ ہندوستان سے باہر حجاز میں ہیں۔ اور انگریزی کے جو بڑے نامی گرامی کتب فروش ایک زمانہ میں تھے تھیکر وغیرہ کے آج بس نام ہی نام رہ گئے۔ غرض کتابوں کی طرف سے تو یہ سفر سراسر گھاٹے ہی میں رہا...... انگریزی کی ایک ریفرنس کی کتاب EVEREY MAN ENCYCLOPEDIA جو چوڑی سائز کی ۱۲ جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اس کا نیا ایڈیشن بہت بڑے سائز پر WORLD KNOWLEDGE کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اس کی کچھ جلدیں البتہ لے لیں۔

اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں جلسہ کا آج تیسرا دن تھا اور انجمن اسلام کی طرف سے اس میں مولانا علی میاں ندوی کی تقریر کا انتظام تھا، اور اس کی صدارت اس "گونگے" صدر کے حصہ میں آئی۔ مجمع یونہی اچھا خاصا ہو جاتا تھا۔ آج تو مقرر کا نام اور زیادہ ہی لوگوں کو کھینچ لایا تھا۔ وقت بجائے سہ پہر کے آج دس بجے دن تھا۔ عنوان کچھ اس قسم کا تھا کہ مسلمانوں کا اثر ہندوستان کے سماج پر۔ تقریر کوئی سوا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رہی۔ تقریر پر مغز اسلامیت سے لبریز تو ہوتی ہی، فن تقریر و خطابت کے لحاظ سے بھی اب اچھی خاصی ہونے لگی اور سامعین کی توجہ و کشش آخر تک قائم رہی...... کل کے ذکر میں شاید یہ رہ گیا کہ بمبئی کی اسلام پسند خاتونوں نے اپنا ایک جلسہ عظیم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بمبئی میں آبادی تنہا ترقی پسندوں اور تجدد نوازوں کی نہیں بلکہ اسلام پسند خاتونوں کی بھی اچھی خاصی ہے۔ ہم لوگوں میں سے مولانا عمران خاں ندوی بھوپالی وہاں جانے کا وقت نکال سکے اور وہاں انھوں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا، اور موجودہ

خاتونوں کے چہرے کی بے حجابی پر انھیں ٹوکا اور جلسہ نے اسلامی نسوانی آبادی کی نمائندگی کر کے وقت کے چلے ہوئے فتنہ مسلم پرسنل لاء کی ترمیم و تبدیلی کی مدلل و مکمل مخالفت کا اظہار کر دیا...... خلافت ہاؤس جا کر دل پر بڑا ہی حسرت و یاس کا اثر رہا۔ تحریک خلافت کا ایک ویران گورستان اقبال کے ایک مشہور شعر کے دونوں اڈھے صحیح و حسب حال تو پریدہ رنگ و رمیدہ بو بھی اور تو "حدیث ماتم دلبری" بھی۔ قبر دیکھنے میں صرف ایک بیگم محمد علیؒ کی ہے لیکن دل کی آنکھوں سے دیکھنے والوں نے تو سارے ہی شیرانِ خلافت کے، عام اس کے کہ وہ نامور ہیں یا گمنام مرقعے اس احاطہ میں دیکھ لئے محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام، ظفر علی خاں، شعیب قریشی، ڈاکٹر سید محمود، شفیع داؤدی اور مولانا عرفان اور بھولے بسرے مدیران روزنامہ "خلافت" بدرالحسن جلالی، قمر احمد، رئیس احمد جعفری ندوی۔ میں اگر کچھ کہنا بھی چاہتا تو کیا کہہ سکتا تھا۔ غازی حامد انصاری کے اصرار پر مولانا علی میاں نے میری طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ اور ایک جامع و مختصر تقریر کر دی، مسلمان تو تقریر کا بھوکا رہتا ہے۔ نوحۂ غم ہو یا نغمۂ مسرت بہر حال دہن و حلقوم ضرور حرکت میں آ جائیں۔

وجد صاحب کا نام اب تک خدا معلوم آیا نہیں ذہین قسم کے شاعر ہمیشہ سے تھے اور اب تو کہنہ مشق ہو گئے ہیں۔ حیدر آباد سول سروس میں داخل ہو کر کام سیکھنے کے لئے اودھ کے ضلع سیتاپور میں تعینات ہوئے تھے۔ رات کی دعوت میں ایک قدر داں کی فرمائش پر کلام سناتے رہے اس جلسہ میں لکھنؤ نژاد نواب سید محمد زیدی سے لطف مکالمت رہا۔ کاروانِ حیات (بمبئی) کے سرپرست ہیں اور جتنا اپنے فرقہ (شیعہ) کو سناتے ہیں اس سے زیادہ سنتے بھی رہتے ہیں...... اسی رات کی دعوت میں شہاب ثاقب صاحب نے اپنی تقریر میں اعلان کیا دارالمصنفین دوامی ممبروں کی تعداد ۳۵ کی ہو گئی۔ ان میں فلاں مشہور مسلمان فلمسٹار بھی ہیں۔ دارالمصنفین یا شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) محض علمی و ادبی ادارہ نہیں بلکہ نیم دینی بھی ہے اس لئے یہ خبر شاید دین پسند حلقوں کو گراں گزرے لیکن ایک فقہی عذر کارکنان ادارہ کے پاس بھی موجود ہے کہ دوامی

ممبری کوئی اعزازی لقب یا منصب نہیں بلکہ ایک ہزار دینے پر ہر لائف ممبر کو مطبوعات ادارہ کچھ مفت اور کچھ نصف قیمت پر ملنے لگتے ہیں اور بھی کچھ اسی طرح کے کاروباری حق ادارے پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خریداروں کے عقائد و اعمال سے دوکاندار کو کوئی بحث نہیں ہوتی۔ کاش دین کے حقائق و معارف اس ادارہ کی راہ سے "آرٹ" والوں تک پہنچیں!..... خود مولانا شبلی کی زندگی بھی تو کچھ اسی روش کی رہی۔ عمر کے اخیر حصوں میں سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تو اچھے خاصے دیندار ہو ہی گئے تھے لیکن برسوں پہلے جب شاعرانہ وادیبانہ طبیعت شرعی قیدوں اور پابندیوں کی چنداں عادی نہ تھی جب بھی ان کا "الجزیہ" اور "الفاروق" اور "حقوق الذمیین" تو ان کے قلم کے کتنے متوالوں کا ایمان سنبھالے ہوئے اور انھیں اسلام سے چپکائے ہوئے تھا۔

ایک نہیں تین تین ندویوں کا ساتھ سفر میں وطن کا لطف پیدا کر رہا تھا، مولانا علی میاں، مولوی محمد عمران خاں بھوپالی اور مولانا محمد اویس نگرامی، اور مولانا علی میاں کے میزبان بھی خوب شخص تھے۔ محمد بھائی مالک آنند ہرا ٹرانسپورٹ اور ان کا مکان واقعی محل ہی تھا، نام تھا SOHAG PALACE نام کے اردو ترجمہ کی اگر اجازت ہو تو حاضر ہے "عروس محل"۔

اپنے زمانہ جاہلیت کی یاد آجانا بالکل قدرتی تھی۔ مئی ۱۹۱۵ء میں جب آزاد خیالوں کی ٹولی کے ساتھ بمبئی میں ایک ہفتہ ہوٹلوں میں رہنا ہوا تھا تو شیکسپیئر اور دوسرے مغربی ڈرامہ نویسوں کے عشق میں کیسی تلاش تھیٹروں اور پلے ہاؤسوں کی رہتی تھی اور وقت عزیز کا کتنا بڑا حصہ انھیں خرافات میں گزرتا تھا اور عین اسی کو اقتضاء علم و دانش سمجھا جاتا تھا۔ نہ مسجدوں سے کوئی واسطہ نہ نماز و اذان سے کوئی دلچسپی، اللہ نے کیسی کیسی گمراہیوں اور کیسی کیسی کج رویوں سے نجات بخشی۔ ایک دن ابھی ایسا ہوا کہ بمبئی کے ایک انتہائی فیشن ایبل علاقہ مالابار ہل سے گزرتے ہوئے جگمگاتی ہوئی کوٹھوں کے

درمیان ایک ویرانہ پر گزر ہوا۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا ایسا نظر پڑا جس پر کبھی کوئی عمارت رہی ہوگی۔ رہبر نے بتایا کہ یہ جنجیرہ ہاؤس تھا یعنی وہ محل جس میں بیگم صاحبہ جنجیرہ مع اپنی دونوں بہنوں زہرا فیضی اور عطیہ فیضی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اب کیا تھا کہ شبلی کے اس پرستار کے سامنے نفاست مجسم عطیہ فیضی اور ان کی ساری لطافتوں، نفاستوں اور نزاکتوں کا کیا نقشہ پھر گیا۔ مکان کیسا پُر رونق، دلکش اور سجا سجایا ہوگا اور اپنے اس انجام سے بالکل بے خبر۔ ابھی تصور کو اس تذکر و تفکر سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسرا اپلاٹ بہت بڑا نظر کے سامنے آگیا، سر تا سر کھنڈر، ملبہ پر ملبہ اور رہبر نے جو بتایا اسے سننے کے لئے دل کسی طرح تیار نہ تھا ہاتف غیب کے بجائے رہبر کی زبان سے نکلا "نظام حیدر آباد کا محل تھا"۔ یقین آئے یا نہ آئے بہر حال یقین کرنا ہی تھا، نظام عالی مقام جو رئیسوں کے رئیس اور امیر الامراء تھے محض ہز ہائی نس (اعلیٰ حضرت) نہیں ہز اگزالٹیڈ ہائی نس (اعلیٰ ترین حضرت) تھے جن کا شمار ہندوستان اور ایشیا ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے متمول ترین انسانوں میں تھا! پھر سو برس بھی تو نہیں ہوئے۔ سقوط مملکت ۱۹۴۸ء میں ہوا پورے ۲۴ برس کی مدت ہوئی۔ انقلاب حال اور اس درجہ تیزی کے ساتھ۔ عبرت کے ذخیرہ میں اپنی مثال آپ ہے۔

بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ ۔۔۔ اے حریصان مال و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقش حامد و محمود ۔۔۔ رہ گیا لا الہ الا اللہ

ٹکٹ پہلے سے لے رکھنا اور جگہ پہلے سے مخصوص کرا رکھنا لمبے سفر کے لئے ناگزیر ہو گیا ہے۔ اتنی جلد انتظام کہاں ممکن تھا، لیکن اللہ کا فضل ہوا کہ روانگی کے دن لکھنؤ کے لئے ایک اسپیشل بمبئی سے چھوڑا گیا جس میں جگہ مل گئی اور قبل دوپہر روانہ ہو کر لکھنؤ بحمد اللہ ۲ر کی سہ پہر کو پہنچ گیا۔ ایک بار پھر سارے اہل محبت کا شکریہ خاص کر میزبان اور ان کے خاندان والوں کا۔

(صدق جدید ۱۹ر مئی ۱۹۷۲ء)

''بہار کی بہار''

فاضل گرامی مولانا مناظر احسن گیلانی کے وطن کو دیکھنے اور وہیں جا کر ان سے ملنے کی تمنا سالہاسال سے تھی۔ نوبت خدا خدا کر کے اب کی ۴ر جولائی (۱۹۵۲ء) کو آئی اور ساڑھے تین دن کا وقت کسی طرح اس آمد و رفت کے لئے نکل سکا۔ گیلانی ایک چھوٹا سا موضع ضلع پٹنہ میں ہے۔ شہر سے کوئی ۶۰ میل دور ضلع مونگیر کی سرحد پر ریلوے لائن سے بہت دور۔ رفیق سفر مولانا عبدالباری ندوی (صاحب جامع المجددین تھے) گویا

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

نیز عزیزی محمد ہاشم قدوائی ایم اے (لیکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) سلمہ'...... اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَیْھِمُ اثْنَیْنِ ...... فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ۔

مختصر سے قافلہ کی پہلی منزل خاص پٹنہ تھی۔ مولوی سید ریاست علی ندوی (پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ) سے عزیزانہ تعلقات آج سے نہیں ان کے لڑکپن سے قائم ہیں۔ انھوں نے مہمان نوازی میں وہ تکلف برتا جو صریح اسراف کی حد میں آجاتا ہے۔ ان کی معیت میں تین گھنٹہ کے اندر اردو لائبریری، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، مدرسہ شمس الہدیٰ لائبریری۔ ان سب کتب خانوں کی سرسری سیر خوب رہی۔ اردو لائبریری میں افسوس ہے کہ ''ترقی پسندی'' کے عناصر نمایاں نظر آئے۔ خدا بخش لائبریری کے نوادر کا کیا کہنا۔ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کے لائبریرین صاحب تو خود ایک زندہ لائبریری نکلے...... میزبانِ ثانی حکیم عبدالاحد صاحب پرنسپل طبیہ کالج تھے۔ انھوں نے بھی جس اخلاص و التفات کامل سے میزبانی کی، اس نے اوّل، دوم، کی تفریق باقی ہی نہ رہنے دی۔

گھنٹہ پون گھنٹہ کا وقت بعض مریضوں کی عیادت کے سلسلہ میں ہسپتال میں

گزرا، ایک ڈاکٹر صاحب سے تعارف ہوا جن کی اسلامیت و دینداری کی مدح بہت زائد سننے میں آئی۔ اتفاق سے ایک وزیر شاہ محمد عزیر منعمی بھی ہسپتال میں بطور مریض داخل تھے۔ سرسری ملاقات میں وہ پیکر اخلاق اور اچھے خاصے مرد مسلمان نکلے۔ لق و دق ہسپتال کی خوش منظری کا کیا کہنا۔ نیچے دریائے گنگا برسات کے موسم میں خوب چڑھا ہوا، اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجزن، حد نظر تک وہی نظارہ، ہسپتال کی چھت پر سے دیکھئے تو دریا پر سمندر کا گمان گزرنے لگے اور پٹنہ بمبئی نظر آنے لگے!...... کسی ''طبیب'' کی خوش جمالی سے متاثر ہو کر سنا ہے کبھی کسی شاعر نے کہا تھا

خوش طبیب ست بیا تا ہمہ بیمار شوند

اس ہسپتال کی خوش سوادی سے متاثر ہو کر عجب نہیں جو بہت سے تندرستوں کے دل یہ تمنا پیدا کرنے لگیں کاش بیمار ہی ہو کر ہمیں اس چھت سے یہ نظارہ کرنے کو ملے۔

گیلانی خاص کا کیا کہنا، سکون خاطر کی جنت، باغ، مکان، مسجد سب ہی مثالی نظارے ہیں۔ اور مکین کی جاذبیت نورٌ علی نور، اس کی قوت اسی سے ظاہر ہے کہ وہی تو اتنے طویل سفر کی محرک ہوئی تھی۔ کھلانے پلانے مہمانی کے ہر جزو میں سلیقہ و اعتدال ملحوظ

لیکن گیلانی تک رسائی آسان نہیں وہ بھی اس برسات کے موسم میں۔ لاریاں عموماً کھچا کھچ بھری ہوئی اور میلوں تک چند فٹ چوڑی سڑک کے اِدھر اُدھر دونوں طرف برساتی پانی، گویا مسلسل جھیل، لاری والے سے ذرا بھی لغزش ہو تو پوری لاری کھڈ کے اندر تشریف لے جائے۔ واپسی کا سفر انھیں لاریوں کی بدولت کچھ خوشگوار نہ گزرا...... بہار میں خزاں کے کچھ جھونکے! اور راستہ میں گیلانی سے قریب دور سے مولانا سید سلیمان ندوی کے وطن موضع دیسنہ کا نظارہ بھی کچھ کم دلخراش و دردانگیز نہ تھا۔

واپسی میں اہل پٹنہ نے پھر اپنی روایتی مہمان نوازی کا پورا ثبوت دیا اور ایک صاحب تو عجیب و غریب ہی نکلے، جواں عمر سے آدمی انوار احمد نام...... پٹنہ ہائیکورٹ کے نامور و ممتاز ایڈوکیٹ حضرت تھانویؒ کے متوسل، پہلے سے نہ کوئی تعارف نہ تعلق، قدم قدم پر فرشتہ رحمت نکلے۔ ہر وقت اپنا نفیس موٹر لئے موجود، گھنٹوں اپنا

وقت عزیز نذر کیے ہوئے، سادگی کا یہ عالم کہ صرف کرتہ پاجامے میں ملبوس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بے تکلف اسی حالت میں میزبان کا سامان خود اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے!...... کھانے کو دستر خوان اپنی کوٹھی میں بچھایا تو وہ سادگی و تکلف کے امتزاج کا ایک قابل تقلید نمونہ!

شہر سے متصل قدیم قصبہ "پھلواری شریف" ہے مشہور زیارت گاہ بھی۔ مستقل ارادہ وہاں بھی حاضری کا تھا۔ مرحومین کے مزار پر فاتحہ پڑھنے اور موجودہ عنایت فرماؤں سے لطف نیاز حاصل کر لینا۔ جریدہ نقیب کے ایڈیٹر اور امارت شرعیہ کے کارکن شاہ عثمان غنی صاحب کو اطلاع بھی کر دی تھی۔ لاری کے گڑبڑ نے نظام اوقات مختل کر دیا اور طبعی کاہلی کو ایک بہانہ وعدہ خلافی کا دے دیا۔ تار سے معذرت کر دی اس پر بھی ادھر سے ٹیلیفون پر حکم حاضری کا ہوتا رہا۔ تعمیل کی کوئی صورت ممکن نہ ہوئی، دل بہت ہی محجوب رہا۔ خصوصاً قدیم کرم فرماؤں قاضی احمد حسین صاحب شاہ احمد حبیب ندوی وغیرہما سے اور شاہ غلام حسنین صاحب (فرزند مولانا شاہ سلیمان علیہ الرحمۃ) سے تو ذاتی ہی نہیں خاندانی تعلقات برابر چلے آرہے ہیں...... دل میں اس وقت کٹ کر رہ گیا جب میری کوتاہیوں کا خیال کیے بغیر خاصی رات گئے داناپور جنکشن پر سجادہ صاحب خانقاہ مجیبیہ کی طرف سے نیابۃً اور اپنی طرف سے اصالۃً قاضی عون احمد صاحب مع اپنے چھوٹے بھائی کے ایک خوان نعمت لئے ہوئے آموجود ہوئے! اللہ اللہ قدیم شرافت اور وضعداری کے ایسے نمونے اب خال ہی خال کہیں نظر آتے ہیں۔ پٹنہ ہی میں ایک صدق نواز عبدالرحمٰن انصاری نامے جھاجھا سے طویل سفر اختیار کر کے محض صدق نویس سے ملنے کو آئے اور اپنے اخلاص کا نقش دل پر چھوڑ گئے۔

سفر کا آخری جزو بڑا تجربہ آموز ثابت ہوا، اسی درجہ میں اتفاق سے بریلی کے مشہور امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں مرحوم کے جانشین اور پوتے جناب ابراہیم رضا خاں صاحب اور ایک اور عالم صاحب انھیں کے ہم مسلک لیکن نرم مزاج و شیریں زبان موجود تھے۔ بریلوی حضرات کا شوق دیدار و مکالمت ایک مدت دراز سے تھا بحمد اللہ پورا ہو گیا...... کیا کیا تجربے ہوئے آنکھوں نے کیا کیا دیکھا، کانوں نے کیا کیا سنا، یہ خود ایک مستقل موضوع ہے جس کی گنجائش اس مختصر روداد سفر میں کہاں نکالی جائے۔ خیر مختصر یہ کہ رات بھر بینظیر شاہ وارثی کا شعر دماغ میں گونجتا رہا ۔

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی!

سفر بحمد اللہ بخیریت ختم ہوا۔ اس کو سمجھنے کے لئے صرف اتنا سن لیجئے کہ صبح کو فیض آباد جنکشن پر جب چائے کا ہدیہ اس "بددین" یا "بے دین" کی طرف سے پیش ہوا، تو اسے نہ صرف شرف قبول حاصل ہوا بلکہ ادھر سے مزید رحمت توشے یا حلوے کی شکل میں بھی ہوئی۔

(صدق جدید ۱۸/جولائی ۱۹۵۲ء)



ڈھائی دن بہار میں

جون ۱۹۵۶ء میں جس دن سے کہ اپنے محبوب ترین فاضل دوست و بزرگ علامہ مناظر احسن گیلانی کی وفات ہوئی گیلانی کا شمار اپنے لئے گویا مقامات مقدسہ میں ہو گیا اور اس کی زیارت کی تمنا دل میں ایک تڑپ بن کر رہی، ادھر اپنے ایک دوسرے محترم ترین فاضل دوست و بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی کے وطن دیسنہ میں حاضری کی آرزو بھی کچھ کم نہ تھی۔ گیلانی اور دیسنہ میں فاصلہ کل چار ہی پانچ میل کا ہے اور عزیزان دیسنہ کی طرف سے طلب اور اس پر اصرار کا سلسلہ بھی ایک مدت سے جاری تھا، پھر اس جوار میں قدیم بدھسٹ شہر نالندہ کی سیاحت کی خواہش بھی دل میں عرصہ سے چٹکیاں لے رہی تھی۔ یہ سارے اسباب، محرکات و دواعی جمع تھے ہی کہ اپنے قدیم کرم فرما ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے تقرر کی خبر صوبہ کی گورنری پر سنائی دی۔ ان سے مراسلت شروع ہوئی تو ان بیچارے نے غایت کرم و عنایت سے اپنے پاس ٹھہرنے کی دعوت دے دی اور دعوت نامہ کی نثر میں شاعری کا چٹخارہ پیدا کرتے ہوئے الفاظ کچھ اس طرح کے لکھ بھیجے کہ راج بھون کی عزت اس میں ہے کہ اس میں درویشوں کا قیام ہو۔ دل اپنا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ اس درویش صفت انسان کو چل کر قصر شاہی میں رہتے سہتے دیکھئے ورنہ اپنا حوصلہ بھلا گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا کہاں سے ہو سکتا تھا۔

تھوڑے سے تامل و تذبذب کے بعد دعوت کو قبول کر لیا اور منظوری مسرت و شکر گزاری کے ساتھ لکھ بھیجی مگر اس قسم کے قیود و شرائط کے ساتھ

(۱) اپنی سرکاری و منصبی مصروفیتوں میں فرق ذرہ بھر نہ لایا جائے۔

(۲) مہمان نوازی کے کسی جزو میں غلو راہ نہ پانے پائے جس سے کوئی بھی بات آپ سے سرزد ہو جو آپ کے موجودہ جاہ و مرتبہ سے فروتر ہو۔

۔۔۔۔۔۔شریعت نے جس طرح مہمان کے حقوق میزبان پر قائم کئے ہیں اسی طرح میزبان کے بھی حق مہمان پر رکھے ہیں اور جو یہ مہمان نوازی کا یکطرفہ تخیل چل پڑا ہے یہ سرتاسر حقیقت کے خلاف ہے اور اس پر عام و خاص سب کو متنبہ ہونے کی ضرورت ہے۔

سفر کے لئے وقت نکالنے کے باب میں اپنی طبیعت کی تنگی شاید جزورسی کی حد تک پہنچ چکی ہے اور شمع زندگی کی آخری ٹمٹماہٹ کے احساس نے اس جزورسی کو کچھ ناگزیر سا بنا رکھا ہے اس کے باوجود اس سفر کے لئے وقت خوشی سے نکالا اور پروگرام پٹنہ اور ملحقات و مضافات کے لئے تین دن کے قیام کا تھا اور ایک شب آمد و رفت کی اس کے علاوہ گویا کل مدت سفر تین دن اور پانچ راتوں کی۔۔۔۔۔ اپنے اسٹیشن دریاباد سے پٹنہ کیلئے اب نئے ٹائم ٹیبل میں کوئی سیدھی گاڑی ہی نہیں، البتہ دہلی سیالدہ ایکسپریس میں جو ادھر ہی سے ہو کر جاتا ہے، لکھنؤ سے ایک بوگی کلکتہ و پٹنہ کے لئے ہوتی ہے جو مغل سرائے سے کٹ کر پٹنہ جانے والی طوفان ایکسپریس میں لگادی جاتی ہے۔ سفر ۳ر اگست (شنبہ) کی شام کو اسی بوگی میں شروع کیا کہ یہ بے غل و غش صبح ساڑھے ۶ بجے پٹنہ جنکشن میں جا اتارے گی۔ چنانچہ اسی کی اطلاع بھی ایک ہفتہ قبل اپنے معزز میزبان اور دوسرے احباب پٹنہ کو کر دی گئی تھی۔

"تدبیر" یہ تھی اب کار فرمائی تقدیر کی ملاحظہ ہو۔ اپنی گاڑی جب پچھلے پہر مغلسرائے اسٹیشن پہنچی تو بہت لیٹ ہو کر اور طوفان ایکسپریس جس میں بوگی جوتی جاتی اسے چھوڑ کر عرصہ ہوا نکل چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بوگی کاٹ کر پلیٹ فارم سے بہت دور ایک سائڈنگ میں کھڑی کر دی گئی اور فرض ناشناسی کی جو وباء عام ہے اس کے مقتضا سے اسٹیشن والوں نے ہم مسافروں کو اس کی کوئی اطلاع دینی بھی ضروری نہ سمجھی! ساڑھے ۳ بجے محض اتفاق سے ہم بے خبروں کو خبر ہوئی اور ساتھ ہی یہ علم ہوا کہ اب یہ بوگی پروگرام سے پورے ۱۲ گھنٹے لیٹ! لاحول ولا قوۃ تو پہلے ہی زبان پر آچکا تھا اناللہ پڑھنے کا موقع اب آیا!۔۔۔۔۔ سہ روزہ قیام کا ایک ایک منٹ مشغولیت سے بھرا ہوا تھا۔ یہ

اتنے گھنٹوں کی کسر کیونکر پوری ہو سکے گی اور پھر میزبان کو کس درجہ زحمت انتظار بلاوجہ برداشت کرنا ہوگی۔ گورنمنٹ ہاؤس کے سارے پروگرام اپنے جزئیات کے ساتھ کئی کئی دن قبل سے طے مندرج ہو چکے ہیں!...... اب شرمندگی، تکلیف، جھنجلاہٹ سب کا احساس ایک ساتھ ہوا اور ان سب سے بڑھ کر بندہ کی بے بسی اور تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کی شکست کا! بندگی نام ہی ہے بیچارگی کا!

جوں توں پٹریاں پھاندتے کہنا چاہئے کہ گرتے پڑتے پلیٹ فارم نمبر ۳ پر پہنچا...... اور وہاں سامان ویٹنگ روم میں رکھا اتنے میں معلوم ہوا کہ پٹنہ کے لئے دوسری گاڑی وہ سامنے پلیٹ فارم نمبرا سے جارہی ہے! حسرت کی آنکھوں سے جاتے دیکھا اور کوئی صورت ہی اس کی نظر نہ آئی کہ اتنے فاصلہ سے دوڑ کر اس پر سوار ہو جاتا! زخم پر زخم کھانا اسی کو کہتے ہیں، خیر اب پلیٹ فارم نمبرا یک پر آ اور تار گھر کی تلاش کے بعد اس میں پہنچا، تار میزبان کو روانہ کیا کہ آپ کا مہمان یوں مغل سرائے میں معلق رہ گیا اب وقت کوئی ساڑھے ۴ بجے تڑکے کا تھا، نماز فجر پڑھی اور خیال آیا کہ اتوار کا دن ہے تار خدا معلوم کب پہنچے کیوں نہ ابھی ٹرنک کال کر کے ٹیلیفون سے ہی یہ اطلاع دم بھر میں پہنچا دیجئے!

بابو صاحب جو ایسے موقع پر خزانہ کے سانپ کی حیثیت رکھتے ہیں بولے کہ سیدھی ٹرنک کال یہاں سے ہو نہیں سکتی ہمیں پہلے بنارس سے اجازت لینا ہوگی اور اس اجازت کے ملنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے آپ اتنی دیر تک یہیں سامنے بیٹھ کر انتظار کریں۔ ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد اب ٹرنک کال کرنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا! فسخ عزائم سے معرفت رب کا سبق ایک بار اور حاصل ہوا! اوّل سخت شرمندہ کہ علاوہ میزبان کے ہاں کے انتظامات کے درہم برہم ہونے کے دوسرے حضرات جو اسٹیشن آئے ہوں گے انہیں بھی کیسی تکلیف اٹھانا پڑی ہوگی!

ریل کے بڑے جنکشن ایک چھوٹے سے پیمانہ پر کارنامہ قدرت کا نمونہ ہوتے

ہیں وہ ان کی ہمہ وقتی چہل پہل، قلیوں کی دوڑ دھوپ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ، سودے والوں کی چیخ و پکار، بابو صاحبان کی ڈانٹ ڈپٹ، اِدھر یہ گاڑی گھڑ گھڑاتی ہوئی آئی اُدھر اس انجن نے سیٹی دی ادھر اس کرانچی میں مال لد رہا ہے ادھر وہ ڈبہ دم کے دم میں مسافروں سے خالی ہو گیا! ابھی یہ پلیٹ فارم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی اور ابھی ایک دم سے سناٹا چھا گیا، کتنے بچھڑے ہوئے آنا فانا مل گئے اور کتنے ساتھ آن کی آن میں چھوٹ گئے! ایک شان جامع المتفرقین کی ایک شان فارق المجتمعین کی!...... انسان اگر دل رکھتا ہو (اِنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ) تو کتنی بصیرتیں ہر بڑے جنکشن سے حاصل کر سکتا ہے، کتنی تجلیات سے اپنے دیدہ و دل کو منور کر سکتا ہے! اور مغلسرائے سے بڑا جنکشن ملک میں کون ہوگا۔ زندگی کی نیرنگیوں کائنات کی بوقلمونیوں عمر کے اتار چڑھاؤ، جوانی کی بے وفائیوں کا سارا نقشہ بیک وقت اس آئینہ میں موجود!

ساڑھے سات کا وقت تھا، گاڑی روانہ ہوئی پسنجر ہر اسٹیشن پر رکتی ٹھہرتی ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد صوبہ بہار کا علاقہ شروع ہو گیا اور صوبہ کے دور اسلامی کی تاریخ نظر کے سامنے پھر گئی وہ شیر شاہ کا اقبال، وہ منیر، راجگیر بہار شریف، پھلواری شریف کے صوفیہ کے مجاہدے اور ریاضتیں۔ وہ پٹنہ، آرہ، مونگیر، داناپور اور چھوٹے چھوٹے قصبوں کے اہل علم و فضل کی بزم وہ یہاں کے شاعروں، ادیبوں سے فلسفیوں تک کی خدمات علم و ادب۔ وہ علی محمد شاد اور امداد علی، علی امام اور حسن امام، خدا بخش خاں اور میاں ریاض الحسن خاں، شرف الدین و مظہر الحق، ابوالمحاسن سجاد اور عبدالرؤف داناپوری، مسعود عالم ندوی اور سید عبدالعزیز، مولانا محمد علی مونگیری اور شوق نیموئی، آفتاب شریعت شیخ بدر الدین اور مہر طریقت قاری شاہ سلیمان پھلواروی، عبدالغنی وارثی اور شمس العلماء محب الحق، مولوی شفیع داؤدی اور سید تقی الدین۔ خدا معلوم ماضی بعید و ماضی قریب کے چھوٹے بڑے کتنے مشاہیر کی یاد تازہ ہو گئی۔ اور ذہن ان کی شخصیتوں کا استحضار کرتا رہا!......

لیجئے اب پٹنہ جنکشن قریب آگیا اور گاڑی پھلواری شریف کی آبادی کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ اس خطہ سے خدا معلوم بوئے انس کیوں آ رہی ہے اور محسوس کچھ ایسا ہو رہا ہے کہ جیسے یہ زمین پردیس کی نہیں وطن کی ہے۔ اینٹوں کے بھٹے جا بجا لگے ہوئے ہیں اور زبان تمثیل میں یہ اشارے اس قصبہ کے بزرگوں کی تعمیری خدمات کی جانب کر رہے ہیں!

بارہ بجے ساڑھے ۱۲ بجے ہوئے اور گاڑی پٹنہ جنکشن کے حدود میں داخل ہو کر آہستہ ہوتی ہوئی ایک دور افتادہ پلیٹ فارم پر جا کر ٹھہر گئی۔

قیام پٹنہ کے لئے کل ۷۲ گھنٹے تجویز ہوئے تھے، لیکن اسے کیا کیجئے کہ اس میں ترمیم کارکنان قضا و قدر نے کر دی، گاڑی بجائے ۶ بجے صبح کے اب ایک بجے دوپہر کو پہنچ رہی تھی اور اس سے مدت قیام قدرتاً اب سات گھنٹے گھٹ کر بجائے ۷۲ کے کل ۶۵ گھنٹے رہ گئی تھی۔ گاڑی ابھی پوری طرح رکنے بھی نہ پائی تھی کہ نظر طبیہ کالج پٹنہ کے پرنسپل حکیم عبدالاحد صاحب پر پڑ گئی۔ صدق نواز اور مدیر صدق کے قدیم مخلص و کرم فرما ہیں۔ انھیں دیکھ کر جان میں جان آگئی۔ یہ ظاہر تھا کہ صبح سے دو بار گورنمنٹ ہاؤس سے گاڑی آنے کے بعد اب اس تیسری ٹرین کے لئے ہرگز کوئی انتظام نہ ہوگا خصوصاً جبکہ میرے اطلاعی تار میں اس ٹرین یا کسی متعین ٹرین کی طرف کوئی اشارہ نہ تھا، اور گاڑی سے ابھی اتر ہی رہا تھا کہ مولوی شاہ عزالدین ندوی پھلواری بھی نظر آ گئے۔ ایک تو ندوی دوسرے پھلواروی اور قاری شاہ سلیمان کے نواسے۔ پھر اپنی ذات سے بھی محبت کے پتلے غرض کئی کئی رشتے خصوصیت کے ان کی ذات میں جمع ...... دونوں مخلصوں کا مل جانا ایک نعمت معلوم ہوا اس کے بعد پلیٹ فارم نمبر ا پر آنا، ویٹنگ روم میں سامان رکھنا، گورنمنٹ ہاؤس فون کرنا، وہاں سے گاڑی کا آنا یہ سب چند منٹ کے اندر ہو گیا۔

نماز ظہر سے ریل ہی پر فراغت کر لی گئی تھی، اے ڈی سی صاحب مع کار کے جو

آئے تو معذرت کرتے ہوئے۔ حالانکہ معذرت سرتاسر غیر ضروری تھی جب تار میں کوئی اطلاع اس ٹرین کے لئے تھی ہی نہیں تو اس پر کار آتی کیسے!...... کار روانہ ہوئی اور منٹوں کے اندر گورنمنٹ ہاؤس کی برساتی کے اندر تھی لیکن یہ کار باوجود اعلیٰ درجہ کے ہونے کے نکلی کچھ عجیب سی۔ بیٹھتے ہی نظر اس پر پڑی کہ ہر طرف سے کچھ بند سی ہے یعنی اس کے شیشوں پر سامنے اور پیچھے اور بازوؤں پر ریشمی پردے کچھ اس طرح پڑے ہوئے ہیں کہ ہٹانے سے بھی پوری طرح نہیں ہٹتے! یہ کیا ماجرا ہے؟ اے ڈی سی صاحب نے معمہ یوں حل کر دیا کہ گاڑی خود لاٹ صاحب کی نہیں بلکہ ان کی بیگم صاحبہ کی سواری کی ہے!...... یہ کیا؟ اس بیسویں صدی میں اور اتنا سخت پردہ! اور اتنے سخت پردہ کا اہتمام رکھنے والی کون؟ ایک گورنر کی بیگم! جبکہ دنیا جہان کے گورنروں ہی کی بیگمات تو بے پردگی اور بے حجابی کا ریکارڈ قائم کر رہی ہیں، کہاں پشتینی پردہ نشینوں کی بے پردگی اور کہاں یہ گاڑی جو دوسروں کو پردہ نشین بنا دے! دل اس عالی ہمت خاتون کی اسلامیت پر عش عش کر اٹھا۔

۴ر اگست۔ پروگرام میں آج کا دن سیاحت نالندہ کے لئے تھا۔ نالندہ ایک مقام ہے جو پٹنہ سے کوئی ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں یہاں بدھ مذہب والوں کی مرکزی خانقاہیں، درسگاہیں اور ریاضت گاہیں تھیں۔ ۱۹۱۵ء میں صدہا سال کی گمنامی و بے نشانی کے بعد یہ شہر بڑی کھدائی کے بعد از سر نو نقشہ پر نمودار ہوا اور سرکار ہند کے محکمہ اثریات نے توجہ کر کے اسے از سر نو زندہ کر دیا۔

۱۹۳۱ء میں محکمہ اثریات کے حلقہ پٹنہ کے سپرنٹنڈنٹ کوئی صاحب ایم ایچ قریشی تھے۔ ان کا مرتبہ ایک انگریزی گائیڈ بھی اس کے متعلق شائع ہو چکا ہے۔ ایک لق و دق میدان کوئی ۲ ہزار فٹ لمبا اور ۷۰۰ فٹ چوڑا موجود ہے اور اس وسیع رقبہ میں وہ قدیم عمارتیں گویا از سر نو کھڑی کر دی گئی ہیں۔ دور دور سے سیاح انھیں دیکھنے آتے ہیں اور اس سے دو چار فرلانگ ہٹ کر میوزیم (عجائب خانہ) بھی اس سے متعلق ہے۔ کوئی دو کا

عمل ہوگا کہ اپنے کو مہمان خانہ کے ایک کمرہ کے اندر پایا۔ گورنمنٹ ہاؤس کا پرانا عوامی نام اردو میں لاٹ صاحب کی کوٹھی ہے اور اس کوٹھی میں داخل ہو کر لاٹ صاحب کے مہمانوں کی خاطر داریوں کا پوچھنا کیا ہے، چٹ پٹ غسل کے بعد ہی باریابی ہوئی اور کھانے سے جلد فراغت کر کے تین سے قبل ہی اس سفر پر روانگی ہو گئی، دیر بہت ہو چکی تھی اور پورے ۷ گھنٹے کا وقت ریل والوں کی غفلت کی نذر ہو چکا تھا، پھر بھی جی نہ مانا کہ پروگرام کو خواہ مخواہ ملتوی کر دیا جائے اور آج کا دن ضائع شدہ سمجھ لیا جائے۔ کاش بندہ کو وقت کی قیمت کا یہ احساس اور اس کی حفاظت کا یہ اہتمام ہر طاعت اور دینی خدمت کے باب میں پیدا ہو جائے!

وقت ابھی تین کا نہیں ہوا تھا کہ موٹر نالندہ کے لئے روانہ ہو گئی۔ پٹنہ شہر کی آبادی گویا صرف لمبان میں ہے اور اصل اور بڑی سڑک شہر بھر میں کہنا چاہئے ایک ہی ہے۔ گاڑی اسی راستہ سے گزری اور شہر کے ہر قسم کے منظر نظر سے گزرتے گئے، تا آنکہ نوبت دیہات کی آگئی، ابھی یہ گاؤں ملا ابھی وہ اور درمیان میں بہار شریف کے اندر سے بھی گزر ہوا۔ پانچ بج رہے تھے کہ صبار فتار گاڑی نے نالندہ پہنچا دیا، میوزیم بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا پھر بھی مہتمم (کیوریٹر) صاحب نے جو لکھنؤ کے ایک شریف کائستھ ہیں، گورنمنٹ ہاؤس کی گاڑی کا احترام کر کے میوزیم کی خاصی تفصیلی سیر کرا دی خود ساتھ ساتھ رہے، اور ایک ایک چیز بتاتے دکھاتے سمجھاتے گئے، یہ فلاں عہد کے مٹی کے برتن ہیں یہ گھڑے ہیں، صراحیاں ہیں، بدھنے ہیں، مٹھوریں ہیں یہ اس زمانے کے چمچے ہیں، چاقو ہیں، سکے ہیں، علمی سندوں پر لگنے والی مہریں ہیں، یہ فلاں خط کے کتبے ہیں یہ فلاں دور کے چاول جو جلی ہوئی حالت میں پائے گئے ہیں اور اب تک محفوظ ہیں اور گوتم بدھ کی مورتیوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں چھوٹی بڑی ہر سائز کی اور ہر نمونہ کی...... ایک موحد کا جی ایسے منظروں میں کیا لگ سکتا ہے، پھر بھی انسان سبق لینا چاہے تو اپنے ہر مشاہدہ سے لے سکتا ہے اور قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ اور اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا

فِي الْاَرْضِ کے حکم کی تعمیل ہر چپہ ارض کی سیاحت سے ہو سکتی ہے۔ اصل زمین نالندہ کی تعمیرات شکستہ کا معائنہ چند منٹ کا کام تھا اور دل کی نگاہوں نے بہت کچھ پڑھ لیا۔

عصر کا وقت آئے ہوئے دیر ہو چکی تھی اور بارش کے باعث باہر نماز پڑھنا ممکن نہ تھا، سفر واپسی کا شروع ہوا کہ راستہ میں کوئی مسجد مل ہی جائے گی۔ اتنے میں حکیم صاحب نے جو اسٹیشن سے لے کر اب تک برابر ساتھ ہی ساتھ تھے یاد دلایا کہ راج گیر کی مشہور پہاڑی حضرت مخدوم کی چلہ کشی کی جگہ اور مخدوم کنڈ چند ہی میل کے فاصلہ پر ہیں کیوں نہ ان کی زیارت سے بھی مستفید ہو لیا جائے۔ گاڑی کا رخ ادھر مڑ گیا اور وہاں پہنچ کر عجیب عجیب خوارق سننے میں آئے بلکہ بعض خوارق کے بعض علامات و نشانات تو اب تک موجود پائے۔ نیم گرم پانی کا پہاڑی چشمہ بھی کچھ عجیب سا نظر آیا۔ تازہ وضو کر کے نماز عصر یہیں مسجد میں ادا کی اور ۶۰، ۶۲ میل کا سفر واپسی شروع ہوا۔ نماز مغرب اصل وقت پر نصیب نہ ہوئی اور بہت سے مواقع کی طرح آج پھر تازہ قدر ان احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوئی جن میں جمع بین الصلوٰتین کی سہولتیں مسافر کے لئے رکھ دی گئی ہیں، واپسی کا راستہ انھیں منزلوں اور انھیں منظروں کے ساتھ پھر طے ہوا اتنے فرق کے ساتھ کہ پہلے دن تھا اور اب رات۔

گورنمنٹ ہاؤس کا نظام اوقات ایک ایک منٹ کا پابند ہوتا ہے۔ شب کا کھانے کا وقت آٹھ بجے کا مقرر تھا اور واپسی جب ہوئی تو وقت دو چار منٹ نہیں زیادہ گزر چکا تھا ...... اور اب کیا کیا جائے کہ کتنی ندامت اس وقت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ معزز میزبان اس لاابالی اور بے فکرے مہمان کے انتظار میں اب تک اپنا ہاتھ کھانے سے روکے ہوئے ہیں علی الخصوص اس حال میں کہ علالت کے باعث کھانے پینے کے اوقات کی پابندی ان کے لئے اور زیادہ مؤکد ہو چکی ہے! طبیعت اپنے اوپر جھنجھلائی کہ جاتے وقت ان سے بہ صراحت کہہ کیوں نہ گیا تھا کہ انتظار نہ فرمایا جائے!...... خیر بات چیت کھانے کی میز پر رہی اور بات چیت تو آتے ہی دو بجے بھی ہو چکی تھی۔ ذاتی و خانگی

معاملات پر بھی اور مختلف علمی، دینی، ملی سیاسی تحریکات اور ہر قسم کے پبلک مسائل پر بھی آزادانہ اور بے تکلف اور یہ ضروری ہرگز نہ تھا کہ ہر موضوع پر ہم خیالی ہی ہو نقطہ نظر میں اختلاف قدرتی بلکہ ایک حد تک ناگزیر تھے، لیکن شرافت جو ڈاکٹر صاحب کا امتیازی جوہر ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں اختلاف ہی کے موقع پر ہوئی، گفتگو میں وہ گورنر سے کہیں زیادہ ایک "ٹیچر" (معلم) نظر آئے۔ جامعہ ملّیہ کے "شیخ" یا علی گڑھ کے وائس چانسلر، عمر بھر کی کمائی ان کی یہی معلمی ہے اور معلّم بھی کیسے کہ نفسیات بشری کے ایک ایک جزئیہ پر نظر رکھنے والے، چہرہ پر "اللہ کا نور" داڑھی پہلے بھی تھی اب بھی ہے پہلے کے مقابلہ میں اب اس پر عمل "قصر" بے شک زیادہ ہونے لگا ہے لیکن بہر حال یہ کیا کم ہے کہ داڑھی موجود اب بھی ہے۔ صوبہ کا گورنر اور داڑھی والا! بیسویں صدی کا ایک اعجوبہ!

پٹنہ ۵/اگست ۱۹۵۷ء، سیّد سلیمان ندوی کے دیس دیسنہ کے دیکھنے کی آرزو آج سے نہیں دل میں سالہا سال سے تھی۔ آہ کسے معلوم تھا کہ سیّد صاحب کی زندگی میں کبھی یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی! ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے کہ گیلانی کے راستہ میں پکی سڑک سے جب کسی نے بتایا تھا کہ وہ دیکھئے سامنے دو میل کے فاصلہ پر دیسنہ ہے تو بے اختیار ادھر کشش محسوس ہوئی تھی اور جی بے ساختہ یہ چاہ رہا تھا کہ سواری کو روک، قصداً اس گاؤں کا کر چلئے اور سید صاحب کی زندگی کے ہر دور کی تصویر نظر کے سامنے خود بخود پھرنے لگی تھی یوں بچپن میں ان گلیوں میں کھیلتے پھرتے ہوں گے، یوں ذرا بڑے ہو کر اس گاؤں سے باہر نکلے ہوں گے، پٹنہ اور پھر لکھنؤ کا سفر یوں کیا ہو گا، نوجوانی، جوانی، ادھیڑ سن میں شہرت حاصل کر کے یوں اپنے وطن کا رخ کرتے ہوں گے وقس علیٰ ہذا اور یہ ساری داستان خط میں سید صاحب کو لکھ بھی بھیجی تھی۔ سید صاحب خط پڑھ کر متاثر ہوئے اور جواب میں کچھ اس طرح کا فقرہ بھی لکھا کہ آپ نے میرے لئے وہ سب کچھ سوچ لیا جو میں خود بھی شاید نہ سوچ سکتا...... اور دیسنہ تو وہ مردم خیز بستی ہے جس نے سید صاحب کے علاوہ بھی بہت سے قابل ذکر اور قابل فخر ہستیوں کو جنم دیا

ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آفتاب کے سامنے چاند اور ستارے قابل التفات ہی نہ رہ پائیں اور زندہ ہستیوں سے قطع نظر یہاں کا کتب خانہ الاصلاح تو خود اس قابل ہے کہ اس کا قصد کر کے یہاں کا سفر اختیار کیا جائے۔

آج صبح ہی ایک بڑے مخلص صدق نواز پروفیسر عبدالمنان بیدل ایم۔ اے ملنے آگئے کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا اور خوب گزرا (یہ صرف شاعری کی دنیا میں اور تخلص کے اعتبار سے "بے دل" ہیں ورنہ حقیقت میں تو صاحبِ دل ہیں) اور پھر آج کی کڑی منزل کے لئے کچھ وقت پٹرول کی فراہمی میں صرف ہوا۔ غرض یہ کہ روانگی ساڑھے ۹ سے قبل نہ ہو سکی اور آج روانگی کے وقت یاد کر کے بہ صراحت میزبان سے عرض کر دیا گیا کہ وقت پہ کھانے پر انتظار کی سند نہیں اور یہ معاہدہ کے خلاف بھی ہے میں نے تو پہلے ہی لکھ بھیجا تھا کہ آپ اپنے ہر پروگرام میں بالکل آزاد رہیں گے تو خدا معلوم میری واپسی کس وقت ہو آپ ہرگز فرق اپنے کسی معمول میں نہ آنے دیجئے گا، کل مجھے خواہ مخواہ اس کی شرمندگی اٹھانا پڑ چکی ہے۔ قریب ۱۲ کا وقت ہو گا کہ موٹر وہاں پہنچ کر رک گیا جہاں سے دیسنہ کا کچا راستہ شروع ہوتا ہے۔

کچا راستہ دیہات کا اور وہ بھی برسات میں !...... اب اندازہ ہوا کہ یہاں کے مہمان نواز حضرات جو اس بھری برسات میں میرے سفر سے کچیا رہے تھے وہ کچھ بیجا نہ تھا وَمَا هُمْ بِبَالِغِيهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ یہ تو اللہ کے گھر کے راستہ کی شان بتائی گئی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ اس کا کچھ پرتو اللہ والوں کے گھر کے راستہ پر بھی پڑ گیا ہے! بلا مجاہدہ نفس کے ان کے در تک بھی پہنچنا ممکن نہیں۔ میزبانوں نے میری راحت کے لئے جتنا بھی انتظام ان کے بس میں تھا کر دیا تھا، میری سواری کے لئے میانہ موجود تھا اپنے لڑکپن تک میانہ، پینس، چوپہلا، پالکی کا رواج تھا۔ اب ان کی شکل ہی کہاں دیکھنے میں آتی ہے اور ان سواریوں کا مفہوم بھی سمجھنے والے کتنے باقی رہ گئے ہیں (پٹنہ اس لحاظ سے بھی قابل داد ہے کہ اس میں قدامت کی یادگاریں اور بڑی آرام دہ سواریاں

فٹن اور پالکی گاڑیاں اب بھی کچھ نہ کچھ باقی ہیں) میں میانہ میں بیٹھ کر نہیں کہ اس میں بیٹھنا ممکن ہی نہ تھا، لیٹ کر روانہ ہوا، میرے رفیق اور کھلی ہوئی سواری میں سوار ہوئے جسے یہاں کی زبان میں ٹم ٹم کہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کہاروں کے کاندھے پر خشک وتر سے گزرتے اور نشیب و فراز طے کرتے اپنے مستقر کو پہنچ گئے، کہاروں نے میانہ زمین پر رکھا اور سامنے کتب خانہ الاصلاح کی عمارت تھی! "عمارت" اگر ایک مختصر سے ہال اور ساتھ کے بغیر کمروں پر عمارت کا اطلاق ہو سکے! آج کل اعلیٰ نہیں اوسط درجہ کے کتب خانہ کے لئے ضرورت کتنے ساز و سامان کی دفتری کیٹلاگر لائبریرین وغیرہ خاصے بڑے اسٹاف کی اور کتنے وسیع رقبہ کی، فن وار کتابوں کے رکھنے اور مرتب کرنے کے لئے ہوتی ہے یہاں ان سارے انتظامات کی جگہ بس اللہ کا نام سب کا قائم مقام بانیوں اور کارکنوں کا محض اخلاص۔ کتابوں کا مطالعہ چاہے کچھ ہی دیر کے لئے ہو، سکون یکسوئی چاہتا ہے۔ یہاں گاؤں کا گاؤں گویا میزبان! اس ہجوم میں پڑھنے پڑھانے کی نوبت کیا آتی اور پھر عجلت و رواداری لیکن بہر حال جتنا دیکھنا بھی بن پڑا ذخیرہ توقع سے بھی بہتر نکلا، پرانے اردو اخبارات اور رسالوں کی جلدوں کے لئے تو اس کا امتیاز تو مشہور ہی تھا۔ کتابیں نہ صرف تعداد بلکہ نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اچھی خاصی ملیں متعدد مخطوطے اور قلمی نوادر بھی، بستی آخر اہل علم کا وطن ہی ہے، کیا اس کا اتنا اثر بھی نہ ظاہر ہوتا۔ کاش کوئی صورت اب کتب خانہ اور اس کے متعلقات کے لئے نکل آتی اور اگر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی گورنری اور شاہ محمد عزیز منعمی کی وزارت کے زمانہ میں بھی نہ نکلی تو پھر کب نکلے گی؟

کتب خانہ کی کتاب معائنہ بجائے خود عجائب و نوادر کے حکم میں ہے۔ بڑے مشاہیر وقت مولانا شوکت علی، صدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وغیرہ کے معائنے اس میں درج ملے اور سب سے بڑا انکشاف یہ ہوا کہ آج جو جمہوریہ ہند کے صدر محترم ہیں! ڈاکٹر راجندر پرشاد بالقابہ خود ان کا معائنہ اور وہ بھی شستہ عبارت اور اردو کے خاصے نستعلیق و روشن خط میں درج ملا۔ کتب خانہ کو اچھا خاصا سراہا ہے اور لکھا

ہے کہ کسی امیر کی نظر توجہ اس پر پڑ جائے تو کام پورا ہو جائے۔ کاش کتب خانہ والے اس نادر تحریر سے فائدہ اٹھائیں اور عرضداشت بھیجیں یا خود وفد لے کر بارگاہ صدارت پناہ پہنچیں اور عرض کریں کہ "عالی جاہ اب تو آپ خود امیر، بلکہ امیر الامراء کے مرتبہ پر ہیں ہمارا کام بننے میں پھر اب کیا دیر ہے"۔

سیّد عبدالحکیم اور بابو بشیر الحق سنا گیا کہ کتب خانہ کے بانیوں میں ہیں۔ سیّد صاحب اب ضعیف زیادہ ہو گئے اور آنکھ کان دونوں سے تقریباً معذور۔ لیکن جب بات کرنے پر آتے ہیں تو جوانی کے دم خم اختیار کر لیتے ہیں۔ کتب خانہ کے دکھانے میں بشیر الحق صاحب بہت پیش پیش رہے۔

سیّد صاحبؒ کے مکان آبائی اور مکان نو تعمیر دونوں کی زیارت تو خیر واجبات میں تھی اور بھی اپنے دیسنوی جاننے والوں کے مکانوں کی سرسری زیارت کے بغیر طبیعت نہ مانی۔ نجیب اشرف ندوی، مولوی سعید رضاؒ ندوی، سیّد صباح الدین، عبدالرحمٰن، سعید الحق اور جس جس کے بھی نام یاد پڑے سب کے گھروں پر حاضری ہوئی اور چشم تصور میں مکانوں کے مکینوں کی صورت پھرتی رہی۔ کھانے اور ٹھہرنے کا انتظام وحید النبی صاحب کی لق و دق حویلی میں طے پایا تھا، بہار کا دستر خوان اور مہمان نوازی یوں بھی مشہور ہے۔ اور پھر یہ تو عزیزی صباح الدین سلمہ، رفیق دارالمصنفین کے ماموں بھی تھے۔ کھانے کی میز پر نمکین اور میٹھے کھانوں کی وہ تعداد و تنوع کہ مہمان کے ہاتھ کی رسائی سب کھانوں تک دشوار! ۲ بجے چائے نوشی اور یہاں کی تاریخی مسجد کی زیارت کرانے کے بعد ان مخلصوں نے اس طرح رخصت کی اجازت دی جس طرح اپنے کسی عزیز کو رخصت کیا جاتا ہے۔ وہ کہئے شروع میں ہی ان حضرات کو شدید تاکید کر دی گئی تھی کہ جلوس، جلسہ، نعرے وغیرہ کا شائبہ بھی نہ آنے پائے وہ احتیاط کام آئی ورنہ جوش محبت یہاں خدا معلوم کیا کچھ کر کے رہتا۔ راستہ میں بے پناہ و ناگہاں بارش کے مزے اٹھاتا ہوا ۴ بجے سڑک پر پہنچ گیا جہاں موٹر تین چار گھنٹہ قبل چھوڑ گیا تھا۔ حضرت گیلانی کے چھوٹے بھائی سیّد مکارم احسن خوب مستعدی کے ساتھ یہیں

مل گئے اور ان کی رہنمائی میں صبا رفتار موٹر نے بات کہتے گیلانی کے لب سڑک قبرستان پہنچادیا۔

"قبرستان" جی ہاں! نہ کوئی گنبد، نہ کوئی مقبرہ نہ کوئی حجرہ، نہ کوئی چبوترہ نہ اونچی پکی قبروں کی قطار نہ کوئی در و دیوار، ایک بڑے طویل و عریض باغ میں خاندان والوں کی دو ایک کچی تربتیں بس یہ کل کائنات اس گورستان کی! سڑک سے چند منٹ کے فاصلہ پر کھلے ہوئے آسمان کے نیچے مولانا کا مزار پُر انوار...... یعنی مٹی کا ایک ڈھیر، جس کے نیچے جسد خاکی اُس مرد مومن کا دائمی آرام میں ہے جو وقت کا زبردست فاضل، معقول و منقول کا جامع، شریعت و طریقت دونوں کا رازداں، ایک بہترین خطیب ایک بہترین اہل قلم، بیدار دل روشن دماغ، مورخ! محقق، شاعر، عارف سب ہی کچھ تھا اور ابھی کل تک جیتا جاگتا اور دوسروں کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے تھا!...... دن گزرتے کیا دیر لگتی ہے ابھی پانچ سال ادھر کی بات ہے یہی برسات کا موسم تھا کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں مولانا اسی باغ میں اپنے اس نیاز مند کو سیر کرانے لائے تھے۔ اس کے دریافت کرنے پر اپنے والد مرحوم کی قبر بتائی تھی، آج اسی کے مزار پر ایک گرفتار قید عنصری کی حاضری تھی، بارش مسلسل جاری تھی۔ اس پر ہٹنے کا جی نہیں چاہتا تھا، جو کشش جو جاذبیت جو محویت زندگی میں تھی اس کا ظہور اس وقت بھی ہو رہا تھا۔ زیر لب نیم مضطر حالت میں جو دعائیں التجائیں مخاطب ہوئے وہ اب سب کہاں یاد، اتنا یاد ہے کہ آنسوؤں کے تار کے ساتھ کچھ اس قسم کی صدائیں زیر لب و زبان ٹکراتی رہیں:

"دلوں کے دیکھنے والے اور سینوں کے اندر کی خبر رکھنے والے! اپنے دین کے اس دیوانے کو اپنی بہترین نعمتوں اور بخششوں سے سرفراز فرما۔ اس نے اُٹھتے بیٹھتے اپنے کو تیرے دین اور تیرے پیمبر ﷺ کی عزت و ناموس کے لئے وقف کر رکھا، تو اسے وہ صلہ دے جو اس کے خیال میں نہ آیا ہو۔ ہاں ہاں اسے اپنی رحمتوں اور سرفرازیوں سے نواز دے! اور اس نیک اور پاک روح کے طفیل میں ہم لوگوں کا بھی بیڑا پار کر دے جو اس سے محبت کا دم بھرتے تھے۔ بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم، بڑے بڑے عارفوں کا مقولہ

ہے کرم میں کون تیرا مقابلہ کر سکتا ہے اور تو اپنے عارفوں کی بات سچ ہی کر دکھاتا ہے"۔

۵/اگست ۱۹۵۷ء

مزار سے اٹھ کر مکان پر آئے چند ہی قدم کا تو فاصلہ تھا۔ وہ کمرہ دیکھا جہاں مولانا کا پلنگ بچھا رہتا تھا۔ سید مکارم سلمہ نے ہر چیز حتی الامکان اسی طرح رہنے دی ہے جیسے مولانا کی حیات میں تھی، چائے پلوائی پانی میں شرابور کپڑے آگ پر جلد جلد خشک کرا دیے۔ باتیں زیادہ مولانا ہی کی کرتے رہے۔ اس سب کے باوجود کچھ زیادہ جی نہ لگا، طبیعت پر وحشت ہی غالب رہی۔ مکان بغیر مکین کے لطف ہی کیا رکھتا ہے۔ بلبل خوش نوا اڑ چکا تھا اور خالی پنجرہ میں اب کیا رکھا تھا! جی لگنے کی جگہ تو اب تو وہی کچی مٹی کی ڈھیر رہ گئی تھی اس پختہ مکان میں اب کیا تھا؟...... بالکل ویسا ہی تاثر حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد تھانہ بھون جا کر پیدا ہوا تھا، خانقاہ وغیرہ کہیں جی نہ لگا، جی پھر کہیں لگا تو اسی شیخ وقت کی کچی تربت پر حاضری دے کر...... ۵ بج رہے تھے کہ یہاں عصر کی نماز ادا کی۔ معاً واپسی ۶۰ میل کا سفر درمیان میں ایک مسجد میں نماز مغرب اور حکیم صاحب کی تحریک پر متعدد مقابر پر فاتحہ خوانی۔ کوئی ساڑھے ۹ بجے کا وقت ہو گا کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ معاً اطلاع ملی کہ مولوی ریاست علی ندوی منتظر ہیں پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ۔ قدیم رفیق دار المصنفین اور سب سے بڑھ کر اپنے سابق میزبان ان بیچارہ کو اطلاعی و معذرتی خط آج دوپہر کو کہیں جا کر ملا۔ ایک ہفتہ قبل کا چلا ہوا! وقت سے مل گیا ہوتا تو کیا ان کا نمبر ہمہ وقتی رفاقت میں حکیم صاحب سے کچھ کم رہتا!

پٹنہ ۶/اگست

آج قیام کا آخری دن تھا۔ اور آج کا سفر بھی مختصر ہی تھا یعنی صرف پھلواری شریف تک جو چند ہی میل کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن حکیم صاحب اور مولوی ریاست علی کی رائے ہوئی کہ جب وقت میں گنجائش ہے تو پہلے تاریخی اور مشہور قصبہ منیر، جہاں کے شیخ شرف الدین یحییٰؒ کے مکتوبات طالبان سلوک و تصوف کے لئے ایک مرتبہ استناد رکھتے ہیں، کی زیارت بھی کیوں نہ کر لی جائے۔ مشورہ پر عمل ہوا دوپہر ہو رہی

تھی کہ ہم لوگ حدود پھلواری میں داخل ہو گئے اور محبتوں کا چمن جیسے شگفتہ ہو گیا...... پہلی منزل شاہ غلام حسنین ندوی کے ہاں کی تھی۔ یہ ان قاری شاہ سلیمان پھلواری کے جانشین اور خلف الصدق ہیں جن کی شیوا بیانی کی دھوم ہندوستان بھر میں مچی ہوئی تھی اور جنھوں نے خود پھلواری کی شہرت کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا تھا، شاہ صاحب سے صوری ملاقات غالباً پہلی بار ہوئی۔ گو خاندانی تعلقات ان سے دو ایک پشت سے قبل سے ہیں، ملنے پر وہ صدق نوازی میں اپنی نظیر آپ نکلے۔ مطلق مدح و داد والے اور بہت سے حضرات ہیں لیکن جس باریک بینی اور دقت نظر سے انھوں نے صدق کے خصوصیات گنوائے اس نے خود مدیر صدق کو بھی دنگ کر دیا۔ یہاں امیر شریعت صوبہ بہار مولانا منت اللہ رحمانی، سید انوار احمد ایڈوکیٹ، قاضی احمد حسین ایم ایل اے اور نائب امیر شریعت اور جوہر نظامی اور بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی اور قلب نے سب سے زیادہ تاثر ایک وزیر ریاست شاہ محمد عزیز منعمی سے قبول کیا۔ ان کی سادگی، بے تصنعی، اسلامیت کسی طرح یقین نہیں آنے دیتی تھی کہ یہ منسٹر کے عہدہ پر ہیں۔ چہرہ پر خاصی بھری داڑھی کیا کم تھی کہ انھوں نے اپنے لڑکے سے ملایا جسے وہ حفظ قرآن کرا رہے ہیں اور کسی دینی درس گاہ میں داخل کرا کے بجائے وکیل، بیرسٹر و انجینئر، ڈاکٹر، ڈپٹی، منصف، کلکٹر وغیرہ کے مولوی بنانا چاہتے ہیں! حفظ قرآن کی فضیلت اور اجر بے حساب کے سلسلہ میں جتنی حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ تو اب صرف عوام کالانعام کے لئے اور ان کے لئے بھی مشکل سے رہ گئی ہیں، ورنہ اونچے طبقہ میں کون "احمق" باقی رہ گیا ہے جو ترقیوں کے بیشمار امکانات چھوڑ چھاڑ اپنے فرزند دلبند کو "ملا" اور حافظ بنانے کا خواب دیکھے! ایک کامیاب کارگزار اور مقبول خاص و عام منسٹر سے آج اس ذہنیت کا ظہور اگر اس کی کرامت قرار دی جائے تو شاید زیادہ مبالغہ نہ ہو!

دعوت حسب توقع خوب پر لطف تھی اور تکلف میں اگر کچھ کسر باقی رہ گئی تھی تو اسے کھانے کے بعد کی دو دستر خوانی تقریروں نے پورا کر دیا۔ ایک تقریر شاہ عزیز الدین

ندوی کی ہوئی، جو قاری شاہ سلیمان کے نواسہ ہیں اور اپنی ذات سے محبت کے پتلے۔ اور دوسری تقریر منسٹر صاحب کی...... خدا معلوم اتنا حسن ظن بعض لوگوں نے اپنے دلوں میں کہاں سے پیدا کر لیا! دعوت کے بعد مختصر سی حاضری دفتر امارت شرعیہ میں ہوئی اور پھر نماز ظہر کے بعد وقت مشائخ پھلواری کی دوسری شاخ خانقاہ مجیبیہ والوں کے ہاں کے لئے آ گیا۔ یہاں کے سجادہ شاہ امان اللہ قادری سلمہ، گو بہ لحاظ عمر ابھی نوجوان ہی ہیں لیکن فرط اخلاق و کرم میں بڑے بوڑھوں کے ہم سن۔ اللہ ان کی صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر کام میں لائے، مل کر جی خوش رہا۔ رہے قاضی امارت شرعیہ شاہ عون احمد سلمہ، تو ان کے اخلاص نے پہلی بار (۵۲ء میں) بھی شرمندہ کیا تھا اور اب کی تو شرمندہ تر رکھا۔ پرسوں اسٹیشن پر لینے گئے تھے آج بھی پیشوائی کو پھلواری میں وہی سب سے آگے موجود اور پھر اس وقت چائے کے ساتھ پر تکلف ناشتہ سے خاطریں کر رہے ہیں۔ حقیقی چھوٹے بھائی علیل اور یہ اُن کی تیمار داری میں مصروفیت کے باوجود مجھے درگاہوں اور مزارات پر لے جانے کے لئے پورا وقت نکالے ہوئے تیار ہیں۔ ان کے والد ماجد شاہ نظام الدین صاحب سے بھی نیاز حاصل رہا اور شاہ عثمان غنی سابق مدیر "نقیب" سے بھی ملاقات رہی۔

عصر سے قبل ہی واپسی ہو گئی اور شہر پٹنہ کے اندر سے گزرتے ہوئے مولوی ریاست علی سلمہ، کے مکان پر اور حکیم صاحب کے مطب میں اور شہر کے مشہور ڈاکٹر، ڈاکٹر عبد الحئی کے یہاں جواب ماشاء اللہ حاجی اور صاحب ریش بھی ہیں، سید نظیر حیدر ایڈیٹر "صدائے عام" اور ایک علیل صدق نواز انیس الحق فخر الدین کے ہاں کھڑی سواری حاضری دیتے ہوئے قبل مغرب گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے اور یہیں کچھ دیر بعد منسٹر شاہ محمد عزیز نے کرم فرمایا۔ کھانے کا وقت کا معمول ۸ بجے شب کا ہے لیکن واپسی کی گاڑی کا وقت چونکہ نو کے قریب تھا معزز میزبان نے مہمان کی سہولت کی خاطر آج کا کھانا ساڑھے ۷ پر ہی کر دیا۔ بہ اطمینان گفتگو کا ایک اور موقع مل گیا اس کے بعد ایک ڈرائنگ روم میں ساتھ ساتھ آ کر وہیں منسٹر صاحب کو اور میرے ملنے والوں کو بلا لیا

اور خود بھی بے تکلف شریک گفتگو ہو گئے۔ ٹھیک ۸ بجکر ۳۵ منٹ پر اے ڈی سی صاحب فوجی قاعدہ کے ساتھ آموجود ہوئے اور موٹر پر بیٹھ کر جب تک ہم لوگ روانہ نہ ہولئے گورنر صاحب سامنے کھڑے رہے...... "لاٹ صاحب" کے نام کے ساتھ کبھی یہ تخیل بھی وابستہ ہو سکتا تھا؟

پابندیٔ وقت کا نظم اس حد تک قائم رہا کہ عین جس وقت ہم لوگ ریل کے پل کے اوپر تھے نیچے گاڑی آتی ہوئی گزری۔ اے ڈی سی کی موجودگی میں جگہ ملنے میں کسی زحمت کا سوال ہی نہ تھا۔ اسٹیشن تک حکیم صاحب مولانا ریاست علی، شاہ عزیز، سید انوار احمد، جناب بیدل سب آئے۔ گاڑی چھوٹتے وقت بیدل صاحب نے ایک بند لفافہ دیا۔ آگے چل کر جو اسے کھولا تو اندر سے صدق کے ۵ خریداروں کا سالانہ چندہ بر آمد ہوا۔ میزبان کے ذاتی ملازم اسحاق کی سلیقہ مندی، تمیز داری، ذوق خدمت سے اس ڈھائی تین دن میں بڑی ہی راحت پہنچی۔ ان کے شکریہ کا کوئی اور موقع نہ ملا تو کم سے کم خاتمہ تو اسی ذکر خیر پر ہونا چاہئے۔

(صدق جدید اگست ۱۹۵۷ء)



بھوپال

دو دن بھوپال میں (۱۶؍مارچ ۱۹۷۳ء)

سفر خصوصاً دور کا سفر کرنے کی نوبت اب بہت ہی کم آتی ہے۔ پھر بھی سال میں اچھی خاصی آہی جاتی ہے اور ہر سفر سے کچھ نہ کچھ کام اور تجربہ کی باتیں بھی طالب علم کو ہاتھ آہی جاتی ہیں۔

فروری کا اخیر ہفتہ تھا کہ بھوپال سے مولانا محمد عمران خاں ندوی کے ایک عزیز خاص یہ پیام لے کر بھوپال سے دریاباد آئے کہ تاج المساجد کا شمالی دالان جو اخیر دسمبر ۱۹۷۱ء سے زیر تعمیر تھا اور جس کا سنگ بنیاد شیخ محمد یوسف نائب سفیر سعودی عرب اس وقت رکھ گئے تھے، اب تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ ۳؍اور ۴؍مارچ کو اس کے افتتاح کے لئے موجودہ سفیر سعودی عرب یوسف انس لیسین بھوپال میں موجود ہوں گے، دو دن کے لئے آجاؤ، اپنا پیغام لکھ کر لاؤ یہاں سنا دینا اور پھر تار بھی ایک نہیں دو دو اس مفہوم کے وارد ہو گئے۔

تاج المساجد کی وسعت و عظمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں، ہندوستان موجودہ کی سب سے بڑی اور عالی شان مسجد ہے یہاں تک کہ دہلی کی جامع مسجد اور حیدر آباد کی مکہ مسجد سے بھی بڑی۔

دالان ایک یا دو ہی نہیں، چار چار جن میں بارہ صفیں بآسانی آسکیں اور صحن تقریباً سوا تین سو فٹ کی لمبائی اور چوڑائی کا (نصف صحن ابھی ناتمام ہے) اور پھر درسگاہ بھی اس کے علاوہ، غرض یہ مسجد نام ہی کی نہیں واقعی ہندی مسجدوں کی سر تاج۔ داعی جلسہ خان صاحب کی شخصیت معمولی نہیں خصوصی بلکہ کہہ لیجئے کہ غیر معمولی، فرمائش کی تعمیل سے انکار نہ بن پڑا۔ سفر کا تصور ہی تکلیف دہ و وحشت انگیز ہوتا ہے، جسمانی و مادی حیثیتوں سے بار تو پڑتا ہی ہے معنوی و فکری زحمتیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر، لکھنے پڑھنے کا ہرج تمام تر، ڈاک کا انبار واپسی پر نپٹانا مستزاد۔ دعوت و داعی دونوں کی اہمیت

نے عذرات ساقط کر دیے۔

لکھنؤ سے روانگی صبح ۲؍مارچ کو ساڑھے سات بجے کو ہوئی۔ کانپور اور جھانسی، دو اسٹیشن بڑے پر تاثیر ثابت ہوتے ہیں۔ مرحومہ رفیق حیات کے وطن شہر باندا اور پھر مدفن کی راہیں انھیں دونوں مرکزی اسٹیشنوں سے جاتی ہیں۔ اب کیا بیان ہو (اور کسی کو اس کے سننے میں لطف ہی کیا آئے گا) کہ جب دونوں اسٹیشنوں سے گزرنا ہوتا ہے تو جذبات میں تلاطم کیسا برپا ہو جاتا ہے ۔

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کو پکار کر اور چیخ کر پڑھنے کے لئے دل کیسا تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

بھوپال مدفن خدا معلوم کتنے عالموں فاضلوں اور درویشوں کا ہے اور حال کے بزرگ شاہ محمد یعقوب مجددی نے تو واقعی اسے بھوپال شریف ہی بنا دیا تھا۔ بارہ گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ساڑھے ۸ بجے رات کو پہنچ گئے۔ دیکھا تو لینے والوں میں میزبان صاحب بھی ہیں۔ خوشگوار مسرت کے ساتھ سوال کیا کہ اس درجہ علالت اور بلڈ پریشر (فشار دم) کے مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود اسٹیشن آنے کی زحمت فرمائی۔ فرمایا بحمد اللہ اب اچھا ہوں۔

قیام بجائے خاں صاحب کے ذاتی مکان کے تاج المساجد کے مہمان خانہ میں رہا اور دن بھر ملنے ملانے میں گزرا، سفیر صاحب شہر کے اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ شامی الاصل انس یوسف یٰسین صاحب، جوان بلند قامت، عہدہ و منصب کے لحاظ سے انہیں "صاحب" ہونا ہی تھا لیکن بحمد اللہ کہ مسلم مجلسوں اور مجمعوں میں خالص عرب لباس پہن کر آئے اور باوجود اردو سے ناواقف ہونے کے ایک ایک سے جھک کر ملتے اور کہیں انگریزی سے کہیں عربی سے کام پوری طرح چلا لیتے۔ تواضع وانکسار اور خندہ جبینی سے دل ہر ایک کا موہ لیتے۔ مہمان ہو کر میزبان بھی بن جاتے اور عرب مہمان داری کے اقتضاء سے ہر ایک کو قہوہ پیش کرتے۔

سفارت کا عہدہ ایک نازک سیاسی عہدہ ہوتا ہے، اسلامی سلطنت کے نمائندہ کی

حیثیت سے ہاتھ اسلامی ہند کی نبض پر رکھنا اور زبان پر سیکولرزم کی مہر لگی رہنا، اسلامی اخوت اور سیاسی مصلحت سنجی کا آمیزہ ہر وقت بنے رہنا اور یہ کام ہر ایک کا ہو بھی نہیں سکتا۔

ہر ہوسنا کے نداند جام وسنداں باختن

گیارہ بجے مسجد کی زیارت کو آئے خوب گھومے پھرے اوپر نیچے ہر منزل کو دیکھا اور میزبان اپنی علالت کے باوجود ہر جگہ رفاقت کا حق ادا کرتے رہے۔

اپنے مخلص و عزیز متعدد بھوپال میں ہیں۔ کچھ ابکی نئے ملے۔ ایک مدرس دار العلوم مولوی شرافت علی بڑے صاحب فہم نکلے اور قاضی وجدی حسنی تو ہمدم قدیم تھے ہی۔ نواب صابر قلی خاں (والیٔ محمد گڑھ) اپنی وضعداری نباہتے ہوئے ملے۔ مولوی محمد مسلم "دعوت" دہلی کے ایڈیٹر کا وطن بھوپال ہے۔ ان کی لڑکی کا عقد بھی اتفاق سے اسی دن تھا۔ ان کے ساتھ وقت جتنا کٹا خوب کٹا اور مقامی صحافیوں الحمراء، افکار وغیرہ کے مالکوں نے بھی اس پردیسی کی خاطر داریوں اور عزت افزائیوں میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اردو ادبیات کے دو طالب علم ایک سیفیہ کالج کے عبد القوی دیسنوی اور ایک حمیدیہ گورنمنٹ کالج کے ابو محمد سحر تو ان سے بھی بڑھ کر اپنے لوگ نظر آئے...... باقی ایک بڑی جماعت حیدر آباد و مدراس کی طرح ایسے آنے والوں کی بھی ملی جو سرتاسر حسن عقیدت کا شکار اور غلو کے مارے ہوئے۔ آ کر جم جانے والے اور اس طرح مراقب سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے اور لب پر مہر لگائے جیسے میں کوئی شیخ وقت ہوں اور یہ مجھ سے درس سلوک، و معرفت کا لینے آئے ہیں۔ بارہا اسے صاف کر چکا ہوں اور آج ایک بار پھر اس کو صاف کر رہا ہوں کہ حسن ظن کی بھی ایک حد ہونا چاہئے۔ حلف شرعی کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نہ کوئی "عالم اجل" ہوں نہ کوئی پیر روشن ضمیر، محض ایک متعلم ہوں اور وہ بھی منتہی نہیں مبتدی قرآنیات کا اور اپنی زبان کے ادبیات کا، بڑا ہی شکر گزار اور احسان مند ہوں گا ان حاضر و غائب کرم فرماؤں کا جو مجھے اپنی جگہ پر رہنے دیں گے اور کسی خوش فہمی میں نہ خود مبتلا ہوں گے نہ کسی اور کو مبتلا کریں گے۔

سب سے زیادہ تاسف فوٹو گرافی کے زور پر رہا اور اس مہذب خبط پر بڑا ہی دل

کڑھا۔ بجائے خود یہ مرض اب نہیں کہاں ہے؟ لکھنؤ میں بھی خاصا زور ہے لیکن بھوپال کا نمبر اس سے کہیں بڑھا ہوا پایا۔ بعض بعض جلسوں میں ہر ہر منٹ پر ایک نئی تصویر کھنچتی یہ خوش تمیز تصویر اتارنے سے قبل نہ اجازت کی ضرورت سمجھتے اور نہ اطلاع کی۔ جان نہ پہچان ایک صاحب میرے کمرے میں گھس آئے اور قبل اس کے کہ میں ان کی آمد کی غرض سمجھ سکوں جھٹ فوٹو اُتار چلتے بنے۔ اس درجہ بے تکلفی، واللہ اعلم مغرب یا مشرق کہاں کی تہذیب ہے اور کمال یہ ہے کہ مسجد تک میں ذرا بھی اس سے احتیاط نہیں۔ فوٹو گرافی کے گناہ کبیرہ ہونے کا شاید میں خود بھی قائل نہیں لیکن بہر حال اس کا روادار نہیں کہ اسے ثقافت اسلامی کا جزو بنا لیا جائے یا اسے چائے پان، شربت کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔ حیرت اور ناگواری اس پر اور بھی ہوئی کہ اچھے اچھے اہل علم موجود تھے لیکن نرم لہجہ میں بھی منع کرنے پر قادر نہ تھے ...... اور کچھ ایسی ہی زیادتی کھڑے کھانے کی دیکھی۔ اگر مہمان کی خاطر اس درجہ میں بھی عزیز نہیں کہ اس کے مذاق طبیعت کو سمجھ لیا جائے تو اسے مدعو کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی! اب نام اس سلسلہ میں کس کس کے لئے جائیں۔

بیگم صاحب بھوپال (سابق ہر ہائی نس) نواب حمید اللہ خاں کی صاحبزادی (بیوہ نواب صاحب پٹودی) کے یہاں ۴؍ مارچ کی دوپہر کا لنچ ایک عبرتناک نظارہ تھا۔ بیگم صاحب سے ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں اس کی جوبلی کے موقع پر نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ بیوہ اس وقت بھی تھیں اور ریاست قبضہ سے نکل اس وقت بھی چکی تھی پھر بھی بداقبالی جب تک اس درجہ حاوی و مسلط نہیں ہوئی تھی اور اقبال کے لفظوں میں

...... پریدہ رنگ و رمیدہ بو

کا ظہور اس وقت اس درجہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ لق و دق ایوان شاہی میں سناٹا پڑا ہوا تھا، خیال تھا کہ دربان اور پہرہ دار قدم قدم پر ملیں گے، کوئی ایک بھی نہ ملا، البتہ ایک میجر فضل صاحب تھے جو شاید نواب صاحب کے زمانہ میں اے ڈی سی تھے، سابق ریاست د

امارت کی یادگار وہی ایک تھے ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

شاہی تکلفات کھانے میں اور کھانا کھلانے والے خادموں میں البتہ نمایاں تھے۔ مہمانوں میں میزبان سفیر صاحب کے مرتبہ کی مناسبت سے اونچے حکام بھی متعدد تھے۔ سننے میں آیا کہ والیان ریاست کے ساتھ جو بدعہدی گاندھی جی کے نام لیواؤں کی طرف سے ظاہر ہوئی اس سے ملول و شکستہ خاطر ہو کر اب بیگم صاحبہ قصر و ایوان فروخت کرنے والی ہیں اور پرانے سرکاری مہمان خانہ میں منتقل ہو رہی ہیں۔

کچھ اپنی کاہلی اور کچھ محض حسرت نصیبی کہ حضرت محمد یعقوب مجددی کے مزار تک اس بار رسائی نہ ہو پائی اور حاضری، ہونا کیا معنی وہاں کا خیال تک نہ آیا...... یہ کل کائنات تھی اپنی عقیدت مندی کی۔

دو دن اور تین راتیں گزار کے ۷؍ مارچ کو صبح ۶ بجے واپسی کے لئے ٹرین پر بیٹھا، خاں صاحب میزبانی کی دھن میں سخت سے سخت تعب برداشت کرتے رہے۔ بارہا لمبے اونچے زینوں پر چڑھتے اترتے اور ڈاکٹروں کی ہدایتوں کی مسلسل خلاف ورزی کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ کی شب میں انھیں سخت قسم کا دورۂ غشی پڑ گیا، ڈاکٹروں نے دیکھ کر کہا کہ خطرہ ٹل گیا ورنہ دورہ تھا بہت شدید قسم کا۔

مخلصوں میں سے دو صاحبوں کے نام چھوڑے جا رہا تھا اور یہ ان دونوں کے حق میں ناانصافی ہوتی۔ ایک تو آفتاب الدین صاحب پہلے اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں، دوسرے صاحب کا نام بڑے "سر مغزن" کے بعد اَب جا کر یاد پڑا۔ مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی ثم دیوبندی۔ یہ اب یہیں دارالعلوم میں مدرس ہیں اور صاحب علم ہیں۔ دونوں دن ملا کر کئی گھنٹے کی ہم نشینی رہی اور طبیعت پر ذرا بھی بار نہ پڑا۔ ایسے صاحب فہم ہم نشیں بس قسمت ہی سے ملتے ہیں۔

(صدق جدید ۱۶؍ مارچ ۱۹۷۳ء)

دکن! یعنی کیا؟

دکن سے مراد سمت جنوب نہیں مملکت دکن یا ریاست حیدر آباد ہوتی تھی۔ کان اس کے سننے کے، آنکھیں اس کے پڑھنے کی، دل اس کے سمجھنے کا عادی۔ جی نہیں مانتا کہ اس پرانی، محبوب دل پسند اصطلاح کو یکلخت چھوڑ دیجیے اور کسی نئی سیاسی، کسی نئی جغرافیائی اصطلاح کو زیب عنوان بنانے لگیے!

ایک تمنّا جو پوری ہوئی

زیارت حیدر آباد کی تمنا ایک آدھ سال سے نہیں برسوں سے چلی آ رہی تھی ...... اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانع قوی عزم میں حائل ہو تا گیا۔ آخری بار آمد ایک خانگی تقریب سے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ پورے ۲۵ سال بعد اکتوبر ۱۹۶۳ء میں خواب کو پورے ہونے کا موقع نکلا۔ درمیان میں ایک بار حاضری فروری ۱۹۵۸ء میں دن کے چند گھنٹوں کے لئے ہوئی تھی لیکن اسے حاضری کہنا ہی صحیح نہیں وہ تو مدراس سے لکھنؤ کی واپسی تھی براہ حیدر آباد اس لئے اس ذکر ہی کو سرے سے القط کیجئے۔ یہاں پہلی بار آنا بصد شوق واشتیاق ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا، سر رشتہ تالیف وترجمہ کے رکن کی حیثیت سے اور گویا گیارہ مہینے جم کر رہنا بھی ہوا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی ابھی باقاعدہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور بطور تمہید یہ نیا ادارہ سر اکبر حیدری، سر راس مسعود اور بابائے اُردو عبدالحق کی سرپرستی میں قائم ہو چکا تھا اس کے بعد بھی بارہا آنا ہوا اور ایک آدھ قیام بھی دنوں کا نہیں ہفتوں کا رہا۔ ۲۵ سال کا وقفہ کوئی معمولی ہوا ہے جوان بوڑھے ہو گئے اور جو ۴۶ سال کا ادھیڑ تھا وہ ۷۰، ۷۱ سال کی عمر کو پہنچ چکا!

آغاز سفر

تقریب سفر اب کی بھی بالکل خانگی ہی تھی، اور اب سفر عموماً نجی ہی کے ہوتے ہیں۔ قومی اور پبلک جلسوں میں شرکت کا معمول سالہا سال سے ترک ہے۔ "صدق" نوازوں اور دوسرے کرم فرماؤں کے خط پر خط اس ساری مدت میں برابر پہنچتے رہے کہ فلاں یوم منایا جا رہا ہے، فلاں کی سالگرہ ہے، فلاں کی برسی ہے، فلاں ادبی کنونشن ہے، فلاں دینی کانفرنس ہے اور کبھی کبھی تو دعوت نامے تار پر پہنچے اور خواہش ہوائی جہاز سے سفر کی کی گئی۔ فرمائش کرنے والے مخلصوں کو

بے خبر بود نداز حال دروں

کے مصداق اس کی کیا خبر کہ ان خطوط پر اصرار کرنے کا اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑا، بلکہ طبیعت میں انقباض ہی پیدا ہو کر رہا، یہ حضرات ذرا بھی غور نہیں کرتے کہ اگر ایک بار بھی کسی پبلک جلسے کے لئے قدم باہر نکالا تو پھر قومی و ملی جلسوں کی کوئی حد و نہایت ہے؟ ہر جلسہ اپنی جگہ اہم اور ضروری، وطن کی واپسی ہی دشوار ہو جائے گی اور "صدق" کا ہی نہیں، کہنا چاہئے کہ تحریر کا سارا ہی دفتر بند کر دینا ہو گا! تصنیف و تالیف کا کام ہمہ وقتی مطالعہ چاہتا ہے اور پورا سکونِ خاطر۔ سفر کی ناہمواریاں، خلقت کا ہجوم، تقریری ہیجان یہ سب اس کے لئے جو گویا اب مقصد حیات بن چکا ہے، زہر قاتل! کسی بزرگ کی زیارت کرنی ہوئی یا کسی عزیز کی عیادت، یا کسی محدود اور چھوٹی سی کمیٹی میں شرکت، بس یہی لے دے کے دو ایک صورتیں ہیں جو اس ترک سفر کے عہد میں استثنا کی گنجائش پیدا کر سکتی ہیں...... تقدیر الٰہی نے ایسی ہی ایک صورت اخیر ستمبر میں پیدا کر دی اور ڈھائی ہفتہ کا پروگرام بنا۔ ۲۷ ستمبر کو صبح سویرے لکھنؤ سے حیدر آباد کے لئے رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْنِیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا پڑھتا ہوا ریل کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ گھوڑے پر کہ وہی ایک زمانہ میں بہترین سواری تھی، سوار ہوتے وقت تک کی دعا ماثور کتابوں میں یہ آیت قرآنی

پڑھی تھی:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے تابع کر دیا اس (سواری)
کو ورنہ ہم تو ایسے تھے نہیں کہ ہم قابو میں کر لیتے اس کو۔

اور گھوڑے کی تسخیر سے کہیں بڑا اعجوبہ تو ریل اور انجن کی تسخیر ہے اور گھوڑے کی سواری پر یہ آیت کا محل اگر ایک بار پڑھنے کا تھا تو ریل پر پڑھنے کا تو بار بار۔

افسوس ہے (اور حیرت بھی) کہ ملک کے دو ایسے اہم صوبائی دار الحکومتوں کے درمیان جیسے کہ حیدر آباد اور لکھنؤ ہیں، کوئی سیدھا اور براہ راست ریلوے رابطہ نہیں۔ دہلی سے آگرہ جھانسی ہوتے جو سیدھی ٹرین (جی ٹی ایکسپریس) مدراس کو جاتی ہے اس میں دو سیدھی بوگیاں حیدر آباد کے لئے ہوتی ہیں۔ جو قاضی پیٹ میں کاٹ کر حیدر آباد کی ٹرین سے جوڑ دی جاتی ہیں، لیکن اس سے لکھنؤ والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ انھیں وہ سیدھی حیدر آباد والی بوگیاں کہیں جھانسی پہنچ کر ملتی ہیں اور وہاں وہ گاڑی رات کو بہت ہی ناوقت ملتی ہے۔ اس وقت گاڑی بدلنا ٹکٹ خواہ کسی درجہ کا ہو، بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس لئے لکھنؤ والے اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ بمبئی والی گاڑی پر لکھنؤ سے سیدھے اٹارسی چلے جائیں اور وہاں سے دن کے وقت حیدر آباد والی گاڑی پر بیٹھیں۔ اپنے کو مناسب یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے صبح سویرے بمبئی والی گاڑی میں چل کر ۸ر بجے شب کے بعد بھوپال اُتر لیا جائے۔ اور رات بھر وہاں رہ کر صبح سویرے حیدر آبادی بوگی میں بیٹھ کر روانہ ہو جایئے۔ بھوپال جنکشن کے ویٹنگ روم، ریٹائرنگ روم، خوب گنجائشی اور جاذب نظر پھر اپنے دو ایک ذی اثر عزیز بھی وہاں موجود، اور سب سے بڑھ کر مولانا عمران خان ندوی، مہمان داری کے لئے موجود ہی نہیں، میزبانی کے لئے ہر وقت مستعد و کمربستہ۔ رائے یہی طے پا گئی اور مکین کے مکان موسوم بہ "غریب خانہ" کو اپنا "کاشانۂ شب یارین بسیرا" تجویز کر لیا۔

غریب خانہ

۲۷ر کو عشاء کا وقت ہو چکا تھا کہ بمبئی میل بھوپال اسٹیشن میں داخل ہوا۔ پلیٹ فارم پر خان صاحب مع اپنے خدم و حشم کے نظر پڑ گئے۔ ہاتھوں ہاتھ سامان اتروا ایک بڑی سی جیپ گاڑی پر بٹھا، بات کی بات میں اپنے غریب خانہ پہنچا دیا۔ غریب خانہ کے نام سے تخیل کیا ذہن میں آتا ہے؟ یہی نہ کہ تنگ سا ایک آدھ حجرہ، پست سا برآمدہ، دروازے نیچے، انگنائی چھوٹی، زمین میں سیلن، بشری ضرورتوں کی جگہیں تاریک اور غلیظ اور عجب نہیں کہ جائے وقوع ایسی گلی در گلی ہو کہ وہاں تک سواری پہنچنا دشوار۔ غرض یہ کہ وہاں کا قیام درویشوں اور زاہدوں کے لئے کیسی ہی ایک نعمت ہو لیکن ہم تن پروروں کے لئے خود ایک مجاہدہ۔ تخیلات کچھ اسی قسم کے تھے کہ جیپ کار کھٹ سے عین دروازے کے سامنے آ رکی اور اب جو اُتر کر دیکھا تو "غریب خانہ" کے در و دیوار تک بجلی کی روشنی سے جھلا جھل، خاصا صحن، خاصا برآمدہ، خاصا کمرہ، پر تکلف اُجلا برف فرش، بستر مکلف گدے دار، تخت وسیع جانماز و سوزنی سے لیس، حمام اور فلش والے بیت الخلاء تک جگمگ کرتے ہوئے، چپل چٹی، پانی تولیا، صابن ضرورت کی چھوٹی بڑی ہر چیز سے آراستہ پورا مکان، صفائی کے لحاظ سے آئینہ اور سلیقہ مندی کے لحاظ سے مکین کے حسن انتظام کا آئینہ دار!

گویا جہاں تک مہمان کی راحت رسانی کے جزئیات کا تعلق ہے، یہ ندوی و مصری فاضل اگر سمت علوی کی طرف جایئے تو حکیم الامت تھانویؒ کے مدرسہ میں پڑھے ہوئے، اگر نظر سمت سفلی تک محدود رکھئے تو یوں کہئے کہ کسی اعلیٰ ہوٹل والے کے یہاں تربیت پائے ہوئے۔ تخیل اور واقعہ میں یہ زمین و آسمان کی نسبت دیکھ، زبان سے اور کچھ تو نہ نکلا سوائے حیرت کے لہجہ میں دہرائے ہوئے اس فقرے کے کہ "یہی غریب خانہ" ہے! اور دل یہ کہہ کر رہ گیا کہ تواضع و انکسار کے سیاق میں کیسے کیسے ثقہ حضرات تک بھی شاعری سے نہیں چوکتے!

اسلامیت کے نقش ونگار

بھوپال کل تک ایک اسلامی ریاست تھی، حیدر آباد کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کا بہت بڑا سہارا، خاص شہر کی اسلامی، دینی علوم کی قدردانی، مسجدوں کی رونق، اسلامی عدالتِ قضا، خیر خیرات بندہ نوازی و یتیم پروری سے قطع نظر، باہر بھی چشمہ فیض کس زور شور سے جاری تھا۔ علی گڑھ، ندوہ وغیرہ ملک کے طول و عرض میں بیسیوں دینی و دنیوی درسگاہوں پر ابر کرم کس طرح جھوم جھوم کر برس رہا تھا۔ کتنے خاندانوں کی پرورش ہو رہی تھی، کتنوں کی پنشنیں اور وظیفے جاری تھے اور آہ آج اسلامیت کے وہ نقش و نگار کہاں سے ڈھونڈ کر لائے اور نکالے جائیں۔ دماغ میں ان خیالات کا گونجنا قدرتی تھا، ابھی نماز فجر میں کچھ دیر تھی کہ میزبان چائے اور ناشتہ سمیت موجود! اور دم بھر میں اسٹیشن!

مسلمانوں کے جاہ وجلال کی آخری یادگار!

راستے کے رنگ برنگ منظر بھوپال ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ دل لبھانے والے بھی اور خوف و دہشت پیدا کرنے والے بھی، زمانے کے نشیب و فراز کی ہو بہو تصویر! اٹارسی آیا، ناگپور گزرا، اور سہ پہر کو واردھا سے گزرنا ہوا۔ یہاں سے گاڑی کا رخ الٹا ہو گیا یعنی بجائے مغرب کے مشرق کی طرف چلی۔ یاد پڑا کہ گاندھی جی کی راجدھانی مدتوں یہی شہر واردھا رہا ہے۔ برسوں ہندوستان کی قسمت کے فیصلے یہیں سے صادر ہوتے رہے ہیں اور سیاسیات آزادی کا رخ یہیں سے پھرا ہے۔ حق ہے کہ اسی شہر کو شمال سے جنوب کے سفر کرنے کا رخ متعین کرنے کا حق حاصل رہا! فجر کا وقت سکندر آباد میں آیا اور مرحوم مملکتِ محروسہ سرکار نظام، کے حدود رات ہی میں کسی وقت شروع ہو چکے تھے۔ مرحوم و مغفور سلطنت! ہندوستان میں مسلمانوں کے دور اقبال اور مسلمانوں کے جاہ و جلال کی آخری یادگار! مٹنا اگر مقدر ہو ہی چکا تھا، تو کاش تمام ترغیروں ہی کے

ہاتھ سے مٹی ہوتی اور کوئی دخل اس میں اپنوں سے بعض کی نادانی، بے راہروی، ناعاقبت اندیشی اور بعض کے جبن و بزدلی کو نہ ہوتا!

خوشگوار یادیں

شہر و سلطنت دونوں سے کیسی خوشگوار و کتنی قدیم یادیں وابستہ تھیں، پہلی آمد ۱۹۱۷ء میں اپنی عین جوانی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ کن کن ولولوں، کن کن حوصلوں، کن کن آرزوؤں اور تمناؤں سے! اور پھر کیسی کیسی صحبتیں بھی یہاں نصیب ہوئی تھیں۔ اب وہ سارے ارمان اور سارا ساز و سامان ایک خواب و خیال! بابائے اردو عبدالحق، مہاراجہ سر کشن پرشاد، سر افسر الملک، سر امین جنگ، مسعود جنگ، عماد الملک، مسز نائیڈو، مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی، امین الحسن بسمل موہانی، سید عبدالمجید دہلوی اور جلیل القدر فصاحت جنگ جلیل، اختر یار جنگ، اکبر یار جنگ، صدر یار جنگ اور کتنے مختلف بزرگ و اعزہ و احباب سب پیوند خاک ہو چکے! بلکہ ان میں سے اکثر کے تو نام و نشان تک مٹ چکے ہیں۔ بقول شخصے ؎

اب نہ خود ہیں نہ ہیں مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

اب لے دے کے پرانے عزیزوں میں ایک نواب ناظر یار جنگ (پنشنر جج ہائیکورٹ) باقی رہ گئے ہیں کہ انھیں کے خاندان کی کشش اس سفر پر لائی اور انھیں کی "منزل عدل" (حیدر گوڑہ) میں فروکش ہونا مقصود ہے۔ اور ہاں بہت سے نئے مخلصین کی جو اس درمیان میں آکر اس سرزمین رس بس گئے ہیں، اور ان کے علاوہ شخصاً اجنبی صدق نوازوں کی ایک انبوہ در انبوہ تعداد جو محض اللہ کے واسطے، بلا کسی ذاتی غرض کے اپنے حسن ظن سے کام لئے ہوئے اس بے مایہ کے ساتھ رشتہ جوڑے ہوئے اور رابطۂ اخلاص و مودت قائم کئے ہوئے...... حقیقت کے اعتبار سے یہ کیسے ہی دھوکے میں پڑے ہوں اور کیسی ہی سادہ دلی سے پیتل کو سونا سمجھ لینے میں مبتلا، بہر حال اجر تو

اخلاص وخوش ظنی ہی کے تناسب سے ملتا ہے۔ اور لیجئے جو گزر چکے (مَنْ قَضٰی نَحْبَهٗ) ان کے مزار اور تربتیں تو ابھی فنا نہیں ہوئی ہیں۔ ان خاک کے ڈھیروں پر حاضری تو زندوں کے ملنے جلنے سے بھی مقدم ہے۔

بہادر سردار

اور دکن پہنچتے ہی پہلا پروگرام ان مرحوم مخلصوں، محسنوں، بزرگوں، عزیزوں رفیقوں کی خاکی آرام گاہوں پر حاضری کا تھا، اور سب سے پہلا قدم جو اس سلسلے میں اٹھا وہ بہادر یار جنگ رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کی طرف! کیا شخصیت تھی اور کیا شخص تھا۔ اب ناواقفوں کو کیا بتایا جائے۔ اور جو واقف ہیں انھیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ دین وملت کے لئے ساری زندگی وقف کیے ہوئے اور پھر جوش کے ساتھ ہوش کا غیر معمولی وعدیم النظیر اجتماع! حیدر آباد کی مسلم اور نیم اسلامی سلطنت کا وجود ہی مشیت ربانی کو منظور نہ تھا کہ ایسے کلے ٹھلے کے توانا و تندرست کو یک بیک ایسے سن میں اٹھالیا جبکہ کہنا چاہئے کہ وہ جوان ہی تھے ورنہ اس افراتفری اور اس ہولناک بربادی کی نوبت ہی کیوں آنے پاتی! بہر حال ایک نیم رہنما کی رہبری میں بڑی مسافت طے کر، اس حظیرہ تک رسائی ہوئی جس کے اندر اس شہید حق پرستی کا جسد خاکی آسودہ ہے۔ دروازہ مقفل تھا، اس لئے صرف جالیوں سے اندر کا کچھ نظارہ ہو سکا۔ قلب نے لطافت وحلاوت کے ساتھ ساتھ شاہانہ وقار وہیبت کی بھی کیفیت محسوس کی۔ فاتحہ پڑھا، اور فاتحہ کیا پڑھا، یہ کہئے کہ درد دل کی کچھ تھوڑی سی داستان دہرادی، عرض ومعروض عالم تخیل میں کچھ اس قسم کی رہی:

"بہادر سردار! عین ایسے نازک وقت اپنی خستہ قوم وملت کو بے سہارا چھوڑ کر کہاں، چلے گئے۔ یہی تو خاص وقت مخلصانہ، حکیمانہ، دلیرانہ رہنمائی کا تھا۔ ہمارا حقیقی رہنما تو وہ تھا جو ہمیں سبق جنگ بدر اور صلح حدیبیہ دونوں کے دے گیا۔ تم اس ہادیٔ بے خطا کے نقش قدم پر چلنا، اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھے ہوئے تھے۔ تم

ہوتے تو اپنی مومنانہ فراست سے ادھر حیدر آباد کو سنبھالے رہتے، اور اُدھر مسلم لیگ کے بھی بہترین مشیر ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو بھی ابتری کی راہ پر نہ پڑنے دیتے، لیکن خدائے بے نیاز سے کس کو مجال گلہ وشکوہ کہ عین وقت پر تمھیں کو اٹھالیا! اپنی ملت کی پستی ومذلت کو یقیناً وہاں بھی نہ بھولے ہو گے، خون کے آنسو اس کے حال زار پر بہا رہے ہو گے۔ اور جنت برزخی کی ساری نعمتوں، راحتوں، لذتوں کے باوجود یہ کانٹا دل میں برابر کھٹک ہی رہا ہو گا"۔

مرحوم کی خوش روئی اور خوش خوئی کی تصویر دیر تک نظر کے سامنے رہی۔

ادائے تعزیت میں مرحوم کی ڈیوڑھی پر بھی حاضری ضروری تھی، گیا اور ڈیوڑھی کی سادہ آرائش کو اسی طرح پایا جس طرح ۱۹۳۸ء میں مرحوم کی زندگی میں ان کے ساتھ کھانا کھانے میں دیکھا تھا۔ کھانے پینے کی خاطر داریوں میں بیگم نے اپنے مرحوم شوہر کی یاد تازہ کر دی، اور گفتگو میں اسی ایمانی صلاحیت کا ثبوت دیا جس کی توقع ایسے مرد مومن کی رفیق زندگی ہی سے کی جا سکتی تھی۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی ماندور خاں صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے، عین میری روانگی کے دن آئے اور بڑی محبت سے سہ پہر کو اپنی نئی کوٹھی میں چائے، زبردست ناشتہ کے ساتھ پلائی۔

مخلصین

زیارت قبور کے سلسلے میں دوسرا نمبر ایک عزیز، مخلص دوست سید احمد محی الدین بی اے (علیگ) کا تھا۔ حیدر آباد میں اردو صحافت میرے زمانے تک (یعنی سنہ ۱۷ و سنہ ۱۸ء میں) بالکل پرانے قسم کی تھی۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ کی صحافت کا پرتو بھی وہاں نہیں پڑا تھا۔ محی الدین حیدر آبادی جب علی گڑھ سے گریجویٹ ہو کر آئے تو انھوں نے ہمت اور اپج سے کام لے کر ایک بالکل نئی راہ اپنے ملک وملت کے لئے مملکت آصفی کی سرکاری زبان اُردو میں کھول دی۔ رہبر دکن پوری شان سے نکلا کہ چند ہی روز میں اس نے ملک بھر میں دھوم مچادی۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان اور دکن کے فرق

کواس نے توڑااور اپنی اسلامیت، انفرادیت اور صحافی ذمہ داری کا نقش دلوں پر بٹھادیا۔ بہادر یار جنگ مرحوم کی طرح ان کا بھی ابھی سن ہی کیا تھا کہ دفعتہً اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پتہ لگا کر (اور اس پتہ لگانے میں کوئی مدد ان کے وارثوں سے نہ مل سکی) ان کے قبرستان تک پہنچا اور حسرت و تاثر کے ساتھ ان کی تربت پر بھی فاتحہ پڑھا۔ آج زندہ ہوتے تو میری آمد سے کس درجہ خوش ہوتے اور کس کس طرح میری خاطر مدارات میں لگ جاتے۔ "صدق" اور مدیر "صدق" کی جو بے پناہ محبت اہل حیدر آباد کے دلوں میں ہے کون بتا سکتا ہے کہ اس میں کتنا بڑا ہاتھ مرحوم احمد محی الدین کی مخلصانہ کوشش کو ہے۔ ان کے کتبۂ مزار کے ساتھ ان کے بعض عزیزوں مثلاً ان کے بھائی عارف الدین مرحوم انجینئر کے کتبوں پر بھی نظر پڑ گئی اور دل سے دعائے خیر ان کے حق میں بھی نکلی۔

ان دو ایک شخصیتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد میرے ذاتی ملاقاتیوں، عزیزوں، مخلصوں کی تھی جو اَب مرحومین میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس طبقہ میں سب سے پہلا نمبر مولوی سید امین الحسن بسملؔ موہانی مرحوم کا آتا ہے۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں جب سب سے پہلی بار میں حیدر آباد آیا ہوں تو یہاں کے طور طریقوں سے اجنبی محض تھا اور اپنی ذات سے شرمیلا اور خشک مزاج بھی تھا، تو یہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اسٹیٹ کے ناظم تھے، مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، دو چار دن نہیں ہفتوں اپنا مہمان عزیز بنائے رکھا اور میزبانی کے فریضے بڑی اولوالعزمی سے ادا کرتے رہے، اس کے بعد بھی برسوں یہی معمول رہا کہ جب بھی میں حیدر آباد آیا، ان کا گھر مستقل مہمان خانہ بنا رہا۔ بڑے ذہین، بڑے زندہ دل، بڑے سخن فہم بذلہ سنج، نکتہ رس و صاحب علم تھے۔ اور شاعری میں غالباً داغؔ کے شاگرد تھے۔ حسرت موہانی کے ہم وطن ہی نہیں عزیز قریب بھی تھے۔ بیعت ارادات سلسلہ قادریہ خاندان فرنگی محل اور خانوادہ رزاقیہ (بانسہ مضافات دریاباد) سے تھی، اس لئے میرا لحاظ زیادہ کرتے تھے۔ اور مجھے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ شرافت اسلامی و مشرقی کے مجسمہ تھے۔ آخری بار ملاقات ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت بلدہ میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔ ابھی پنشن بھی نہیں لینے پائے تھے کہ

بلڈ پریشر کے ایک حملہ سے نذر اجل ہو گئے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی تربت تک بھی رسائی ہو گئی۔ اور دل ان کے اخلاص و وفا پر آنسو بہا کر چلا آیا۔ مرحوم عزیزوں مخلصوں کی تعداد بہت بڑی تھی حاجی محمد یوسف رزاقی قادری دریابادی عزیز قریب تھے ان کے علاوہ مولوی علی الدین حسن پنشنر ناظم عدالت اختریار جنگ، (ناظم محکمہ امور مذہبی) اکبر یار جنگ (جج ہائیکورٹ) مولوی غلام یزدانی (ناظم آثار قدیمہ) نواب عماد الملک، سر امین جنگ، مرزا محمد ہادی لکھنوی، مرزا رسوا، زور حیدر آبادی وغیرہم سب کے نام نہ اس وقت یاد پڑے نہ اب فوراً یاد آرہے ہیں۔ درگاہ حضرت خاموشؒ اور جن جن قبرستانوں تک رسائی ہو سکی سب کے مزارات پر حاضری دے لی اور اس کار اہم سے فراغت پہلے ہی دن کر لی۔

فاضل گیلانی مولانا مناظر احسن صاحب کا مزار یہاں نہیں۔ ان کے وطن موضع گیلانی (بہار) میں ہے۔ اور مولانا عبد الباری ندوی تو اللہ ان کی عمر میں بہت برکت دے، ابھی ماشاء اللہ ہم ناسوتیوں ہی کے درمیان لکھنؤ میں ہیں۔ پھر بھی یہاں آکر ان دونوں یاران قدیم کی یاد تازہ ہو جانا بالکل قدرتی تھا۔ دونوں ایک ہی مکان میں عابد روڈ پر رہتے تھے اور مجھے ان کی مہمانی کا بھی شرف ۱۹۲۷ء میں حاصل رہ چکا تھا۔ ان کے بغیر شہر کچھ ویران سا نظر آیا حالانکہ یہ بھی نفس کا دھوکہ ہے۔ اللہ کی آبادی کہیں کسی کے اُٹھ جانے سے ویران ہوتی ہے ؎

ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی

ایک جاتا تو دو اس کی جگہ آجاتے ہیں۔ نظام تکوینی یوں ہی بھرا پُرا چلا آرہا ہے۔ اور دنیا اپنے رب جلیل و قدیر کے امر عظیم کی تعمیل میں خاموشی کے ساتھ یوں ہی جلاتی، مارتی، پیدا کرتی، فنا کرتی، اٹھاتی، گراتی، پست کو بلند، بلند کو پست کرتی، ہنساتی، رلاتی، بڑھاتی، گھٹاتی، مٹاتی، دفناتی، بناتی بگاڑتی، اچھالتی، ٹھکراتی چلی آرہی ہے۔ بقول حکیم عارف اکبر الہ آبادی ؎

دنیا یوں ہی ناشادیوں میں شاد رہے گی | برباد کئے جائے گی آباد رہے گی

ہاں لیجئے ایک نام تو رہا ہی جاتا ہے۔ اس وقت بھی قریب تھا کہ رہ جائے تلاش میں غیر معمولی سرگردانی اٹھانا پڑی۔ یہاں کے ایک بڑے پرانے ملنے والوں میں یعنی ۱۹۱۷ء کے زمانے کے ہوش بلگرامی تھے۔ ایڈیٹر "ذخیرہ" یہ ماہنامہ تو کچھ ہی روز بعد عتاب شاہی میں آکر بند ہوگیا۔ اور ہوش صاحب کو اکبارگی حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ ہوش اُڑ کر بھوپال پہنچے اور شاید کسی اور ریاست میں بھی رہے آخر رام پور جا کر دم لیا۔ مجھ سے دوستانہ محبتانہ تعلقات گردش ایام کے ہر دور میں قائم رہے۔

سیاسی، دینی، اخلاقی تصورات میں مجھ سے بہت دور تھے۔ اور مزاج وطبیعت میں بھی بہت الگ، لیکن اس سب کے باوجود رشتہ انس و مودت مجھ سے قائم رکھے ہوئے۔ اور آخر آخر تو میرے مخلص ہی نہیں محسن بھی ہوگئے۔ حیدر آباد جب کئی سال کے بعد دوبارہ آئے اور یہاں ہوش یار جنگ بن کر پورے عروج پر پہنچے تو جہاں تک مادی ومالی نفع پہنچانے کا تعلق ہے، میرا ہر موقع پر لحاظ رکھنے لگے۔ ایسا کہ مجھے شرمندہ ہو ہو جانا پڑا اور ایسا ہی رابطہ اخلاص ان کا میں نے اپنے محترم ومخدوم دوست اور بزرگ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ بھی دیکھا بلکہ یہی ربط اس سے ہلکے درجے میں اپنے ایک دوسرے مخدوم ومحترم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے ساتھ بھی پایا۔ حیرت ہوتی رہی لیکن بہر حال واقعیت اپنی جگہ پر رہی۔ ان کی شائع شدہ بعض تحریروں سے مجھے تکلیف بھی اچھی خاصی ہوئی لیکن میری ذات کے ساتھ ان کی وابستگی میں ذرا فرق نہ آیا۔ لکھنؤ اپنے دورِ عروج میں دوبار آئے ایک بار کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے اور ایک بار نیاز فتح پوری ایڈیٹر نگار کے ہاں۔ دونوں بار مجھ سے ملنے اس طرح آئے جیسے کوئی اپنے عزیز قریب کے ہاں جاتا ہے۔ اور دونوں بار میرے نواسوں، نواسیوں سے اس طرح پیش آئے جیسے وہ خود انھیں کی نواسیاں نواسے تھے۔ بہر حال ان کا قرض مجھ پر واجب تھا۔ بڑی ہی جستجو کے بعد ان کی تربت کا پتہ چلا۔ قطبی گوڑہ کے ایک قبرستان میں ملی، جو شیعہ سنیوں کا مشترک ہے وہاں جا کر فاتحہ پڑھی اور عرض معروض کچھ اس طرح پر کی:

"بار الٰہا آپ کے اس بندے کے اور جو کچھ اعمال واحوال ہوں، وہ تو آپ ہی پر خوب روشن ہیں میں حال اپنے سابقہ کا جانتا ہوں۔ میرا تو یہ شخص پورا مخلص بلکہ محسن تھا اور آپ کے بعض نیک ومقبول بندوں کے سابقہ میں بھی میں نے اسے سراپا اخلاص پایا۔ اس کی شہادت دیتا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ اپنی کریمی کے صدقہ میں اس کے ساتھ معاملہ تمام تر عفو وفضل کا فرمایا جائے۔ اور اس کے حسنات کو اس کی کمزوریوں کا کفارہ اور شفیع قرار دے دیا جائے۔ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْم۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

قدیم حیدر آباد، جدید حیدر آباد

ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ صحابی کے حوالہ سے آتا ہے

عن ابی هریرة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا تقوم الساعة حتی یتطاول الناس فی البنیان.

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک لوگ بلند وبالا عمارتیں نہ بنانے لگیں۔

اور یہی نہیں کہ قرب قیامت کے زمانے میں جسے عین ترقی وتمدن کا زمانہ سمجھا جائے گا، بڑی عالی شان عمارتوں کی کثرت ہوگی، انھیں داخل فیشن سمجھا جانے لگے گا بلکہ یہ عالی شان عمارتیں طرح طرح سے آراستہ ومنقش بھی ہوں گی۔ انھیں صحابی ابو ہریرہؓ کی سند سے اس کتاب میں امام بخاریؒ نے یہ روایت بھی درج کی ہے

عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لا تقوم الساعة حتی بنی الناس بیوتا یشبهونها بالمراجل .

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک

نہ آئے گی جب تک لوگ ایسے مکان نہ بنانے لگیں جنھیں وہ رنگین چادروں سے مشابہ کردیں گے۔

اور روایتیں بھی اسی مضمون سے ملتی جلتی ہیں۔ گویا پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ کشفی سے صریحاً دیکھ لیا تھا کہ آخر زمانہ میں عالی شان، رنگین و آراستہ عمارتوں کی بڑی کثرت ہوگی اور اسے عین دلیل ترقی اور تمدن کی سمجھا جائے گا۔ بات غلط کیسے ہو سکتی تھی۔ دوسرے دولت مند و خوشحال ملکوں کا ذکر نہیں اپنے ہی مفلس ملک کو دیکھ لیجئے کس سرعت اور کس کثرت کے ساتھ ہر جگہ نئی نئی عالی شان، دیدہ زیب سربفلک کوٹھیاں، کچہریاں، دفتر، ہوٹل، ہر ہر شہر بلکہ قصبات تک میں گرانی و مفلسی کے واویلا کے باوجود ابھر رہے ہیں، نکھر رہے ہیں "تعمیری پروگرام" کا گویا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اپنے مجازی معنی میں نہیں لفظی معنی میں!

حیدر آباد اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ کیوں اور کیونکر رہ سکتا تھا؟ قدیم حیدر آباد سلطنت آصفیہ کی حسرت نصیب یادگار بے شک مٹ چکا، لیکن جدید حیدر آباد بھی انڈین یونین کی اقبال مندی اور فیروز بختی کا پرچم لہراتا ہوا وجود میں آگیا ہے، بیسیوں محل اور حویلیاں جہاں اجڑی ہوئی، لٹی ہوئی، گری ہوئی، گری پڑی، ٹوٹی پھوٹی دکھائی دیں وہیں پچاسوں نئی کوٹھیاں نئے بنگلے ہوٹل اور سینما گھر، کالج اور ہسپتال، یہ دفتر اور وہ دفتر، جدت اور تازگی سرسبزی شادابی کا حق ادا کرتے ہوئے بھی نظروں کے سامنے آگئے! تخریب و تعمیر کی یہ دوگونہ نیرنگیاں، نیرنگ ساز فطرت کے ہر آنی کرشموں میں سے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو

اُردو کے ایک قدیم خادم کی حیثیت سے نظر اپنے رنگ و مذاق کے اداروں اور عمارتوں پر پڑنا بالکل قدرتی تھا۔ گو اپنے وطن یوپی میں اُردو کی بے خانمائی کا حال دیکھ کر اس طرف سے مایوسی تھی اور کسی سے اُردو کا پتہ نشان پوچھنے کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی

تھی اور اسٹیشن کی عمارت اور دفتروں کا منظر خود اسی مایوسی کو اور گہرا کرنے والا تھا۔ وہی تار گھر، اسٹیشن ماسٹر ویٹنگ روم، مسافر خانہ وغیرہ کی عام فہم ناموں کی تختیاں سب غائب اور ان کے بجائے نامانوس اور تمام تر ناگری رسم الخط میں گدے ہوئے، لیکن اسٹیشن سے باہر شہر کی عام آبادی میں قدم رکھتے ہی یاس کی گہری تاریکی دور ہونے لگی، اور امید کی کرنیں کسی درجہ میں نظر آنے لگیں۔ دکانوں، ہوٹلوں، مکانوں، چائے خانوں یہاں تک کہ سرکاری دفتروں کے بھی سائن بورڈوں پر اردو حروف دکھائی دیئے۔ اور کارپوریشن کی طرف سے سڑکوں پر جو مختصر ہدایتیں لکھی رہتی ہیں، وہ بھی اردو میں نظر آئیں اور دل نے کسی قدر اطمینان کا سانس لے کر کہا کہ بحمد اللہ یہاں اردو سے وہ بیزاری اردو کے نام سے وہ تعصب نہیں جو ہمارے اتر پردیش کا حصہ ہو گیا ہے! نام کی کشش جب ادارۂ ادبیات اُردو تک لے گئی، تو ایوانِ اُردو کو نام کا نہیں، واقعی ایوانِ اُردو ہی پایا۔ عمارت کے ظاہری حسن و جمال، وسعت و طول و عرض سے قطع نظر جب عمارت کے اندر قدم رکھا، اور چل پھر کر، اِدھر اُدھر اوپر اور نیچے دیکھنا شروع کیا تو شان خدا نظر آئی۔ میوزیم اور لائبریری، آڈیٹوریم اور پکچر گیلری سب ہی کچھ اس ایک ایوان کے اندر جمع!...... اللہ اکبر، اپنی اُردو کی بھی یہ شان! قلمی کتابوں، نادر مخطوطوں کا پورا ذخیرہ فراہم، ریسرچ اسکالر (طلبہ برائے تحقیق فن) آئیں تو اپنے کام کے لئے مدتوں قیام کا سامان پائیں۔ ان کے رہنے، ٹھہرنے کا انتظام بھی معقول اسی عمارت کے اندر موجود۔ یوپی والے اُردو دشمنی کے مارے ہوئے غریب، دکن میں اُردو کے اس مان دان کو سن پائیں تو خوشی سے پھولے نہ سمائیں، بلکہ عجب نہیں جو مسرت کے ساتھ جذبۂ رشک بھی اپنے سینے میں موجزن پائیں۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں مرحومین متقدمین کے علاوہ معاصرین تک چھوٹے بڑوں کی محفوظ، یہاں تک کہ مدیر "صدق" کے بدخط و خام نویس کی بھی! سچ یہ ہے کہ اس احاطہ کے اندر آکر یہ بھی یاد نہیں رہ جاتا کہ اُردو کوئی مظلوم زبان اور ناقدری اور کسمپرسی کی شکار ہے یا یہ کہ کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے یا نیچے ہے!...... اللہ نے خلوص میں بڑی برکت رکھی ہے۔ ڈاکٹر

زور مرحوم اُردو کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ نے ان کی کوششوں کو کامیابی وسرسبزی کا یہ مرتبہ عنایت کیا اور بابائے اُردو کا صحیح جانشین بلکہ یوں کہئے کہ بابائے اُردو ثانی بنادیا۔

اسی ادارے کے ایک گوشے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار میں آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ ہے۔ اور اس ادارہ کے دوسرگرم کارکن پروفیسر علی اکبر اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی ہیں۔ دونوں صاحب قلم اُردو ہی کے نہیں انگریزی کے بھی۔ صدیقی صاحب تاریخ کے استاد رہ چکے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ ادارہ کے ارکان انتظامی میں کئی ہندو صاحبان بھی شریک ہیں۔

انجمن ترقی اُردو حیدرآباد اور دیگر ادارے

اردو کے قدم دکن میں جمائے رکھنے کا سہرا تمام تر انجمن ادبیات اردو ہی کے سر نہیں ایک دوسرا ادارہ بھی اس فخر میں برابر کا شریک وسہیم ہے۔ اور اس کا نام انجمن ترقی اردو حیدرآباد ہے۔ بلکہ علمی، تحقیقی قدروں کا حصہ ادارہ ادبیات کے لئے چھوڑ کر اردو کی چلتو اور روزمرہ کی ضرورتوں کا جہاں تک تعلق ہے، انجمن کی کارگزاریوں بلکہ کہنا چاہئے کہ کارناموں کا نمبر کچھ بیش ہی ہے۔ ایک وسیع احاطۂ زمین اور اس کے اندر دو دو اردو کالجوں کو بڑے پیمانے پر چلانا کوئی آسان اور معمولی درجہ کی چیز نہیں، اور کتابوں کی تالیف واشاعت جو اس کے علاوہ ہے وہ ظاہر ہی ہے اور یہ سارا ثمرہ ایک بڑی حد تک، معتمد انجمن پروفیسر حبیب الرحمٰن کی جواں ہمتی اور ایثار کا ہے۔ اپنی ایک بڑی ذاتی عمارت انجمن کی نذر کردی ہے اور خود دن رات اردو ہی کی (اور یا پھر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی) خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ انجمن جسے ایسے مخلص کارکن نصیب ہوئے ہیں۔ اور اس انجمن کے چلانے میں ہاتھ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ متعدد ہندو بھی اس میں جان ودل سے شریک ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب شری جانکی پرشاد کا نام بار بار سننے میں آیا، اور انجمن کی طرف سے ایٹ ہوم میں ان سے نیاز

بھی حاصل رہا۔

ہندوؤں کی شرکت اُردو کے کاروبار میں یوپی میں بھی ہے اور وہاں کی اردو کی جدوجہد میں نام کشن پرشاد کول، وحشی ہتکاری کانپوری، رام لال، انند نرائن ملا وغیرہ کے کون بھلا سکتا ہے۔ تاہم حیدرآباد میں اس شرکت ومشارکت کا مسرت انگیز منظر اور زیادہ ہی دیکھنے میں آیا بلکہ ایک اور انجمن، انجمن تحفظ اُردو کے نام سے تو حال میں ہندوؤں ہی کے عنصر غالب سے قائم ہوئی ہے، اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ ریاست کی ساہتیہ اکاڈمی جو کام کر رہی ہے اس میں اردو دانوں کا بھی پورا حصہ ہے۔ اور تصنیف وتالیف کا کام جس طرح تلنگی وغیرہ کا اس میں ہو رہا ہے، اسی طرح اردو کا بھی۔

......اُردو سے شدید رقابت بلکہ دشمنی اور ضد تو شاید ہندی ہی کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ تامل، تلنگی وغیرہ کسی اور زبان کی بھی کد اُردو سے سننے میں نہیں آئی۔

حیدرآباد کی اُردو صحافت

ہر زبان کی طرح اُردو کے بھی بڑے نقیب اُردو کے اخبار ہیں جس خطۂ ملک میں بھی وہ نکل رہے ہوں۔ حیدرآباد کی صحافت ایک زمانہ میں بہت پست اور بالکل مبتدیوں کے درجہ کی تھی۔ "رہنمائے دکن" اب دکن کا ایک معروف ومقبول روزنامہ ہے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے نقش اوّل "رہبر دکن" کے نام سے معیار حال کے مطابق روزنامہ حیدرآباد سے نکالا، اور اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اور جہاں تک مسلمانوں کی نمائندگی کا تعلق ہے، اپنی سنجیدگی، معقولیت، میانہ روی اور اسلامیت کا نقش دوسروں کے دل پر بٹھائے ہوئے ہے۔ "صدق" سے اس کا رابطۂ اتحاد وحسن ظن شروع سے گہرا ہے، اور "صدق" میں اس کی مدح وستائش کرنا ایک طرح خود ستائی ہی کرنا ہے۔ دوسرا قابل ذکر روزنامہ "سیاست" نظر پڑا۔ اور اس کے مدیر وسردبیر عابد علی خاں صاحب سے بھی نیاز حاصل رہا۔ خاصا سنجیدہ،

شریفانہ، معقول و پُر معلومات پرچہ اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ظریفانہ کالم خوب سنبھالے ہوئے ہے، ورنہ لوگ ظرافت اور توہین، دل آزاری یا پھکڑ کے درمیان فرق ہی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور ایک تیسرا مقبول و کثیر اشاعت روزنامہ "ملاپ" کے نام سے دیکھنے میں آیا۔ دلی و جالندھر کے مشہور روزنامہ ملاپ کا حیدرآبادی ایڈیشن ہے اور اب مدتوں سے مسلمانوں کی دل آزاری کے بغیر کامیابی سے نکل رہا ہے۔ ایڈیٹر شری یدھ ویر ہیں۔ ایک ایٹ ہوم میں سرسری ملاقات رہی۔ عام تاثر اس مختصر اور پہلی ملاقات میں اچھا ہی قائم ہوا۔ جو پرچے اکثریت کے ہاتھ میں ہیں انھیں اپنے قلم کی ذمہ داری کا خاص طور پر احساس رکھنا ہے، ملک کے بناؤ اور بگاڑ دونوں کی قوت بڑی حد تک انہی کے قلم کی روش سے وابستہ ہے۔ عین اسی زمانہ قیام میں ایک نئے روزنامہ "صحیفہ" کا پہلا نمبر ہاتھ میں آیا۔ صحیفہ نئے نہیں بہت پرانے پرچہ کا نام ہے۔ مولوی فاضل مولوی اکبر علی مرحوم کی ادارت کے زمانہ میں یہی پرچہ حیدرآباد پر چھایا ہوا تھا۔ محض پہلا نمبر دیکھ کے کوئی ذمہ دارانہ رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ خدا کرے اس کی روش اُردو معاصرین میں اس کی نیک نامی کا باعث بنے۔

حیدرآباد کی تہذیبی شرافت

اُردو صحافت محض اُردو زبان کی صحافت نہیں، اُردو کلچر کی مظہر و ترجمان ہے، اردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے۔ اردو تہذیب کا آئینہ ہے، اور اس آئینہ کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔

حیدرآبادی تہذیب، لکھنوی تہذیب، اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے۔

ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے، لیکن یہ تہذیبی شرافت ایسی چیز ہے جو اسی دنیا میں بندوں کو دل بندوں سے جوڑے رہتی ہے۔ اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے۔

پرانا حیدرآباد متافنا ہوا۔ نظام جاگیرداری گیا۔ نئے نظام حکومت و آئینی سیاست نے جگہ لے لی۔ اکثریت نے آزادی محسوس کی لیکن آخر کوئی بات اس مرحوم اُردو کلچر میں تھی کہ جب پولیس ایکشن کے بعد ایک نامور ہندو ایڈوکیٹ نے از راہ ہمدردی ایک اونچے مسلمان عہدیدار سے کہا "زمانہ اگر میر محبوبؒ علی خاں کا ہوتا تو ہم خود آپ لوگوں کے ساتھ ہو کر پولیس ایکشن کا مقابلہ کرتے" تو اس مسلمان عہدیدار نے کتنا بلیغ و جامع یہ جواب دیا کہ ...... "خیر ہم تو مر چکے، خوشی اس کی ہے کہ ہم پر آنسو بہانے والے آپ بھی ہیں!"

دورِ بد اقبالی میں

قصہ ملکہ سبا میں ملکہ کی زبان سے قرآن مجید میں نقل ہوا ہے:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً

ترجمہ: بولی کہ بادشاہ جب کسی بستی میں (فتح مندانہ) داخل ہوتے ہیں تو اسے تہ و بالا کر دیتے ہیں اور اس کے معززین کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔ (النمل، آیت ۳۴)

اور ملکہ ملک سبا نے کہا یہ بات بڑے پتے کی اور بڑے تجربہ کی۔ دنیا کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے۔ فاتح جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے کو بادشاہ کہیں یا جمہوریئے، یا عوامئے، یا اشتراکیے، یا جو کچھ، بہر حال مفتوحوں کے حق میں ایک عذاب بن کر آتے ہیں...... ان کے قلعوں کو توڑنا، ان کی حویلیوں کو گرانا، ان کی شان و عظمت کو مٹانا، دنیا کے ہر فاتح کا عام شیوہ رہا ہے، اور مفتوحوں کی قسمت میں کچھ صبر کے ساتھ سہنا ہی رہتا ہے۔ حیدرآباد پولیس ایکشن کے بعد اپنے انجام پر حیرت ہی کیوں کرے؟...... عاقبت اندیشی اگر ہوتی تو اس کی نوبت ہی کیوں آنے دی جاتی؟ بہر حال

لے مملکت حیدرآباد پر آصف جاہی خاندان کے سات بادشاہوں نے حکومت کی۔ محبوب علی خاں چھٹے بادشاہ تھے اور اسم بامسمّٰی! وہ ہندو مسلمان سبھی کے محبوب۔ ہندوؤں کے بعض فرقے تو انھیں اوتار مانتے تھے۔ ان کا زمانہ حکومت ۱۸۷۹ء تا ۱۹۱۱ء ہے (محمد احمد خاں حیدرآبادی)

اس بداقبالی کا ظہور کسی درجہ میں تو ناگزیر ہی تھا۔ لیکن اللہ کا یہی بڑا فضل ہے کہ حالت نکبت زدہ اس درجہ میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کا اندیشہ تھا، بلکہ اسے برسوں کے مسلمانوں کی خود اعتمادی پر محمول کیجئے یا حکمرانوں اور ہم وطنوں کی رواداری پر (اور یہ تو واقعہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کے خلاف نہ لسانی تعصب اس پیمانہ پر ہے اور نہ دینی تعصب، جس پیمانہ پر اتر پردیش میں ہے) بہرحال یہاں کے مسلمان اپنی اپنی ثقافتی، معاشرتی حالت بہت کچھ سنبھالے ہوئے ہیں، مکہ مسجد تو خیر اس ڈر سے جانا نہیں ہوا کہ وہاں پہچان لیا جاؤں گا اور پھر مجمع سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا لیکن جن دو ایک چھوٹی مسجدوں میں جمعہ پڑھنے یا کسی اور وقت جانے کا اتفاق ہوا وہاں نہ صرف نمازی ہی اچھی خاصی تعداد میں دکھائی دیئے بلکہ جماعت و نماز کا انتظام اور روشنی، فرش، صفائی، پانی وغیرہ کا انتظام بھی تقریباً اسی حال میں ہے جس طرح دور نظام دکن میں تھا، یہ دیکھ کر جی بڑا خوش ہوا، اس زمانہ میں مسجدوں کے نظام ظاہری ہی کو مسلمان سنبھال لے جائیں تو یہی ایک بڑی بات ہے۔

دارالقرأت

نماز اور قرآن سے ملا اور جڑا ہوا مسئلہ قرأت و تجوید کا ہے۔ ہندوستان میں حافظ تو خیر اب بھی تھوڑے بہت مل جاتے ہیں لیکن قاری برابر کمیاب سے کمیاب تر ہوتے جاتے ہیں۔ ورنہ قرأت و تجوید کا نظام بجز لکھنؤ کے مدرسہ فرقانیہ اور ریاست کی چند دینی درس گاہوں کے بھلا کہیں نظر آتا ہے؟ بلدہ حیدرآباد بحمد اللہ اس خصوص میں بھی اپنی امتیازی شان قائم کیے ہوئے ہے۔ ایک بڑا مرکزی ادارہ دارالقرأت کے نام سے بازار نور الامرا میں قاری کلیم اللہ صاحب حسینی کی نگرانی و سرپرستی میں ماشاء اللہ خوب چل رہا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ قاری صاحب خود اپنی ذات سے جامع صفات ہیں۔ ایک طرف صورۃً، سیرۃً پختہ و گہرے مسلمان اور دینی علوم کے عالم اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مغربیات میں برق۔ جامعہ عثمانیہ میں فارسی کے اُستاد

رہ چکے ہیں، اور اب بھی شاید اعزازی پروفیسر ہیں۔ مکان کا نام کلیم اللہ کی مناسبت سے "طور" خوب رکھا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ اس کا جلوہ بغیر کسی لن ترانی کے از خود کرا دیتے ہیں اور کھانے کی میز پر جب بٹھاتے ہیں تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابھی ابھی دعائے موسوی رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ، دل میں پڑھ چکے ہیں۔ مہمان کے حق میں طعامی لذتیں من و سلویٰ کا نقشہ پیش کیے ہوئے! اور چھوٹے مدرسے قرآنیات سے متعلق اور بھی متعدد ہیں۔ انھیں میں سے ایک امتحانی ادارہ دارالفرقان (لال ٹیکری) کے نام سے ہے اور ایک سعید المدارس (خیریت آباد) میں جہاں ایک انگریزی اور اسلامیات کی جامع قاری خاتون سعید جہاں کے اہتمام میں پردہ نشین خواتین اور لڑکیوں کے لئے حفظِ قرآن و تجوید کا بندوبست ہے۔ البتہ بڑے اور چھوٹے ہر مدرسہ تجوید و قرأت میں لڑکیوں کو (دس برس کی بچیوں کو بھی) لڑکوں سے بالکل علیحدہ رکھنے کی شدید ضرورت ہے اور لڑکیوں اور عورتوں کا بلا تکلف مردوں کو اپنی آواز سنانے لگنا، خود ایک فتنہ کی جڑ ہے۔ قرآن مجید کی برکت، ہرگز ایسے فتنوں کے روکنے کے لئے کافی نہیں، جیسا کہ مردانہ نفسیات کے ہر واقف کار پر روشن ہے۔

دینی درس گاہیں، اعلیٰ اور اوسط، ادنیٰ، شہر میں بہ کثرت موجود ہیں اور اپنا کام کیے جا رہی ہیں۔ سب تک کیا معنی، دس فیصدی تک پہنچنا بھی ناممکن تھا، نہ اس کی کوشش ہی کی گئی۔ دو ہی چار کے معائنہ سے ایک اجمالی رائے قائم کرنے پر اکتفا کر لی۔

دینی سرگرمیاں

جماعت تبلیغ کا مرکز، مولد تو ہمارا شہر دہلی ہی ہے لیکن یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے کہ اس کی شاخیں اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ کی مصداق ہندوستان، پاکستان کے ہر شہر میں کیا معنی، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک میں پھیل گئی ہیں۔ حیدرآباد میں اس کے خدمتی جلوے خوب خوب دیکھنے میں آئے۔ اور حیرت ہی ہوتی رہی کہ اس کی باگ کیسے کیسے لوگ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایک ڈاکٹر ادھیڑ سن و سال کے ڈاکٹر

وحیدالزماں صاحب دیکھنے میں آئے۔ ایلوپیتھی کے ایم بی، اپنے فن میں ممتاز، ایک زمانے میں شاہی طبیب بھی رہ چکے ہیں۔ اپنی بزرگی کے لحاظ سے قابل زیارت، اسی تحریک تبلیغ کے لیڈر! صورۃً ہمارے لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم ناظم ندوہ سے مشابہ، اور سیرت بھی انھیں کے ہم رنگ! انھیں کے ہمراہ ایک صاحب دراز ریش فوجی وردی میں ملبوس اور دکھائی دیئے۔ اپنا وقت اسی تبلیغ کے لئے وقف کیے ہوئے۔ یقین نہیں آتا تھا، لیکن یقین کرنا پڑا، کہ ہندوستانی کیا معنی، مشرقی بھی نہیں خاص اسکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں نو مسلم، یہاں نظام دکن کی ذاتی رجمنٹوں کے کرنل ہیں۔ اسی جماعت والوں کے اثر سے ولایت میں اسلام قبول کیا، اور اب ماشاءاللہ خود جماعت میں شریک ہو کر دوسروں کو اسلام کی طرف لا رہے ہیں۔ ایک اور ممتاز رکن اور سرگرم کارکن سکندر آباد کے سیٹھ حسین سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ چند ہی روز پیشتر تک سنا ہے کہ صاحب بہادر تھے، اور اب صورت شکل تک مولویانہ۔ اور نام کتنوں کے لکھے جائیں۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ ناموری و شہرت سے کوسوں دور بھاگنے والے ہیں۔

جماعت تبلیغی کے ساتھ دوسرا نام جماعت اسلامی کا یاد پڑ جانا بالکل قدرتی ہے۔ یہ جماعت بھی ہندوستان میں اپنے رنگ میں بڑا مفید کام کر رہی ہے۔ کام کی نوعیت اس سے بالکل مختلف لیکن دین و ملت کے حق میں افادیت کے لحاظ سے کم درجہ پر نہیں۔ یہاں اس کے بھی کارکنوں سے ملاقات رہی اور معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ یہ بھی کام میں سرگرم عمل ہیں۔ اسلام کے سپاہیوں کو تو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے، قلب میں جلا پیدا کر کے اندر کی روحانیت و نورانیت کو بیدار کرنا، کام جماعت تبلیغی کا ہے۔ دماغ کو مغربی اور غیر اسلامی فتنہ و فسوں کے حملہ سے محفوظ کر دینا اور تاریخ و جغرافیہ، معاشیات، فلسفہ، نفسیات، طبیعات وغیرہٗ پڑھ چکنے کے بعد بھی شہادت توحید و رسالت پر قدم جمائے رکھنا، یہ دائرہ عمل جماعت اسلامی ہند کا ہے، جس پر شاہد عادل اس کی لکھائی ہوئی درسی کتابیں ہیں۔

دائرۃ المعارف عثمانیہ

دوسرے دینی اداروں سے قطع نظر ایک دینی علمی ادارہ ایسا ہے جس کے لحاظ سے حیدر آباد اب تک سارے ہندوستان میں منفرد تھا اور اب تک ہے، اور ہندوستان کیا معنی، اس کی نظیر اس بڑے پیمانے پر عالم اسلامی میں بھی کمتر ہی نظر آئے گی، اس کا موجودہ نام دائرۃ المعارف العثمانیہ ہے۔ اس کی بنیاد تو انیسویں صدی کے آخر ہی میں پڑ چکی تھی، غالباً عمادالملک سید حسین بلگرامی کی تحریک پر۔ باقی پھر مولانا شبلی اور دوسرے علماء کی کوششوں نے اسے چار چاند لگا دیے، اور اس کی شہرت مصر، عراق، شام وغیرہ سے گزار کر برطانیہ، ہالینڈ، فرانس، جرمنی وغیرہ تک پہنچا دی۔ اس کا اصل کام مسلمانوں کے قدیم ذخیرہ سے نادر کتابوں کو نکال کر انھیں چھاپنا تھا، چنانچہ حدیث، رجال، سیرت، فقہ، کلام، لغت پر بیسوں بلکہ پچاسوں نادر کتابیں اس نے تصحیح و تہذیب کے پورے لوازم کے ساتھ چھاپ کر شائع کر دیں۔ چنانچہ سنن بیہقی، تاریخ الکبیر (بخاری) کنز العمال، المستدرک، الاستیعاب، مشکل الحدیث، مشکل الآثار، جمہرۃ اللغۃ، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ وغیرہ اپنی مطبوعہ شکل میں سب اسی ادارے کا فیض ہے۔ ابتداً یہ ادارہ اصلاً دینی تھا۔ اور ضمناً علمی، رفتہ رفتہ یہ ترتیب کچھ اُلٹ سی گئی۔ اور اب یہ دینی سے زیادہ ایک علمی ادارہ ہے۔ اور اب اس میں فلسفہ، فلکیات وغیرہ کی کتابیں کچھ زیادہ ہی چھپنے لگی ہیں۔ یہاں تک کہ شاید کوئی کتاب جوتش یا نجوم کی بھی، سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہو کر اب چھپ رہی ہے۔

پہلے یہ ادارہ خود ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اور قائم بالذات تھا۔ ۱۹۴۴ء سے جامعہ عثمانیہ کے تحت آگیا، اور اب شہر سے چند میل دور اس کی ایک بڑی عالیشان وسیع عمارت یونیورسٹی کے لق و دق حلقہ کے اندر ہے۔ کتابوں کی تصحیح، مقابلہ و تہذیب کے فن سے واقف عالموں کا ایک پورا گروہ کام میں لگا رہتا ہے، اور کتابوں کو یورپ ہی کے معیار پر ایڈٹ کر کے شائع کرتا رہتا ہے۔ اور ایک بہت بڑے پریس کا مالک ہے۔

پریس چھپائی کی جدید ترقیوں سے لیس ہے جنھیں میں عامی پوری طرح سمجھ بھی نہ سکا۔ صرف حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ پریس میں عربی کا اچھا ٹائپ تو خیر ہوتا ہی، انگریزی چھپائی کا بھی پورا سامان موجود ہے۔ چنانچہ پکتھال صاحب مرحوم کے انگریزی ترجمہ قرآن کا ایک ایڈیشن اس کا چھاپا ہوا ہے، اور عربی کتابوں کے تو کئی کئی نسخے بیک وقت مخطوطہ سے مطبوعہ میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ادارے کے ناظم یا ڈائریکٹر ایک فاضل اسلامیات و مغربیات ڈاکٹر عبدالمعید خاں پی ایچ ڈی ہیں جو نظامت ادارہ کے ہمہ وقتی و نازک کام کے علاوہ بلند پایہ انگریزی سہ ماہی "اسلامک کلچر" کے ایڈیٹر بھی ہیں، اور شاید یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی ہیں، اور اسلام کے علمی محاذوں پر بھی سپاہی کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ مستشرقین کے مخفی لیکن گہرے حملوں سے مقابلہ کے لئے ہمارے قدیم حربے سب کند ہو چکے ہیں۔ اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضرورت ایسوں ہی کی ہے جو ایک طرف اپنے عقائد و ایمانیات میں پختہ ہوں اور دوسری طرف حریفوں کے بھی ایک ایک وار کے الٹ دینے کا فن جانتے ہوں۔ ہمارے قدیم علماء زہد و تقویٰ، ریاضت و مجاہدہ میں جو مرتبہ بھی رکھتے ہوں وہ اس میدان میں آنے کے بالکل ہی نااہل ہیں۔ فلپ ہٹی (لبنانی ثم امریکی) جو مستشرقین میں اونچا درجہ رکھتے ہیں، ایک حد تک بجا طور پر ہمدرد اسلام بھی سمجھے جاتے ہیں۔ ان حضرت نے اپنی مشہور عالم تاریخ عرب میں ایک ذرا سا شوشہ سلسلہ ولادت میں یہ چھوڑ دیا کہ عرب کے ایک شریف قبیلہ میں ولادت ایسے بچہ کی ہوئی جس کے نام کی صحت غیر یقینی ہی رہے گی، بس اس پر ایک دوسرے بزرگ نے عمارت یہ کھڑی کر دی کہ محمد کوئی شخصی نام یا علم نہیں یہ تو محض ایک توصیفی لقب ہے جسے شاعر دربار نبوت حسانؓ بن ثابت نے اپنی ایک نعتیہ نظم میں باندھا ہے۔ اور اسی سے قرآن نے اپنی آخری مدنی سورتوں میں لے لیا ہے! مسلمات میں شک و شبہ پیدا کر دینا، قطعیات میں رخنہ ڈال دینا، یہ وہ کمال تلبیس ہے کہ یہاں تک جاہلیت کے ابو جہل، ابو لہب کا بھی ذہن نہیں پہنچ سکتا تھا!...... ایسے دجالی فتنوں کی روک تھام، اور ایسے باریک شبہات کا جواب اس مستشرقانہ

تکنیک کو استعمال کر کے اور انھیں کے رنگ میں گھس کر عبدالمعید خاں کا قلم دے سکتا ہے...... بلکہ عجب نہیں کہ دہلی کے تازہ اجلاس مجلس مستشرقین میں دے بھی دیا ہو۔

انھیں ناظم ادارہ نے اپنے ادارہ کے ایک ایک کمرہ کا گشت کرایا، ایک ایک چیز دکھائی بتائی اور پھر کھلانے پلانے کی خاطر داریاں رئیسانہ پیمانہ پر رہیں وہ الگ!

یاروں نے کیا کوئی کسر ادارہ کے بند کرا دینے کی اٹھا رکھی تھی، ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے، فرقہ وارانہ ہے...... سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام؟ اسے فوراً القط ہونا چاہئے۔ قریب تھا کہ فرمان قضاء اسی مضمون کا شائع ہو جائے اور حکومت آندھرا پردیش کے حکم سے ادارہ کے دروازوں میں قفل پڑ جائیں، لیکن حافظ حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وزیر تعلیم سرکار ہند مولانا ابوالکلام (اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے) نے اپنے منصب عالی کی کرسی سے زبردست احتجاج نامہ بھیجا کہ "بند ہونا کیا معنی ایسے ادارہ کو قائم ہی نہیں اور ترقی دینا چاہئے۔ بیرون ہند کی پڑھی لکھی دنیا میں تو سرکار ہند کی سیکولرازم کا بھرم ہی اس سے قائم ہے۔ اپنے سرکاری دورہ میں، میں نے کیا جرمنی اور کیا فرانس، کیا برطانیہ اور کیا اٹلی سب کہیں کے اہل علم کو اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کارناموں کے راگ گاتے ہوئے پایا"۔ جب کہیں جا کر ادارہ کی جان بخشی ہوئی۔

کتب خانۂ آصفیہ

۱۹۱۷ء - ۱۹۱۸ء میں جب کچھ دن جم کر رہنا حیدر آباد میں ہوا تھا تو اپنے شوق و دلچسپی کی ایک خاص چیز کتب خانہ آصفیہ تھا۔ عابد شاپ سے جو سڑک اسٹیشن کو آتی ہے اسی کے شروع میں اس کی عمارت واقع تھی، کئی کئی سڑکیں یہاں ملتی تھیں۔ بڑے موقع کی جگہ تھی۔ ناظم کتب خانہ ہمارے ہی جوار کے لوگ تھے یعنی قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی کے امامیہ خاندان کے لوگ مولوی سید تصدق حسین، سید عباس حسین وغیرہم کا اکثر یہاں آنا ہوتا رہتا۔ اور یہ لوگ بڑے اخلاق و محبت سے پیش آتے رہتے حالانکہ میں کم عمر تھا اور یہ لوگ اچھے خاصے مسن تھے۔ کتابیں اپنی تعداد کے لحاظ سے بھی وافر

تھیں اور بعض ان میں سے نوادر کے حکم میں تھیں۔ یہیں ایک صاحب اور بھی تھے اور اپنے عجیب و غریب کمالات کے لحاظ سے ملنے کے قابل تھے۔ نام عبداللہ خاں راولپنڈی کی طرف کے کہیں کے رہنے والے تھے۔ بالکل مجرد خوب گراں ڈیل سرحد والوں کی طرح، ادھیڑ سن کے، اب ہجرت کر کے یہیں کے ہو گئے تھے، اُمی محض نام تک بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن علم کے شوق کے ساتھ حافظہ کا کمال یہ تھا کہ خدا معلوم کتنی کتابون کے نام متعلقہ عبارتوں کے ساتھ بہ قید صفحہ و کالم ازبر تھیں، اور کتابیں محض اُردو کی نہیں فارسی اور عربی کی بھی خصوصاً فن تاریخ کی۔ انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر اگلے محدثین کی حیرت انگیز قوت حفظ کی جو کرامتیں مشہور ہیں، وہ عین الیقین کے درجہ میں نظر آنے لگتی تھیں۔ کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اور اس وقت کے اہل علم مولوی عبدالحق مرحوم وغیرہ سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مولانا شبلی سے بھی تعلقات رہ چکے تھے۔

بات کتب خانہ سے رونق کتب خانہ تک پہنچ گئی۔ اب ظاہر ہے کہ کتب خانہ اس ہیئت و صورت کے ساتھ کہاں باقی رہ گیا تھا۔ "آصفیہ" کا نام و نشان مٹ کر کتب خانہ "اسٹیٹ لائبریری" میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور اس پرانے نام سے، دور ایک نئی جگہ نئی شان سے قائم ہے۔ عمارت جدید طرز کی اور عالی شان، وسیع احاطہ، نئی وضع، نیا سامان، عربی فارسی کتابوں کا ذخیرہ[1] اب بھی خاصا ہے اور بعض نوادر کے لحاظ سے قابل دید البتہ یہ مشرقی ذخیرہ اب نیچے کی منزل میں ہے، جہاں دن دہاڑے بھی لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے بجلی کی روشنی ناگزیر ہے۔ اور یہ تو اب جدید سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں کے فیشن میں داخل ہو چکا ہے کہ کمروں کے اندر سارا کاروبار بجائے سورج کی روشنی کے، بجلی کی مصنوعی روشنی میں کیا جائے۔ ہندی اور انگریزی کی کتابوں پر پورا

---

[1] جدید طرز کی یہ عالی شان، وسیع و عریض عمارت، رود موسیٰ کے کنارے نظام سابق اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں بصرف زر کثیر تعمیر کی گئی۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی کتابوں کی کثیر تعداد مخطوطات نوادرات بھی اس دور میں مہیا کئے گئے۔ (محمد احمد خاں حیدر آبادی)

زور ہونا ہی تھا۔ مرہٹی وغیرہ کا بھی دور دورہ ہے، البتہ اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ اس پردیش میں بھی دکھائی دیا، اردو کی اتنی انجمنوں اور اردو کے اتنے ہمدردوں اور کارکنوں کے باوجود، اردو کی نئی کتابوں کی کوئی فہرست باہر آویزاں نہ ملی، بخلاف انگریزی اور ہندی کے، کہ ان کے تازہ مطبوعات کے نام مع ان کے تعارف کے بورڈ پر چسپاں تھے۔ اور اس ایک جزئیہ کے لحاظ سے حیدر آباد کی اسٹیٹ لائبریری کی زمین لکھنؤ کی پبلک لائبریری کے آسمان کے ہم رنگ ہی نکلی!

کتب خانۂ سالار جنگ

کتاب کے کیڑے کی اصلی دلچسپی کی جگہ کتاب گھر ہی ہوتے ہیں اور یہی شوق شہر کے ایک دوسرے مشہور کتب خانہ سالار جنگ لائبریری لے گیا...... نوادر کے اعتبار سے یہ کتب خانہ مشہور تر ہے۔ کئی بار پہلے کا دیکھا ہوا تھا...... واقع اب بھی اسی جگہ ہے یعنی سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں لیکن عمارت بالکل نئی اور دو منزلی بڑی حد تک، اپ ٹو ڈیٹ، لائبریری کے کارکن اچھے ملے۔ بڑی خوش اخلاقی سے ایک ایک چیز دکھاتے بتاتے رہے اور یہیں ملاقات تفصیلی (علاوہ دوسرے موقعوں کے) مولوی نصیر الدین ہاشمی سے رہی۔ پڑھے لکھوں اور تحقیقی کام کرنے والوں میں کون ان سے ناواقف ہوگا! اپنی ذات سے خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔ کتنی کتابوں اور کتاب سازوں کے نام پتے، خصوصیات کے حافظ اور کتب خانوں کی ترتیب، فہرست سازی وغیرہ کے ماہر، ڈیوڑھی پہنچ کر خود سالار جنگ ثالث نواب یوسف علی خاں مرحوم کی یاد تازہ ہو جانا امر طبعی تھا۔ ان کا شاہانہ سجاوٹ کا ڈرائنگ روم، قد آدم تصویریں، قد آدم آئینے، کھانے کی میز رئیسانہ تکلفات سے بھرپور، ان کی دلچسپ گفتگو، ان کے وسیع مطالعۂ مغربیات کی آئینہ دار اور ان کی اس پردیسی کے ساتھ خصوصی شفقت، ایک ایک چیز سینما کے پردوں کی طرح حافظہ کے سامنے آتی جاتی رہی اور دل کو دنیا کی ناپائیداری اور اس سے عبرت کا سبق دیتی گئی۔

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے　　آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
اب نہ خود ہیں نہ ہیں مکاں باقی　　نام کو بھی نہیں نشاں باقی

مرحوم دنیا سے لاولد گئے۔ ان کے زمانے تک یہ کتب خانہ ان کا ذاتی و شخصی تھا، اب پبلک ہو گیا ہے۔ مرحوم تک مجھے لانے والے اور ان سے ملانے والے، میرے ایک مخلص بزرگ دوست سید امین الحسن بسمل مرحوم تھے۔ انھیں کی ریاست کے سیشن جج اور ناظم تھے۔ ان کی کچہری بھی اسی احاطہ کے اندر ایک الگ عمارت میں تھی۔ ان کے اجلاس کے کمرہ کا منظر بھی نظر کے سامنے ہو گیا۔

دیگر کتب خانے

کتب خانے شہر میں اور بھی متعدد ہیں اور بہت اچھے اچھے ہر ایک تک رسائی اور وہ بھی محدود وقت میں کہاں ممکن تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری اور بعض ذاتی کتب خانوں مثلاً شہرۂ آفاق ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرانسوی کے عزیز قریب ڈاکٹر یوسف الدین کے کتب خانہ کے نہ دیکھ سکنے کا افسوس آج تک قائم ہے۔ لاکھوں کی آبادی والے بڑے شہروں میں ایک بڑا مرحلہ سواری کا ہوتا ہے۔ میلوں اور کوسوں دور محلوں تک بہ آسانی پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں جب تک کوئی ہمہ وقتی تیز رفتار سواری اپنے قبضہ میں نہ ہو۔ یہاں بھی لائبریریوں وغیرہ تک پہنچنے کے لئے یہ سوال برابر سامنے آتا رہا۔ لیکن بڑی حد تک سعودی امداد و اعانت سے حل بھی ہو جاتا رہا۔ سعودی سے ذہن کہیں شاہ سعود والیٔ نجد و حجاز کی طرف منتقل نہ ہونے لگے۔ اس لئے اسی لمحہ یہ بھی سن لیجئے کہ یہاں مراد مخلص و محب قدیم پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے صاحبزادہ سعود سلمہٗ ہیں، جو ایسی ہر ضرورت کے وقت اپنا موٹر لئے حاضر و کمر بستہ رہتے تھے۔

مجلس تعمیر ملّت

شہر میں ملی ادارے، چھوٹے بڑے اور گرم و نرم، خدا معلوم کتنے قائم ہیں، سب

تک پہنچنے کی نہ ہمت ہی ہوئی اور نہ فرصت تھی، نہ ضرورت۔ البتہ ایک ادارہ ضرور ایسا دیکھنے میں آگیا جو شہر ہی کی نہیں ساری ریاست کی ملی زندگی میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور جس کو دیکھے بغیر واپس چلے جانا خود اپنی محرومی شمار کرتا۔

مجلس کا نام تعمیر ملت۔ کوئی بارہ سال سے قائم ہے۔ صدر مجلس سید خلیل اللہ حسینی، ایم اے، ایل ایل بی سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ سرگرمیٔ عمل مجسم ہیں اور اس جوش کے ساتھ ہوش کے بھی بڑے حصہ دار۔ جوان، سن و سال کے اعتبار سے بھی ہیں اور اس سے کہیں زیادہ ہمت و عزم کے لحاظ سے۔ مجلس کے قیام کو کوئی ۱۲ سال ہوئے اور ۱۹۴۸ء کے بعد سے ملت میں جو افسردگی، انتشار، ہراس بلکہ سراسیمگی پیدا ہو گئی تھی اس کے دور کرنے اور مسلمانوں میں از سر نو اعتماد نفس پیدا کرنے میں بڑا دخل اسی مجلس کو ہے۔ مجلس کا نصب العین، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تعمیر ہے، تخریب نہیں، ٹھوس کام کرنا ہے۔ محض نعرے لگانا اور جلوس گشت کرانا نہیں۔ جدوجہد اسلام کے خمیر میں داخل ہے لیکن بزم کا رنگ رزم پر غالب ہے۔ جوانی کی طراری پیر دانا کی ہوشمندی کے سایہ میں قدم بڑھا رہی ہے۔ ایک اسٹڈی سرکل قائم ہے جو اقبال و بہادر یار جنگ کے رنگ میں اسلام کے حقائق و معارف پر غور و مطالعہ کے بعد ان تعلیمات کو پھیلاتا، نشر کرتا رہتا ہے اور دین کو ایک مکمل نظام حیات و دستور زندگی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یوم رحمۃ للعالمین کے سلسلے میں مجلس خوب مقالے لکھواتی رہتی ہے، مدرسے چلاتی ہے، طلبہ کو وظیفے دیتی ہے اور نظر ملت کی مختلف جماعتوں کے اتحاد پر خاص طور پر رکھتی ہے۔ کمیونزم، الحاد اور ہر گمراہی کا مقابلہ اصلاحی انداز سے کرتی ہے۔ شعور دینی و ملی کو بیدار کرتی ہے۔ زور کردار سازی پر دیتی ہے۔ سیرت طیبہ، تفسیر، حدیث، فقہ سارے ہی دینی علوم کو تعلیم میں شامل رکھتی ہے۔ کالج گروپ اور اسکول گروپ قائم کر کے انعامات نقد دیتی ہے اور تمغوں سے بھی ہمت بڑھاتی ہے اور تصنیف تالیف اُردو ہی میں نہیں انگریزی میں بھی کراتی رہتی ہے۔

مدینہ مینشن کے نام سے نراین گوڑہ میں سر نظامت جنگ مرحوم کی بڑی وسیع

حویلی میں مجلس کا دفتر ہے۔ سَر نظامت جنگ کی شخصیت خود قابل قدر تھی۔ انگریزی پر عبور اہل زبان کی طرح، بے تکلف انگریزی نظموں کا ایک بڑا سا مجموعہ اپنی یادگار چھوڑ گئے، سب سے پہلے ان کی نظمیں مولانا محمد علی کے "کامریڈ" میں پڑھنے میں آئی تھیں۔ وزیر سیاسیات تھے اور بڑے پختہ اور صاحب نظر مومن۔ حسنات اور کار خیر کی لمبی فہرست میں آخری یہ اضافہ کر کے کہ ایک لق و دق عمارت اس مجلس کو دے گئے۔ دفتر جا کر دیکھا تو سلیقہ مندی، حسن انتظام، کار کردگی کا ایک مثالی نمونہ پایا۔ ہر چیز نہایت صاف ستھری بڑے ڈھنگ اور قرینہ سے لگی ہوئی۔ سوا تصویروں کے حصہ کے کہ اس سے اپنے ذوق کو کسی طرح ہم آہنگ نہ کر سکا۔

مجلس کے ارکان سے بھی مل کر فرحت و مسرت حاصل رہی اور ایک مردم بیزار شخص سے اس کا اظہار ہونا بڑی بات ہے۔ ان میں کوئی فلسفہ کا اُستاد ہے اور کوئی کمیونزم کے دام سے نکل کر آیا ہوا نو مسلم جو کل تک کمیونزم کا پروپیگنڈسٹ تھا، آج اسلام کا مطیع ہے، یہ فلاں فلسفہ میں ایم اے ہیں، وہ فلاں مشہور شاعر، فلاں ادیب اور فلاں خطیب۔ اب سب خدمت دین و ملت میں لگے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے شریک۔ جس طرح ایوان اُردو میں قدم رکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اُردو بھی کوئی بد قسمت اور مظلوم زبان ہے اسی طرح تعمیر ملت کے احاطہ میں آ کر یہ خیال کرنا مشکل ہو گیا کہ ملتِ اسلامی بھی کوئی، منتشر بد نظم و پراگندہ حال اور غیر مطمئن جماعت ہے۔

بدر الدین طیبّ جی

قیام ابھی حیدر آباد ہی میں تھا کہ اتفاق سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بدر الدین طیب جی صاحب ادھر آ نکلے اور میرے میزبان اور علی گڑھ کے مشہور فدائی ناظر یار جنگ بہادر نے انھیں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے عصرانہ دے دیا۔ ان "بوڑھے لڑکوں" کے کرتا دھرتا، یہاں جوان ہمت پروفیسر حبیب الرحمٰن ہیں (انجمن ترقی اُردو والے) ان کا حسن انتظام، کوئی کور کسر کیسے رہنے دیتا۔ اس

تقریب میں بہت سے علی گڑھیوں سے ملاقات ہو گئی۔ ان میں سے اکثر کا شمار یہاں کے عمائد میں ہوتا ہے۔ نیاز خود طیب جی صاحب سے حاصل ہوا اور انگریزی تقریر اور گفتگو سننے کا اتفاق ہوا۔ آدمی وجیہ شریف اور بڑے صاحب عمل و کردار نظر آئے۔ علی گڑھ کی کشتی کو اس نازک وقت میں کھینا کوئی آسان چیز نہیں۔ ایسے میں ان کا دم غنیمت ہے جبکہ کردار و ایمان کی کمزوری کی کئی کئی بڑی ہی افسوسناک مثالیں مسلمانوں کے اونچے اور صاحب اثر طبقہ میں موجود ہیں۔ اللہ فتنہ و شر کے ماحول میں انھیں ہر طرح محفوظ رکھے۔

فخرِ دکن ڈاکٹر حمید اللہ

ڈھائی ہفتہ کے قیام میں آنا جانا بہت جگہ رہا، افراد کے یہاں بھی اور اداروں میں بھی، لیکن سہو و نسیان تو انسان کے دم کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ ایک جگہ جانے کی لازمی تھی اور اس وقت اس کا خیال نہ آیا۔ اس بے خیالی پر تو اب بھی پچھتاوا ہے۔ حیدر آباد کا اتنا لمبا سفر روز روز کیونکر ممکن ہے اور عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اب دوبارہ سفر کا تو کوئی قرینہ ہی نہیں نظر آتا، اسی لئے قدرۃً قلق بھی زیادہ ہے۔ ان قابل زیارت جگہوں میں نمبر اوّل پر فخر دکن بلکہ فخر ہند ڈاکٹر حمید اللہ[1] فرانسوی کے مکان کا آتا ہے، سچے مجاہد اور سچے مہاجر کی مثال انھیں کی ذات میں ملتی ہے۔ علم و دین دونوں کے لئے بیک وقت وقف کئے ہوئے۔ اس وقت ایک انھیں کی شخصیت ہے جس نے محض اپنے عقیدہ کی خاطر عمر بھر کے لئے جلاوطنی اختیار کر لی۔ لازم تھا کہ ان کے مکان پر حاضری دیتا۔ ان

---

[1] ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم اے، ایل ایل بی (عثمانیہ) ڈی لٹ (پیرس) جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر فرزند، دکن کے مایہ ناز سپوت کئی کئی کتابوں کے مصنف، استادوں کے استاد اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ لیاقت علی خاں کے دور وزارت عظمیٰ میں اسلامی دستور کی تدوین کے سلسلہ میں جو بورڈ آف تعلیمات اسلامی قائم ہوا تھا، اس کے رکن رہے۔ تقریباً دو سال کراچی میں قیام رہا۔ پھر کچھ دل برداشتہ ہو کر پیرس چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ (محمد احمد خاں حیدر آبادی)

کے رہنے سہنے اور سب سے بڑھ کر ان کے لکھنے پڑھنے کی جگہ کی دست عقیدت سے جاروب کشی کرتا۔ موقع ہاتھ آ کر محض سہو و غفلت کی نذر ہو گیا۔ اب یہ چند سطریں بطور سجدہ سہو کے ہیں۔ دو ایک جگہ کی اور ضروری حاضری بھی اس طرح رہ گئی، گو ضروری اس درجہ میں نہ تھی۔

دُھوم تھی شہر میں کہ داغ آیا

آغاز سفر سے پہلے ہی بڑا دھڑکا یہ لگا ہوا تھا کہ کہیں خلقت کا ہجوم نہ ہو جائے، اسٹیشن پر پیشوائی کرنے والوں کا یا گھر پر ملنے والوں کا۔ "صدق" بلکہ اس کے پیش رو "سچ" کو اللہ نے جو مقبولیت حیدر آباد میں دے رکھی تھی، اس کے لحاظ سے یہ اندیشہ خواہ مخواہ نہ تھا اور حیدر آباد کا مقبول و معروف روزنامہ "رہنمائے دکن" حلقہ "صدق" کو برابر وسیع سے وسیع تر کرتا رہا ہے، اس لئے ہجوم خلق سے بچنے کے لئے پیش بندی یہ کی کہ اپنے خصوصی مخلصوں کو پہلے ہی سے لکھ بھیجا کہ آمد کی خبر ہرگز وہاں کے اخباروں میں نہ چھپنے پائے۔ ورنہ اپنی جان غضب میں ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ طبیعت پر گرانی اس درجہ بڑھ جائے کہ مدت قیام ناتمام چھوڑ کر اور بغیر خاص لوگوں سے ملے ہوئے ہی واپس چلا آنا پڑے۔ الحمد للہ، کہ استدعا قبول ہو گئی۔ کسی اخبار نے اشارہ تک آمد کا نہ کیا اور بجز ایک خصوصی مخلص کے جو شب میں قاضی پیٹ جنکشن تک پہنچ گئے تھے اور کوئی باخبر بھی نہ ہوا اور یہ صاحب بھی اس درجہ لحاظ رکھنے والے تھے کہ رات کو انھوں نے جگانا یا سکون میں خلل ڈالنا کسی طرح مناسب نہ سمجھا، بلکہ اسی ٹرین میں بیٹھ کر صبح تڑکے سکندر آباد جنکشن پر آ کر ملے اور دن نکلنے کے بعد جب حیدر آباد خاص پر اترا ہوں، بجز گنتی کے دو چار مخصوص عزیزوں و مخلصوں کے اور کوئی نہ تھا۔ مقبولیت و مرجعیت خلق تو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ لوگ اس کی تمنا میں رہتے ہیں۔ اس کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں لیکن اپنا اپنا ظرف ہے۔ بعض سے اس نعمت کا تحمل ہی نہیں ہوتا اور اپنا شمار بھی اسی طبقہ میں ہے۔ اور جس نعمت کا تحمل

اپنے ظرف کو نہ ہو سکے، تمنا اس کے حصول کی نہیں، اس سے محرومی ہی کی کرتے رہنا چاہئے۔ جب زبان پر قابو نہ ہو اور قلب بھی مجمع کے سامنے بجائے انشراح کے انقباض ہی محسوس کرے تو ایسے حال میں عقل و دل دونوں کا مشورہ گوشہ گیری یا مردم بیزاری ہی کا ہے۔ اور اس مشورہ پر عمل بھی اب ۲۵، ۳۰ سال سے ہے۔ مجمع میں گھس کر فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہنا، سلسلۂ دعوت کو عام رکھنا، کام عالی ہمتوں، جوان مردوں کا ہے۔ بدہمتوں کی راہ اس سے بالکل مختلف دوسری ہے۔

زاہد نہ داشت تاب جمالِ پری رخاں
کنجے گرفت و ترسِ خدارا بہانہ ساخت

بہر حال یہ بہانہ سازی بڑے موقع پر کام آ جاتی ہے اور ترسِ خدا کا نقاب اختیار کر لیتی ہے۔

بھولے، بامروّت، مہمان نواز حیدر آبادی

لیکن بات چھپی کب تک رہتی۔ ایک نے دوسرے سے کہا، دو نے دس سے، اور دس نے بیس سے۔ اور خلقت کا تانتا لگنا شروع ہو گیا۔ یہ آ رہے ہیں، اور وہ فلاں آ رہے ہیں اور فلاں تنہا بھی اور ٹولیاں بنا کر بھی، موٹر نشیں بھی اور پا پیادہ بھی، کیا صبح اور کیا دوپہر اور کیا شام وقت ناوقت کی کوئی قید نہیں گویا زُو (چڑیا گھر) میں کوئی عجیب الخلقت جانور آ گیا ہے، اور تماشائیوں کے ٹھٹ اس کے دیکھنے کو لگ رہے ہیں۔ اور پھر کن کن توقعات اور کیسی کیسی خوش اعتقادیوں کے ساتھ! خلق کو فریب دے دینا کس درجہ آسان ہے اور پھر حیدر آباد کی مخلوق تو شاید کچھ اور زیادہ ہی بھولی اور سریع الاعتقاد ہے۔ اف رے مالک و مولا کی ستاری! کیسے کیسے ذرّوں کو آفتاب بنا کر دکھایا جاتا ہے! کتنے سفلیوں کو روپ علویوں کا دے دیا جاتا ہے کتنے سنگ ریزوں میں تابش لعل و جواہر کی پیدا کر دی جاتی ہے۔ حیدر آبادیوں کے انس و محبت کا ان کی مسافر نوازیوں کا قائل تو شروع سے تھا۔ لیکن دعوتی تکلفات کا جو درجہ مشاہدہ میں آیا، اس حد تک اندازہ نہ تھا

آج یہاں عصرانہ ہے تو کل وہاں ظہرانہ اور پرسوں وہاں عشائیہ، دعوت، ایٹ ہوم کا ایک مسلسل چکر اور بندھے ہوئے وقتوں کے علاوہ بے وقت بھی چائے پیسٹری اور پھل پھلاری پر اصرار۔ سارے کرم فرماؤں کے نام تو اب بھلا کہاں یاد رہ سکتے ہیں اور یاد ہوں بھی تو اتنی لمبی چوڑی فہرست درج کر کے داستان سفر کہاں تک پھیلاتے چلے جائیے۔ پھر بھی کچھ نام لانے اور تذکرے کرنے بہر حال ناگزیر ہیں، کہ ان سے خود اپنے دل کو مسرت حاصل ہو گی، جیسا کہ قبل کے نمبروں میں مختلف اداروں کے ذیل میں مختلف شخصیتوں کے تذکرے میں حاصل ہو چکی ہے۔

جامعہ عثمانیہ، اساتذہ جامعہ عثمانیہ

قدرۃً سابقہ سب سے زیادہ یونیورسٹی والوں سے رہا۔ یونیورسٹی کو اس زمانہ میں دیکھا تھا جب وہ شہر میں تھی، اور صرف چند بڑے کمروں اور برآمدوں اور چھوٹے چھوٹے صحنوں کا مجموعہ تھی۔ اب اس کے شباب کو اس کے بچپن سے کیا نسبت! شہر سے باہر اور مرکزی آبادی سے میلوں دور خود ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ میلوں کے رقبہ میں آباد۔ یہ شعبہ قانون ہے، وہ آرٹس کالج، ادھر سائنس کی عمارتیں ہیں، ادھر لائبریری کی ایک سے بڑھ کر ایک شاندار لق ودق، مرعوب کن۔ وقت گھنٹوں کا نکال کر سیر کی جائے۔ تھک جائے گا اور سیر تمام نہ ہو سکے گی۔ صدق نوازوں میں ایک استاد شعبہ نباتات میں کپتان فتح یاب خاں ہیں۔ خوب ملے اور خوب کھلایا پلایا۔ شعبہ مذہب و ثقافت کے استاد ڈاکٹر یوسف الدین، پرانے ملنے والے نکلے۔ کئی کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ ایک بڑے علمی خاندان کے، ڈاکٹر حمید اللہ کے عزیز ہیں۔ خود بھی سر تا پا علم ہیں، بلکہ علم داں بھی۔ نئی نئی کتابوں کے عنقریب طبع و اشاعت کی خوشخبریاں انھیں سے سننے میں آئیں خصوصاً فن حدیث میں ”منصف عبدالرزاق کی“۔ گھنٹوں ان سے صحبت رہی اور ہر بار یہ گمان گزرتا تھا کہ کسی اچھے کتب خانے میں بیٹھے ہوئے مصروف مطالعہ ہیں یا پھر الملل والنحل (شہرستانی) کے قسم کی کتاب کے ورق سامنے

کھلے ہیں۔ اللہ ان کے کام میں برکت دے، ان سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید صوفی منش شخصیت رکھنے والے شعبۂ فارسی کے صدر ہیں۔ ”صدق“ کے قدر دان اس زمانے سے جب وہ ”سچ“ کے نام سے نکلتا تھا، اور یہ خود کالج کے ابتدائی درجوں کے طالب علم تھے، فاضل گیلانی“ کے چہیتے اور رشید شاگردوں میں تھے، ان سے مل کر شخصی، علمی دینی ہر حیثیت سے کتنی ہی خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں اور یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے کچھ دیر کے لئے کسی بوڑھے کی جوانی پلٹ آئی ہو!

شعبۂ تاریخ اسلام کے اُستاد ڈاکٹر ابو نصر خالدی اپنے رنگ میں سب سے منفرد ہیں، بڑے مخلص گہرے مذہبی۔ اپنا دل کھول کر رکھ دینے والے ساتھ ہی بڑے پڑھے لکھے، کہاں کہاں کی کتابیں دیکھ ڈالنے والے۔ قرآنیات کے سلسلہ میں دو ایک کتابیں ایسی ہدیۃً پیش کر دیں، جو اس کے قبل کہیں نظر سے نہیں گزری تھیں۔ جزاہ اللہ! دعوت تو ایسی کی کہ دوسروں کے لئے نظیر اور قابل تقلید، یعنی کھانا نہایت لذیذ، لیکن بس دو ہی ایک چیزیں۔ یہ نہیں کہ عام رواج کے مطابق دس چیزیں لا کر سامنے لا کر رکھ دیں۔ معدہ اس تعدد و تنوع سے الگ خراب ہو، اور نیت پھر بھی نہ بھرے کہ اپنے پسند کی کوئی ایک چیز بھی سیر ہو کر نہ کھائی جا سکی، بس اسراف ہی اسراف ہاتھ آیا۔ اور میاں مظہر احسن گیلانی سلمہٗ (استاد معاشیات) کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں وہ کیا ملے گویا مدت کا ایک بچھڑا ہوا عزیز مل گیا۔ میرے ایک عزیز ترین دوست و بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی کے آخری چھوٹے بھائی ہیں۔ صورت و سیرت دونوں میں انھیں کے مثیل و نظیر! نماز مغرب عمداً انھیں سے پڑھوائی۔ آواز میں کچھ ویسا ہی درد ویسا ہی رس جیسا فاضل گیلانی کی آواز میں تھا۔ وہ مسجد دکھائی جہاں مولانا اور مولانا عبدالباری سلمہ اللہ نماز پڑھتے تھے۔ وہ مقامات دکھائے جہاں یہ دونوں لکھتے پڑھتے، اٹھتے بیٹھتے تھے۔ یونیورسٹی کے دو اور استادوں کی بھی اسلامیت کی تعریف کئی زبانوں سے سننے میں آئی۔ ایک ڈاکٹر وحید الدین (فلسفہ) دوسرے پروفیسر صلاح الدین کی۔ افسوس ہے کہ دونوں سے ملاقات کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

ڈاکٹر میر ولی الدین اب یونیورسٹی میں ضابطہ سے ہوں یا نہ ہوں، بہر حال ان کا تصور یونیورسٹی سے الگ کیونکر کیا جا سکتا ہے، جتنی بار ملئے طبیعت سیری حاصل نہ کرے، ملاقات کی خواہش کچھ اور بڑھتی ہی جائے اور کچھ بیجا نہ ہو گا اگر انھیں سے ملنے اور ان سے استفادہ کے لئے خود ایک سفر حیدر آباد کا کیا جائے۔ فلسفہ، تصوف، اسلامیت کے جامع۔ ایک خاص تجربہ یہ ہوا ہے کہ جہاں وہ دماغ کے لحاظ سے فلسفی ہیں اور قلب کے اعتبار سے صوفی ہیں، ان کے دستر خوان پر جب بیٹھئے تو نہ یہ معلوم ہو کہ یہ نان جویں پر بسر کرنے والے کوئی صوفی مرتاض ہیں اور نہ تکلفات کے تقاضوں سے بیزار، کوئی خشک مزاج فلسفی بلکہ ایوانِ نعمت میں، کیا بہ لحاظ رنگا رنگی اور کیا بہ لحاظ مقدار رئیسوں، جاگیرداروں کو بھی سبق پڑھا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللطیف

داستاں کا یہ ٹکڑا اتمام تر ناقص رہے گا۔ اگر ذکر کسی قدر تفصیل سے ایک حیدر آبادی شخصیت ڈاکٹر عبداللطیف کا نہ آئے، اب تو ریٹائر ہو چکے ہیں، لیکن اُستادوں کے استاد رہ چکے ہیں، یعنی ان کے پڑھائے ہوئے ان کے سکھائے ہوئے، درجہ فضیلت پاس کر کے خود اپنے فن کے یونیورسٹی میں اُستاد بھی بنے، اور اب وہ بھی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آنکھوں کے مریض اور اب دنیا کے ہنگاموں سے کچھ الگ تھلگ سے رہتے ہیں۔ پھر بھی بڑی گہری نظر دنیا کے حالات پر رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی میں استاد تو شاید انگریزی ادب کے تھے، لیکن اب تو ان کی ماہرانہ نظر سیاسیات عالم پر رہتی ہے۔ سرسری نیاز ان کی خدمت میں پہلے سے تھا، لیکن خوب ہوا کہ اب کی ملاقاتیں بار بار اور خوب کھل کر رہیں۔ بدگمانی ان کی طرف سے دل میں یہ جمی ہوئی تھی کہ یہ تجدد مآب[1] ہیں۔ مل کر

[1] ڈاکٹر سید عبداللطیف پی ایچ ڈی (لندن) انگریزی زبان کے ماہر، غالب کے نقاد، برصغیر ہند کو ثقافتی وحدتوں (CULTURAL ZONES) میں تقسیم کرنے کے محرک (PAKISTAN ISSUE) اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف، آخری عمر میں قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا، کچھ عرصہ قبل داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ (محمد احمد خاں حیدر آبادی)

معلوم ہوا کہ، نہیں ان کے دل میں بڑی اسلامیت ہے۔ مڈل ایسٹ (مشرق وسطیٰ) کے کسی انسٹیٹیوٹ کے سرکاری طور پر ناظم ہیں، اور مسلم ملکوں کے حالات و انقلاب سے خوب باخبر ہیں۔ ان ملکوں کی تجدد مآبی اور فرنگیت کا ذکر بڑی دردمندی سے کرتے رہے اور دنیا کے بعض بہترین مبصرین (مثلاً شہرہ آفاق پروفیسر ٹائن بی) سے ان کے گہرے تعلقات ہیں اس نے انھیں خود ایک بڑا مبصر بنا دیا، میں نے متعدد معاملات میں ان کے وسیع معلومات اور بجے تلے تبصروں سے استفادہ کیا۔ ایک روز انھوں نے بڑے وسیع پیمانہ پر جوایٹ ہوم (عصرانہ) دیا، اس میں کہنا چاہئے کہ پورے شہر کا عطر کھینچ کر آ گیا تھا، کتنوں سے ملاقات گھنٹہ سوا گھنٹہ کے اندر ہو گئی۔ اور مولانا بادشاہ حسینی سے ملاقات یہیں ہوئی، مگر افسوس ہے کہ موقع زیادہ بات چیت کا نہ مل سکا۔ ڈاکٹر محمد مسعود حسین خاں (شعبہ اردو) بھی یہیں دکھائی دئیے۔ علاوہ ان سے ذاتی تعلقات کے ان کے بزرگوں سے بھی دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات کی توقع تشنہ ہی رہی۔ عزیز مرزا مرحوم کے دو صاحبزادوں احمد مرزا اور ابو سعید مرزا سے بھی ملاقاتیں یہیں ہوئیں گو احمد مرزا اتنے فاصلہ پر تھے کہ ان سے بات چیت کی حسرت ہی رہ گئی۔ عزیز مرزا مرحوم اپنے دور کے مشاہیر ملت میں تھے، علی گڑھ کے بڑے ممتاز اولڈ بوائے، حیدر آباد کے ہوم سیکرٹری اور یہاں سے ہٹنے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری۔ ابھی ادھیڑ ہی سن کے تھے کہ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں پیام اجل آ گیا۔ یہ لڑکے سب کم سن ہی تھے۔ میں بی اے کا طالب علم تھا۔ ان بے چاروں کی تازہ یتیمی اور مرحوم کی کوٹھی کے ماتم کدہ میں تبدیل ہو جانے کا منظر سب آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

ڈاکٹر عبداللطیف کے تعلقات مولانا ابوالکلام سے خصوصی تھے۔ ان کی ایک آدھ کتاب کو انگریزی کے قالب میں یہ لائے ہیں۔ ان کے زمانہ علالتِ وفات میں یہ وہیں انھیں کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ انھیں کے بیان سے معلوم ہوا کہ مرحوم جب سے غش کھا کر گرے پھر ہوش نہ آیا اور نہ کچھ بول ہی سکے۔ صرف ایک بار وقتِ وفات

سے چند گھنٹے قبل ذرا سے آثار ہوش آنے کے معلوم ہوئے۔ ڈاکٹری تدبیروں سے سخت کرب واذیت میں تھے، ہونٹ ہلے اور آواز صرف اتنی سنائی دی کہ

چھوڑ دو، بس خدا پر چھوڑ دو

اور بس پھر کوئی آواز اس عالم آب و گل میں نہ نکل سکی! مبارک اور خوش قسمت ہے وہ مسلمان جس کی زبان کا آخری کلمہ خدا کا نام ہو! مضطرب کی آخری پکار چارہ سازِ حقیقی کے نام کی!

کچھ اور مشہور شخصیتیں

مشہور میر تعمیر (ARCHITECT) فیاض الدین صاحب کا نام عرصہ سے کانوں میں پڑا ہوا تھا مگر خیال میں یہ بسا ہوا تھا کہ یہ دہلی یا نئی دہلی کے ہیں۔ وہیں کی عمارتوں کے سلسلے میں ان کا نام ذہن میں تھا۔ اب پتہ چلا کہ یہیں کے ہیں۔ ایک سے زائد ملاقاتیں رہیں۔ فنی شہرت ملک گیر حاصل کئے ہوئے ہیں...... خواجہ حسن نظامی مرحوم نے انھیں کو تو بہزاد دکن کا لقب دیا تھا...... اس سے قطع نظر یہ معلوم ہوا کہ قوم وملت کے معاملات میں بھی دل دردمند رکھتے ہیں۔ تعمیر ملت والوں کے اجتماع میں خاصے پیش پیش تھے اور بعض اور متفرق حضرات کی ملاقات کے نقش حافظہ پر رہ گئے۔ انھیں میں سے ایک شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر عبدالمنان ہیں، ان کی حذاقت کے قصے اپنے عزیزوں کی زبانی سنے اور انجمن ترقی اُردو کے عصرانوں میں ان سے ملنے کی بھی مسرت حاصل رہی۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر محمد عثمان خاں سے پروفیسر مظہر احسن گیلانی کے ہاں نیاز حاصل ہوا۔ یونیورسٹی کے سررشتہ ترجمہ میں ڈاکٹری کتابوں کے اردو مترجم تھے۔ اور رسالہ "ہمدرد صحت" وغیرہ میں اب بھی طبی مضمون برابر لکھتے رہتے ہیں۔ ایک اتفاقی حادثہ پیش آجانے سے چلنے پھرنے سے گویا معذور ہو گئے ہیں۔ اپنے فنی کمال کے ساتھ ماشاء اللہ ایسے زبردست صاحب ایمان ہیں کہ ان سے بات چیت کر کے دوسرے کا ایمان تازہ ہو جائے۔ اور ایک اور صاحب ملے یونس سلیم صاحب، ممتاز

ایڈوکیٹ ہیں اور ایک عرصہ تک صحافت کے کوچہ کی بھی ہوا کھاتے رہے ہیں، روزنامہ پیام والے قاضی عبدالغفار (اللہ انہیں بخشے) رفیقوں، جلیسوں میں تھے۔ خود بھی محبت کے نظر آئے۔ ایسے ہی ایک نعت گو شاعر مرزا شکور بیگ سے بھی مل کر خوش ہوا۔ پیشہ کے لحاظ سے شاید یہ بھی ایڈوکیٹ ہیں، اور پہلے مزاحیہ رنگ کی شاعری کرتے تھے، برجستگی، آمد، اور بذلہ سنجی میں شوکت تھانوی مرحوم کے ہم طرح۔ اب شاید صرف نعت کہتے ہیں۔ اور تاثر میں ڈوب کر کہتے ہیں۔ اپنے دو محبوب عثمانیہ یونیورسٹی کے استادوں، مولانا مناظر احسن صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی حفظہٗ اللہ کے متعدد شاگردوں سے ملاقاتیں رہیں۔ سب اچھے حال میں ہیں۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان دونوں کا ذکر خیر ان کے شاگردوں کی زبانوں پر برابر جاری ہے۔ ایسا بھی اب کم ہی ہوتا ہے، ملنے والوں اور خاطر مدارت کرنے والوں کی فہرست مختصر و منتخب بھی ناتمام رہے گی، اگر نام نواب بہادر یار جنگ علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی نواب ماندور خاں کا نہ لیا۔ ملازمت پر کہیں باہر متعین ہیں۔ قیام کے بالکل اخیر زمانہ میں آئے، لیکن خلوص کی شدت، وقت کی قلت کی تلافی کے لئے بالکل کافی ہو گئی۔

سرکاری حلقوں میں رسائی کے موقعے قدرۃً کم ہی نکلے۔ پھر بھی ڈاکٹر لطیف کے عصرانہ میں ایک وزیر میر احمد علی خاں، وزیر اوقاف سے تو نیاز حاصل ہی ہو گیا۔ ان کا ذکر خیر زبانی بھی بہت سن چکا تھا، اور ان کی جرأت کے کارنامے اخباروں میں پڑھ چکا تھا۔ ہندوستان بھر کے ان گنتی کے دو تین منسٹروں میں ہیں، جو اپنے اسلام پر شرمندہ نہیں، اور سیکولرزم کے تقاضوں کے ساتھ اپنے ایمان کے مطالبات وواجبات کو ہم آہنگ رکھنے کی کوشش میں برابر لگے رہتے ہیں۔ ان کے چہرے، بشرے، اندازِ گفتگو سب سے اثر اچھا ہی قائم رہا، اور سادگی و تواضع وانکساری تو نمایاں تھی۔ ایک اور عہدہ دار محکمہ فنانس کے سیکرٹری محامد اللہ صاحب عباسی کاکوروی سے بھی ملاقاتیں رہیں، آدمی پڑھے لکھے ہی نظر آئے اور ساتھ ہی دین وملت کے پورے دردمند، اپنے محکمہ میں نیک نامی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بھی کام آنے والے، لادینیت اور

دینداری دونوں کے مزاج اور تقاضے الگ الگ بلکہ اکثر ایک دوسرے کے متضاد اور دونوں کے تقاضوں کو بڑی حد تک نباہ لے جانا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ خوشگوار نظیریں خوشگوار امتزاج کی اس دور میں بھی مل ہی گئی ہیں۔ ریاست مدراس میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم (صدر پبلک سروس کمیشن) اور ہماری اپنی اسٹیٹ میں سید صدیق حسن مرحوم (سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو) کی خوشگوار مثالیں بہت کم تعداد میں سہی، بہرحال جہاں کہیں مل جاتی ہیں، پژمردہ اُمیدیں نئے سرے سے شاداب ہو جاتی ہیں۔

یہاں ایک بڑا طبقہ مشائخ کے لقب سے موسوم ہے۔ سلوک اگر صحیح معنی میں ہو، جو ابو بکرؓ و علیؓ کا تھا، تو ظاہر ہے کہ اس کا کہنا ہی کیا! وہ تو ہر مسلمان کا عین ایمان اور بلند ترین نصب العین ہے۔ لیکن اس لفظ سلوک و تصوف کے پردہ میں جو ایک بڑا ملغوبہ اوہام و رسوم کا تیار ہو گیا ہے، اب اس پر کیا کہا جائے اور یہ اس کے کہنے کا محل کچھ ہے بھی نہیں۔ خوشی اس کی ہے کہ ملاقات اس طبقہ مشائخ کے ایک ایسے فرد سے رہی جس کا وجود اپنے طبقہ کے لئے باعث فخر ہے۔ مولوی شاہ قطب الدین الحسینی شہر کی مرجع عام درگاہ شاہ خاموشؒ کے صاحب سجادہ ہیں۔ صاحب علم ہیں۔ دینیات میں علامہ گیلانیؒ کے شاگرد رہے ہیں اور سارے لوازم سجادگی کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم اے ہیں، حالانکہ وضع و قطع ایسی بنا رکھی ہے کہ انگریزی کے حرف شناس ہونے کا بھی گمان نہیں گزرتا۔ انگریزی زبان پر اتنے قادر کہ بے تکلف اس میں لکھ لکھا بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ کچھ ہی روز ہوئے کہ اسلامی تعدد ازواج کی حمایت میں ایک رسالہ انگریزی میں شائع کر چکے ہیں۔ اور "صدق" میں اس کا ذکر خیر بھی آ چکا ہے۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ ہے۔ اگر ان کے سے پڑھے لکھے اور خدمت دین کا ولولہ رکھنے والے ان کے طبقہ میں اور پیدا ہونے لگیں تو کہنا چاہئے کہ امت کے ایک خاصے بڑے حصہ کا بیڑا پار ہو جائے۔

حضرت عبداللہ شاہ

شہر کے بزرگوں میں خصوصی مرجعیت مقبولیت کے تاجدار حضرت عبداللہ شاہ نظر آئے جس سے بھی ملئے ان کی عقیدت کا کلمہ پڑھتے ہوئے پایئے۔ میں ان کی اس حیثیت مشیخت سے تو کچھ زیادہ واقف نہ تھا البتہ انھیں علوم دینی کا سرگرم خادم مدّت سے جانتا تھا۔ محدث بغوی کی کتاب المصابیح کو سامنے رکھ کر حدیث نبوی ﷺ کا جو ایک بڑا اچھا مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے تبریزی نے تیار کر دیا ہے اسے امت میں قبول عام حاصل ہوا اور وہ صدیوں سے محدثین و فقہاء، دونوں کے ہاں مستند و معتبر چلا آتا ہے، مگر اس کے مؤلف شافعی ہیں، اپنے مذہب کی رعایت، انتخاب حدیث میں کر جانا ان کے لئے بالکل قدرتی تھا، حنفیہ اس باب میں پچھڑے ہوئے تھے، مولانا کو صدیوں کے بعد اس طرف توجہ ہوئی۔ اور ایک نیا مجموعہ اسی انداز کا حنفیہ کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھ کر "زجاجۃ المصابیح" کے نام سے کئی جلدوں میں شائع کر دیا۔ یہ کارنامہ بجائے خود اس قابل تھا کہ ان کی خدمت میں حاضری ضرور دی جاتی، اور ان سے اپنے حق میں دعائے خیر لی جاتی۔ اللہ انھیں عمر نوح عطا فرمائے، سن و سال اندازہ سے زیادہ نکلا۔ قیام مسجد میں رہتا ہے، ضعف نے بہت ہی نڈھال کر رکھا ہے۔ خوب ہوا کہ حاضری ہو گئی، چہرہ پر نور ہی نور تھا۔ بات چیت زیادہ کیا ہوتی، یہی بہت ہے کہ جو مقصود تھا، یعنی دعائے خیر لینا، وہ حاصل ہو گیا۔ ہاتھ پکڑ کر جب اپنے ہاتھ میں لیا ہے، تو قلب کو وہ سرور اور ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ جی یہی کہتا رہا، بس اب یہ ہاتھ اسی ہاتھ میں رہے اور اس کی گرفت کبھی نہ ڈھیلی ہونے پائے! دستگیری جس اہل دلؒ، جس اہل اللہ کی بھی نصیب ہو جائے ایک بے سہارے کے لئے بڑا سہارا ہے!!

مولانا فضل اللہ و مولانا ابوالوفا

طبقۂ علماء کی کافی بلکہ بھرپور نمائندگی کے لئے صرف ایک ہی ذات کافی ہو گی،

مولانا فضل اللہ سابق صدر شعبۂ دینیات کے علم و فضل کے شہرے عرصہ سے سننے میں آرہے تھے۔ مراسلت بھی ہو چکی تھی، دیدار کی نوبت اب آئی۔ امام بخاری کی "الادب المفرد" کو بڑے اہتمام سے شرح و حاشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے اور مستشرقین کی دیدہ ریزی کے ساتھ اسے "ایڈٹ" کیا ہے۔ حدیث ہی کی خدمت مشغلہ زندگی ہے۔ صاحب حدیث کے انوار، کردار و اخلاق کو کہاں تک متاثر نہ کرتے صاف شان نائب رسول کی نظر آئی۔ علم و متانت، تواضع و انکسار کا ایک سر چشمہ اس پر علاوہ حدیث کے دوسرے علوم و فنون سے متعلق وافر معلومات کا ذخیرہ مستزاد۔ افسوس ہے کہ مولانا کو اس وقت شمالی ہند میں کام تھا اس لئے ملاقات کا موقع کم ہی ملا، پھر بھی جتنا ملا دل و دماغ دونوں کی آسودگی ہی کا سامان فراہم کرتا رہا۔ شہر کے مشہور فاضل اور خادم دین، مولانا ابوالوفا افغانی اور ان کے مشہور تر ادارہ لجنۃ المعارف النعمانیہ کے نام اور کام سے ہند و بیرون ہند کے علمی دینی طبقہ میں کون ناواقف ہے؟ حنفیہ کے قدیم علمی ذخیرہ کو اپنی بیش بہا خدمات سے گراں بار کر دیا ہے اور ایسے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ اس میں لگے ہوئے ہیں کہ جیسے دنیا کے اور کسی مشغلہ سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ خوب ہی ملے اور ایک کم علم و کم سواد مسافر کی خوب ہی قدر افزائی کی۔ مولانا باوجود اس کے کہ اُردو پر عبور ایک ہندوستانی کی طرح رکھتے ہیں، ہندی نہیں افغانی ہیں اور اس سن و سال پر بھی اپنے وطن سے بالکل بے تعلق نہیں ہوئے ہیں، کبھی کبھی اب بھی آنا جانا رہتا ہے۔ اور اپنی جوانی تک تو بارہا آئے گئے۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں ایک بار وہیں تھے جب امیر کی بعض جدتوں اور رنگ تجدد سے ملک کے مذہبی طبقہ میں شورش پیدا ہوئی۔ باتیں کچھ ایسی زیادہ متجددانہ نہ تھیں، پھر بھی وقت کے ماحول کے لحاظ سے وہاں کے علماء حق کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئیں۔ امیر کے حکم سے ملکہ ثریا کی سر دربار بے نقابی نے تیل پر دیا سلائی کا کام دیا۔ ایک مشہور و مقبول شیخ طریقت اور قاضی عدالت شیخ عبدالرحمٰن نے خفیہ تبلیغ جہاد شروع کی۔ سرکاری پولیس دونوں کو گرفتار کر لائی۔ خیر شیخ طریقت کی تو جان کسی طرح بچ گئی، قاضی عبدالرحمٰن کو

سزائے موت ملی۔ اور حکم ہوا کہ فوجی طریقہ پر انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ تاریخ موعود آئی تو قاضی صاحب نے کہا کہ وقت آخر کے لئے صرف دو باتوں کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک یہی کہ پہلے وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھوں گا اور اس کے بعد اذان دوں گا۔ حالت اذان میں جس وقت اشارہ کروں عین اسی لمحہ گولی مار دی جائے۔ درخواست منظور ہوئی اور شہادت کا آرزو مند اور جنت کا حریص قاضی حالتِ اذان میں جس وقت شہادت توحید کے بعد شہادت رسالت پر پہنچا، عین اسی لمحہ اشارہ کر کے فرشتۂ موت کو لبیک کہا۔ فوجی دستہ نے باڑھ ماری اور قاضی اپنی مراد کو پہنچ گیا! خوش نصیب قاضی کی قابل رشک موت! بڑے سے بڑے متقی و زاہد کی بھی تمنا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ مولا جس گھڑی بندہ کو حاضری سے سرفراز کرنا چاہے تو بندہ کی زبان پر یہی نغمۂ جانفزا ہو، جو ہر تلخ کو شریں اور ہر مشکل کو آسان بنا دینے والا ہے! ساری عبادتوں کا حاصل، ساری ریاضتوں کا نچوڑ، دو بندھے ہوئے اور مختصر سے فقروں میں!

چند اہل اخلاص

رودادِ سفر ختم پر آگئی۔ نہیں نہیں پھر بھی خدا معلوم کتنوں کے نام زبانِ قلم پر آگئے۔ اکثر کے تعظیم کے ساتھ بعض کے عقیدت کے ساتھ اور محبت کے ساتھ تو کہنا چاہئے کہ سب ہی کے، پھر بھی چار نام ایسے بھی ہیں جو باقی رہ گئے، اور باقی ہی رہیں گے۔ سہواً وہ چھوٹ نہیں گئے قصداً وہ چھوڑ دیئے گئے۔ تین صاحب اس میں خاص بلدہ کے ہیں اور ایک صاحب باہر کے اضلاع میں سے۔ مخصوصین کا طبقہ بھی رفیع ہوتا ہے لیکن کچھ مخصوصین میں بھی اخص و ارفع کے مرتبہ پر ہوتے ہیں۔ یہ وہ اہل اخلاص ہیں جن کی کوئی بھی دنیوی، مادی غرض مجھ سے وابستہ نہ تھی، انھیں مجھ سے کوئی بھی خدمت لینا نہ تھی۔ نہ انھیں اپنے کسی ادارہ یا انجمن میں مجھے لے جانا تھا، نہ مجھ سے اپنی کتاب معائنہ پر کسی قسم کی داد حاصل کرنا تھی۔ نہ اپنا تعارف "صدق" کے ذریعہ سے

کراناتھا۔ انھوں نے خالص اللہ کے واسطے مجھ سے اپنا رشتۂ محبت قائم رکھا۔ یہ مجھے دیکھ کر مسرور اور میں ہر مرتبہ ان کے سامنے فرطِ ندامت سے گویا زمین پر گڑ کر رہا۔ "کل" انکشاف حقائق کے وقت میں تباہ کار تو ان کے کیا کام آؤں گا، الٹے وہی ان شاء اللہ میرے لئے ایک سہارا ثابت ہوں گے۔ ان کا عمل لَا یَزِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا پر تھا اور ان کے پیش نظر یہ کلام ربانی تھا وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى۔ کاغذ پر ان کا ذکر لانا ان کے اخلاص کامل کی ناقدری کرنا ہے ان کا نام لوحِ قلب پر محفوظ رہے گا، اس عالم میں اور ان شاء اللہ اس کے بعد بھی۔ اخلاص و محبت کامل کا، کاروبار، دنیا کے ہر کاروبار سے جدا ہے، اور یہاں کے دستور سے الگ، الفاظ لاکھ لایئے حروف عبارت کی بھرمار ہزار کیجیے، کیفیت قلب کا نقش کیونکر کھینچ سکتا ہے۔ اور عبارت آرائی حقیقتِ وجدانی کی مصوری کہاں سے کر سکتی ہے؟

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست
لیک عشق بے زباں روشن ترست

(لفظ زبان سے شرح و تفسیر لاکھ روشن ہو پھر بھی عشق بے زبان اس سے کہیں بلیغ تر ہے)

عشق کے معنی و مفہوم پر تحقیقی مقالہ تیار کر دینا اور ہے اور خود عاشق ہونا چیز ہی اور۔

گرچہ گویم عشق را شرح و بیاں
چوں بہ عشق آیم خجل باشم ازاں

(عشق کی تشریح و تفسیر میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے لیکن جب خود عاشق ہو کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اتنا کاغذ سیاہ کر ڈالنے پر بھی کچھ نہ لکھ پائے)

حیدر آباد کی کشش

بڑی بڑی عمریں بات کہتے اور لمبی لمبی زندگیاں پلک جھپکاتے ختم ہو جاتی ہیں تو

۱۷، ۱۸ دن کی بساط ہی کیا تھی۔ ابھی حیدر آباد پلیٹ فارم پر آمد ہی ہوئی تھی کہ اسی اسٹیشن سے روانگی کی گھڑی بھی آگئی وہ ۲۹ ر ستمبر کی صبح تھی اور یہ ۱۶ ر اکتوبر کی شام! خوب یقین کے ساتھ شروع ہی سے معلوم تھا کہ قیام بالکل عارضی اور چند روزہ ہے! پھر بھی دل کسی حد تک لگ گیا تھا۔ اور طبیعت در و دیوار سے گلی کوچے سے مانوس ہو گئی تھی چلتے وقت دل کسی درجہ میں ضرور کڑھا۔ بشریت اسی کا نام ہے۔ بندہ کو خوب کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ زمین پر قیام چند روزہ رہے گا۔ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ۔ لیکن باوجود اس عقلی اِذعان کے اور باوجود اس نوید کے مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَآءَہٗ۔ جو بندہ اپنے رب سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے تو اس کا رب بھی اس کی ملاقات کا مشتاق رہتا ہے۔ جب وہاں سے بلاوا آتا ہے تو طبیعت ان وقتی مالوفات کو چھوڑتے کچھ انقباض ہی سا محسوس کرتی ہے۔

رخصت کی گھڑی

خیر جب شام کا وقت آیا تو کچھ لوگ تو گھر ہی مل ملا کر رخصت ہو گئے، اور کچھ لوگوں نے عین اس وقت رخصتی مصافحہ کر لیا، جب ابھی اسٹیشن کی برساتی ہی میں داخل ہوا تھا، پھر بھی گاڑی کے چھوٹتے وقت پلیٹ فارم پر مجمع مخلصوں اور محبوں کا اچھا خاصا ہو گیا، کالجوں کے یونیورسٹی کے جلیل القدر استاد، ایڈوکیٹ، اخبار نویس، بوڑھے جوان سب ہی اس قافلہ میں شامل فرطِ اخلاص، اکثر کی چشم نم سے نمودار بعض رومال سے آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ اور ایک عزیز تو درجہ کے اندر آکر مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رو دیے! جدائی اور رخصت کا منظر بھی کتنا موثر ہوتا ہے۔ غم انگیز مگر لذیذ، تلخ مگر کتنی مٹھاس لئے ہوئے! گاڑی چلی تو عالم ناسوت سے آخری رخصت کا منظر سامنے آگیا۔ اور کسی فارسی گو شاعر کے یہ دو شعر بھی لوح حافظہ پر چمک اُٹھے:

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خندان بدند تو گریاں

آں چناں زی کہ وقت مُردنِ تو
ہمہ گریاں بدند و تو خنداں

(اے بندے! کچھ یاد ہے کہ جب تو پیدا ہوا تو سب کے چہروں پر خوشی کی ہنسی تھی اور ایک تو رو رہا تھا۔ اب زندگی یوں گزار اور دنیا میں یوں بسر کر کے جب دنیا سے اٹھنے کا وقت آئے تو سب رو رہے ہوں اور ایک تو خوش ہے، مگن ہے کہ واپسی اپنے اصلی وطن کو اور حاضری اپنے مولا کے دربار میں ہو رہی ہے!)

اے سب کے سننے والے! اس تباہ کار کے حق میں یہ مضمون شاعری نہیں، واقعہ اور حقیقت بن کر رہے، سب کی آنکھوں میں آنسو ہوں اور کانوں میں اپنے بشارت یہ آ رہی ہو کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔ اب دیر کیا ہے، اے بندے میرے مغفور بندوں میں شامل ہو اور میری مرضیات کی جنت میں داخل ہو جا! آرزو اس غلط شہرت کی ہرگز نہیں کہ ایک عالم وفاضل اُٹھ گیا، ایک عابد وزاہد اپنی جگہ خالی کر گیا۔ دُعا صرف اتنی ہے کہ زمین والے زبان پر یہ لائیں کہ ہمارا ایک مخلص مشیر چلا گیا اور عرش والا یہ گواہی دے کہ ہاں یہ ہمارے دین کی تھوڑی بہت غیرت رکھنے والا ہمارے حضور میں حاضر ہو گیا۔



دھلی

سیر دہلی

دوستوں، مخلصوں کا مدت سے اصرار چلا آ رہا تھا کہ دہلی کی حاضری دی جائے۔ اپنا جی خود بھی یہی چاہ رہا تھا لیکن اپنا لگا بندھا کام چند روز کے لئے بھی چھوڑ، سفر کرنا اب دشوار سے دشوار تر ہو گیا ہے۔ اس لئے بات برابر ٹلتی ہی گئی۔ گورنر ریاست بہار ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے دہلی میں ملاقات کا وعدہ پرانا تھا اس لئے جب موصوف نائب صدر جمہوریہ ہو کر دہلی آ گئے تو قدرۃً یہ تقاضا طبیعت میں زیادہ قوی ہو گیا۔ پھر بھی وقت نہ نکلنا تھا نہ نکل سکا...... ایک زمانہ تھا کوئی ۶، ۷ سال کی طویل مدت کا اکتوبر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک جب پہلے ہمدرد، کامریڈ اور خلافت کمیٹی کے سلسلے میں اور پھر نفس نفیس محمد علیؒ کے لئے دہلی بار بار اور جلد جلد جانا ہوتا رہتا تھا اور ایک دور اس سے بھی قبل کا تھا (۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء) جب آستانہ نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ کی کشش بار بار اور کبھی کبھی لمبی مدتوں کے لئے دہلی لے جاتی تھی!...... آہ عمر گزشتہ کی پلٹ کر نہ آنے والی اور ہمیشہ کے لئے داغ حسرت بن جانے والی دلچسپیاں!

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!

بہر حال جوں توں وقت تین دن کا قیام دہلی کے لئے نکالا، آمد و رفت کا ایک ایک دن اس کے علاوہ اور ۱۸ اگست کو صبح ۷ بجے کے بعد دہلی وارد ہو گیا۔

پارلیمنٹ کا اب تک نام ہی سنا تھا اور سڑک سے کبھی کبھی اس کی عمارت دیکھ بھی لی تھی۔ بحیثیت مجموعی اب تک اس کی حیثیت "دیدہ" سے زیادہ "شنیدہ" ہی کی تھی۔ ابکی پہلی بار اس کی زیارت کا موقع ملا۔ راجیہ سبھا کا پاس مل جانا تو کچھ ایسا دشوار نہ تھا جبکہ اس کے صدر خود نائب صدر جمہوریہ تھے۔ اور پاس (چیئرمین کی گیلری کا) انھیں کے دستخط سے ملتا تھا البتہ لوک سبھا کا پاس ملنا خاصا دشوار نظر آیا اس لئے کہ عین اسی دن

اتفاق سے گورنمنٹ پر عدم اعتماد کی تحریک آرہی تھی۔ اور اس کے شوق میں تماشائیوں کا وہ ریلا تھا کہ خدا کی پناہ! جس گیلری میں ۳۰ کی گنجائش تھی اس میں ۷۰، ۷۵ کس طرح دھنسے ہوئے تھے۔ خیر یہاں کا پاس بھی بالآخر محترم میزبان نائب صدر جمہوریہ ہی کے اسم اعظم کی برکت سے حاصل ہوگیا۔ اور اسپیکر گیلری میں گھس گھسا کر رسائی ہوگئی...... عمارت لکھنؤ کے کونسل چیمبر کی بھی اپنے نزدیک کچھ کم شاندار اور مرعوب کن نہ تھی لیکن اس پارلیمنٹ ہاؤس کی ہیبت و جلال، رفعت و عظمت، طول و عرض کے آگے اس کی بساط ہی کیا اونٹ پہاڑ کے نیچے! نام جمہوریت کا لیجئے اور اصطلاح سوشلزم کی استعمال کیجئے بادشاہت بہر حال بادشاہت ہے، دبدبہ و طنطنہ جاہ و جلال ٹھوس حقیقت کے لحاظ سے ملوک و سلاطین کے دیوان عام اور اس قصر جمہوریہ میں اصلاً فرق نہیں!

دونوں ہاؤسوں (ایوانوں) کی سرسری گھنٹہ دو گھنٹہ کی سیر سے اتنی بصیرت حاصل ہوگئی، جتنی محض اخبار میں ان کی کارروائیاں پڑھتے رہنے سے مہینوں کیا برسوں میں بھی نہیں حاصل ہوتی، کہاں صورت کہاں تصور کجا حقیقت کجا اس کا عکس...... جتنا وقت یہاں صرف ہوا بحمد اللہ ضائع نہیں ہوا۔ مشاہدہ کہئے یا مطالعہ بہر حال تجربہ آموز و بصیرت افروز ہی رہا۔

دہلی دار السلطنت، مزارات و مقابر کا بھی ہے بقول حالیؔ ؎

چپہ چپہ پہ ہوئے یاں گوہر غلطاں تہ خاک!

آستانہ نظام الدین اولیاء خواجہ نظام الدینؒ سے ربط خصوصی اس سیہ قلب کو قدیم سے ہے۔ مدتوں رہ چکا ہے اور حاضری کا اتفاق بھی یہاں (خواجہ حسن نظامی مرحوم کی مہمان نوازی کے طفیل) بارہا رہ چکا ہے۔ اب کی حاضری کی نوبت سالہا سال کے بعد آئی۔ خیال یہی تھا کہ اب قلب میں قساوت و باطن میں تیرگی بہت آگئی ہے۔ حاضری کچھ بیکار ہی سی ہوگی لیکن اللہ والوں کے فیض کے در اللہ شاید ہمیشہ ہی کھلے رکھتا ہے،

حاضری گو چند منٹ کے لئے ہو سکی پھر بھی وجدان کو پورے لطف و سرور کی نعمت حاصل رہی۔ وہی شفقت وہی کرم وہی ذرہ نوازی وہی لطف فرمائی!...... بالمومنین رؤف رحیم کے جانشینوں کی شان بندہ پروری پوری تابانی کے ساتھ!

ایک مخلص کی رفاقت نے قطب مینار، بختیار کاکیؒ کے آستانہ پر بھی رسائی کرادی۔ یہاں کے بھی انوار جمال کا کیا پوچھنا!...... دل میں تمنا اپنے ممدوح و محبوب مولانا حفظ الرحمٰن کی بھی تربت پر فاتحہ خوانی کی تھی، آرزو پوری ہوئی اور ان مرحوم کے نصیبے پر کچھ رشک سا آگیا۔ جسد خاکی کو جگہ ملی تو کہاں؟ حقیقی شاہان دہلی یعنی خاندان ولی اللٰہی کے مزارات کے وادی ایمن میں۔ مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مغفور بھی مزے میں رہے، قطب کے جوار رحمت میں آسودۂ خاک ہیں۔ مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام (دونوں کی تربتیں اللہ ٹھنڈی رکھے) کے مرقدوں کی طرف سے بھی بار بار گزر ہوا اور کتنی پرانی یادیں خوشگوار اور حسرتناک بھی، ہر بار تازہ ہوگئیں!

خواجہ حسن نظامی کی قبر کا کتبہ پڑھ کر آنکھیں قدرۃً نم ہوگئیں اور مزار غالب پر پہنچ کر وجدان نے شادمانی محسوس کی...... اپنے مرحوم عزیز شفیق الرحمٰن قدوائی جامعی (سابق وزیر تعلیمات دہلی) کی قبر پر بڑی للک کے ساتھ گیا۔ لیکن جاکر غم کے ساتھ غصہ کو بھی تحریک اچھی خاصی ہوئی۔ "قبر"! قبر تھی کہاں؟ بتانے والے کے اصرار کے باوجود یقین نہ آیا کہ کسی مسلمان کی قبر اس شکل وہیئت کی ہو سکتی ہے! اسلامی قبر کی مطلق کوئی بھی علامت نہیں! محض ایک بہت بڑا سا بالکل گول چبوترہ بنا ہوا! ہو بہو کسی اندازے کنویں کی جگت! یا زیادہ سے زیادہ کسی ہندو فقیر کی سمادھی کہہ لیجئے۔ واللہ اعلم یہ کن صاحب کی "جدت" یا دماغ کی اپج ہے اور خدا معلوم ارباب جامعہ اس باب میں اپنی ذمہ داری کیوں نہیں محسوس کرتے!

نئی دہلی کی کوٹھی جس میں قیام ہوا، اب اس میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ

ایک زمانہ میں رفیع قدوائی مرحوم کی تھی۔ یہیں ایک بار آکر ان سے ملا تھا۔ اور ایک بار یہاں آکر کھانا کھایا تھا۔ قدم رکھتے ہی ان کی ایک ایک بات یاد آئی۔ سرکاری حلقوں میں اور انتظامی حیثیت سے جو شہرت انھوں نے مستعدی، کارگزاری، دیانت، فرض شناسی کی پائی اور جس طرح مسلمان وزراء کی وقعت بڑھائی یہ تو انھیں کا حصہ تھا، باقی ذاتی حیثیت تو ان کی مہمان نوازی فیاضی اور جذبہ خدمت خلق بھولنے والی چیز ہی نہیں۔ پورا مہمان خانہ وہاں قائم تھا، گویا ایک مستقل لنگر جاری! جس سڑک پر یہ کوٹھی نمبر ۶ واقع ہے اس کا نام پہلے تھا کنگ ایڈورڈ روڈ اور اب ہے مولانا آزاد روڈ۔ سڑک کی تختی پر یک بیک نظر پڑی اپنے ساتھ مولانا کی خوشگوار یادوں کو بھی تازہ کر گئی۔ فراخ دلی، رواداری، حلم و تحمل میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان سے بھی ان کے زمانہ وزارت میں ملاقاتیں ایک سے زائد بار ہوئیں تھیں اور ان کی میزبانی کا لطف بھی اٹھایا تھا۔ اپنے تدبر، نکتہ رسی و فراست کا قائل گاندھی جی اور جواہر لال تک کو کر لیا تھا۔ سردار پٹیل تک کو ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور مسلمانوں کو ان کی زندگی تک...... یہ خیال و اطمینان رہا کہ کانگریس اور حکمران جماعت میں ایک آدمی تو ہمارا موجود ہے۔ واردات سفر سے کسی قدر غیر متعلق ہستی پھر بھی موقع پڑ جانے پر دوستوں، محبوں، بزرگوں کی خوشگوار و لذیذ یادوں کا امڈ آنا کچھ ناگزیر سا ہے۔

دہلی میں دیکھنے کی چیزیں دس، بیس، پچاس نہیں بلا مبالغہ سیکڑوں میں ہیں، اور مجھ سے کتابی کیڑے کے لئے سب سے بڑی رغبت و کشش کی چیز یہاں کی لائبریری یا کتب خانے خود بھی تعداد میں خدا جانے کتنے، خیر سب کیا معنی دو چار تک بھی پہنچ اس قلیل مدت قیام میں ممکن نہ تھی۔ جی نے ٹھانی کہ کم سے کم ایک کو تو دیکھ ہی لیا جائے اور قرعہ ایک سرکاری کتب خانہ NATIONAL ARCHIVES (قومی محافظ خانہ) پر پڑا۔ یہ محافظ خانہ کاغذات و دستاویزات قدیم، قائم تو مدت دراز سے انگریزوں کے زمانے ہی سے ہے، وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام کی توجہ نے چار چاند لگا دیے۔

اس کی سرسری سیر کا اشتیاق بدرجہ کمال تھا سرکاری محکمہ اور پھر اپنے نہایت بیش قیمت قدیم سرکاری سیاسی و خفیہ کاغذات کی بنا پر نہایت درجہ حفاظت و رازداری کا مرکز، پاس وغیرہ کے جھمیلے ہمت شکن لیکن وہی "اسم اعظم" میزبان محترم کا ایک بار پھر کارگر ہوا ......اور رسم و ضابطہ کی خانہ پری کے بعد بالآخر رسائی ہو گئی...... دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اوپر نیچے تہ بہ تہ منزلوں میں کتابوں، مجلدات و دفاتر کا ایک پورا جنگل۔ ہر منزل کے ہر کمرے میں فرش سے لے کر بلند چھت تک ہر الماری اور اس کے ہر خانہ میں کتابوں کے انبار اور کتابیں بھی کثرت سے ضخیم و طویل و عریض۔ غرض ذخیرہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ وسیع و شاندار لق و دق اور قلمی فرمانوں، شاہی مہروں دستخطوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں! ساری کتابیں اگر ایک سیدھے خط میں پھیلائی جائیں تو دو چار فرلانگ نہیں وہیں کے ایک ذمہ دار شخص نے بیان کیا کہ ۲۰ میل کا فاصلہ درکار ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان تعداد کا سرسری جائزہ بھی دو ڈھائی گھنٹے کے اندر آسان نہ تھا بس گویا ایک خواب سا دیکھ لیا اور اتنی بھی دیکھ بھال تاک جھانک محض مہتمم محافظ خانہ یا ڈائریکٹر آرکائیوز جناب کے۔ ڈی۔ بھارگو ہی کی عنایت سے ممکن ہوئی جو خلق مجسم ثابت ہوئے اور پورے وقت برابر ساتھ رہے۔ یہ دوسرے علوم اور زبانوں کے علاوہ فارسی کے بھی ماہر ہیں اور ان غیر مسلموں میں سے نظر آئے جن کی ذات سے ملک میں اب تک سیکولرزم کا بھرم قائم ہے۔ شعبہ فارسی کے انچارج ترمذی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اپنے کام میں خاصے مستعد و سرگرم دکھائی دیے۔

دتی پرانی دتی بھی ۳۰، ۴۰ سال کے عرصہ میں بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہے اور بعض محلوں میں تو انقلابی حد تک، پھر بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ اور کسی قدر تامل کے بعد پرانے پتے نشان مل جاتے ہیں، اصلی انقلاب نئی دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں آیا ہے۔ نئی دہلی اب نئی دنیا نظر آتی ہے اور اپنی عمارتوں کی ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے ہلکا اور ابتدائی نمونہ نیویارک کا! لکڑی کی جگہ ہر عمارت کا ڈھانچہ لوہے کا، اور چار

چار پانچ پانچ منزلوں کی عمارتیں دور سے دیکھے تو گمان گزرے کہ کسی ستم ظریف نے یہ سر بہ فلک کابکیں کبوتروں کے لئے کھڑی کر دی ہیں! یہ دیو پیکر کبوتر خانے آج سے چند سال قبل قابل مضحکہ ہوتے، مگر اب عین فیشن میں داخل ہیں! کوئی بھلا آدمی ایسی تعمیریں کرتا تو اپنے ہونق پنے پر نکو بن جاتا لوگ اس پر تالی پیٹ دیتے، لیکن اب یہی عمارتیں کیا وزیر کیا امیر کیا رئیس اور کیا سیٹھ سب ہی کے نشیمن ہیں اور کسی کی شامت آئی ہے جو ان پر ہنس سکے۔ بمبئی اور کلکتہ کی آبادیاں تو ایسی عمارتوں سے پٹی پڑی ہیں، اب نئی دہلی کی کچھ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں انقلاب زندہ باد کی دہائی دیتی ہوئی اس راہ پر چل پڑی ہیں۔ نامور انگریزی روزناموں اسٹیٹسمین، ٹائمنز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمنز کی جگمگاتی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی ہوئی عمارتیں سڑک پر سے بار بار نظر سے گزریں اور خیال آیا کہ انھیں شال دوشالہ والوں کی سرزمین پر کہیں کسی تنگ گلی میں ہمارے الجمعیۃ اور دعوت ، اور ریڈینس (RADIANCE) والے بھی اپنی کمبلوں اور گدڑیوں میں مست پڑے ہوں گے۔ عمارتوں کا تیرہ و تار ہونا کسی زمانہ میں عیب تھا اب ہنر ہے۔ لکھنؤ کے کونسل چیمبر وغیرہ کا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ کمروں بلکہ کہیں کہیں برآمدوں تک میں شمع کافوری نہیں۔ بجلی کے پر قوت لمپ دن دوپہر جل رہے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا سارا کام بجائے سورج کے اس مصنوعی روشنی میں انجام پا رہا ہے۔ دلی آخر پایہ تخت ہے اس کے قدم لکھنؤ سے بھی کہیں آگے! ...... عجب کیا کہ کوئی ڈاکٹر صاحب یہ حکم لگا دیں کہ مصنوعی روشنی سے بینائی خوب تیز ہو جاتی ہے اور قدرتی روشنی کی مضرتوں سے امن ہو جاتا ہے۔

دریا گنج کی سڑک سے جو کہنا چاہئے کہ نئی اور پرانی دہلی کے درمیان حد فاصل ہے، گزر بار بار ہوا۔ یہی وہ سڑک ہے جس پر ڈاکٹر انصاری مرحوم کی مشہور کوٹھی تھی۔ سارے قومی کارکنوں کی مستقل مہمان گاہ! اور بعد کو ۱۹۴۷ء کی تباہی تک انجمن ترقی اُردو کا مرکزی دفتر بھی اسی کوٹھی میں رہا۔ کیسے کیسے جمگھٹے بابائے اُردو عبدالحق کی ذات سے یہیں ہوتے رہتے تھے۔ اور کوچہ چیلان کا مشہور دفتر ہمدرد کامریڈ اس سڑک کی

ایک شاخ پر واقع پھاٹک پر تختی محمد علیؒ کے نام کی کندہ! گاندھی جی کا تاریخی شہرت والا ۲۱ روزہ فاقہ اسی مکان سے شروع ہوا تھا۔ اس دن کا سارا ہنگامہ خیز منظر نظروں کے سامنے پھر گیا۔ بی اماں مرحومہ کا جنازہ اسی مکان سے اُٹھا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے برسوں کہنا چاہئے کہ اسی مکان سے صادر ہوتے رہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے پہلے حکیم اجمل خاں مسیح الملک اور بعد کو مولانا ابوالکلام کی صدارت میں یہیں ہوتے رہتے تھے! اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر مکان واحدی صاحب اور راشد الخیری مرحوم کے تھے۔

اور اب کیا بتایا جائے کہ کیسے کیسے حسرت ناک نقشے اس سڑک سے گزرتے ہوئے ہر بار نظر کے سامنے پھر گئے۔

ہندوستان میں چند سال ادھر تک شاید سب سے بڑا اور شاندار اور خرچیلا ہوٹل بمبئی کا تاج تھا۔ دہلی کا نیم سرکاری ہوٹل اشوک، آخر اس سے بھی نمبر لے گیا۔ جی میں تھا کہ ایک بار اس کی زندگی کا مشاہدہ بھی اپنی آنکھ سے کیجئے۔ شنید اور دید میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خیر اتنا وقت کہاں تھا کہ پورے ۲۴ گھنٹے صرف کر کے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا جاتا پھر بھی ایک سہ پہر کو گھنٹہ بھر کا وقت تو نکل ہی آیا...... قصر معلا چھوٹے چھوٹے والیان ریاست کا تو کیا بعض خاصے بڑے رئیسوں کا بھی مشکل سے اس کا مقابلہ کر سکے گا۔ دوسرے ہوٹل کا ترجمہ "فرودگاہ" یا "قیام گاہ" صحیح ہوگا۔ اسے تو قطعاً "عشرت خانہ" کہنا چاہئے۔ راحت و آسائش ہی کا نہیں تزئین و آرائش، عیش و عشرت کے سارے سامان مکمل یا "اپ ٹو ڈیٹ" ٹھہرنے کے کمرہ کا سب سے ادنیٰ نرخ ۵۵ روپیہ یومیہ کا اور اس طرح درجہ بدرجہ اور سب سے اعلیٰ کمرہ ۲۵۰ روپیہ روزانہ، ڈاکخانہ، تار گھر، بینک، مرصع جواہر نگار زیورات کی دوکان، ساریوں وغیرہ بیش قیمت زنانہ ملبوس کی دوکان وغیرہ ہر چیز ہوٹل کے اندر ہی موجود اور شراب گھر اور ڈانس ہال "ناچ گھر" کا تو پوچھنا ہی کیا، سب کے علاوہ خاص مغربی مذاق کا بڑا سا حوض یا تالاب بھی موجود، کنارے غسل آفتابی اور حوض کے اندر غسل آبی کا انتظام نیم برہنگی کے ساتھ

ہر وقت لیس۔ ماکولات و مشروبات کی گرانی کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ چائے کی صرف ایک پیالی کی قیمت ڈیڑھ روپیہ! فرنگی مہمان ہر جنس اور ہر سن کے اس میں (اکثر غالباً امریکی) کثرت سے ٹھہرے ہوئے اور ہندوستان کے بھی کچھ راجے مہاراجے قسم کے۔ باہر کے سیاح کو کیسے یقین آئے گا کہ اس شہر کے دوسرے حصوں میں ہزارہا مخلوق رات کو بھوکی سوتی ہے اور کپڑے کی ایک ایک چادر کو ترستے اس کی عمر گزر جاتی ہے۔

اور ایک اس ہوٹل پر کیا موقوف ہے کناٹ پلیس کے طویل و عریض چوراہے پر بلکہ اس پورے فیشن ایبل بازار میں کہیں بھی کھڑے ہو کر دیکھ لیجئے کہ دنیا کسے کہتے ہیں، کھاتے پیتے چلتے پھرتے سینما کے شوقینوں اور زیورات اور فینسی ملبوسات کے خریداروں کا وہ ریلا کہ راستہ چلنا دشوار اور قطار در قطار موٹروں کا وہ ہجوم کہ سڑک کا پار کرنا ایک کارنامہ ایک سیلاب رنگ و بو ایک طوفان آرائش و زیبائش، یہ تصور کرنا ہی مشکل کہ اس ملک میں کچھ ننگے اور بھوکے بھی بستے ہیں۔ غفلت و مادیت، نفس پرستی کے اس ماحول میں خالق و آخرت کی یاد ۲۴ گھنٹوں میں اگر چند لمحوں کے لئے آجائے تو ایک کرامت ہے!

بات میں بات نکلتی آئی۔ اور بات بڑھتی اور چلتی ہی چلی گئی، مخلصوں اور محبوں سے ملاقات کا ذکر ہی نہ آنے پایا۔ قیام گاہ پر پہنچتے ہی تھوڑی دیر بعد جو فون آیا وہ سپریم کورٹ کے نامور سینئر ایڈوکیٹ اور الہ آباد ہائیکورٹ کے سابق جج شیو پرشاد سنہا کا تھا۔ اونچی پریکٹس والے ایڈوکیٹوں کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے اس لئے ان سے جواب میں عرض کیا گیا کہ آپ تکلیف نہ کریں لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے آدھ گھنٹے میں آموجود! PRO MUSLIM (یعنی مسلم دوست) ہونے میں اکثر ہندوؤں سے کیا بہت سے مسلمانوں سے بھی چند قدم آگے۔ مسلم صوفیہ کے بڑے عقیدت مند اور فارسی کے صوفی شعراء کے دلدادہ۔ شروع زندگی میں فیض آباد کے نیم مجذوب و صاحب حال بزرگ سے ایک خاص موقع پر بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور وہی تاثر اب

تک قائم ہے۔

دوسری ملاقات سرکار ہند کے سابق سیکرٹری محکمہ تعلیمات اور سابق سفیر ایران ڈاکٹر تاراچند (ممبر راجیہ سبھا) سے ان کی کوٹھی پر جا کر ہوئی۔ مسلمانوں کے علوم و فنون پر گہری نظر رکھنے والے اور تاریخ اسلام کے تو کہنا چاہئے کہ ماہر، دیوان حافظ بلکہ مثنوی رومی تک کے پڑھنے والے ہندو تو خاصی تعداد میں نکل آئیں گے، لیکن مکتوبات مجدد سرہندی کو اصل فارسی میں پڑھ ڈالنے والا کوئی دوسرا ہندو ان کے سوا میری محدود نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی نجی گفتگو بھی اسلامی تاریخ کے موضوع پر ایسی ہوتی ہے کہ اسے برابر سنا جائے اور استفادہ کیا جائے۔ شہزادہ داراشکوہ نے اپنے زمانہ میں ہندوؤں کی مشہور اپنشد کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کرایا تھا اس کا تذکرہ ہی اب تک سننے میں آیا تھا۔ انھوں نے اس کے ضخیم اور تازہ فارسی ایڈیشن کی زیارت کرائی جسے خود انھوں نے ایک ایرانی فاضل کو ساتھ لے کر تصحیح و مقابلہ کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے اور یہ ضخیم دفتر بجائے خود ان کے علم و کمال کی ایک زبردست یادگار ہے۔ اسی سڑک (تغلق روڈ) پر ان سے چند قدم کے فاصلے پر ڈاکٹر سید محمود (سابق وزیر وغیرہ) کی کوٹھی ہے۔ میرے بہت قدیم و مخلص کرم فرما راجیہ سبھا کے اب بھی ممبر ہیں اور علمی و سیاسی دونوں قسم کے کام کچھ نہ کچھ کئے جاتے ہیں گو بیچارہ کی صحت اب مستقل طور پر خراب رُہنے لگی ہے۔ اُن سے ملاقات حسب توقع بے تکلفانہ رہی۔

جامعہ ملیہ سے اس کے ابتدائی علیگڑھی دور یعنی بانی جامعہ مولانا محمد علیؒ کے زمانہ میں تعلق بہت گہرا اور مخلصانہ رہ چکا ہے، بعد کے دونوں پرنسپلوں عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے بھی ربط مخلصانہ رہا۔ اسٹاف کے دوسرے ارکان حافظ اسلم جیراجپوری، خواجہ عبدالحئی، مولانا محمد سورتی وغیرہم بھی کرم فرماتے رہے۔ اور شفیق الرحمٰن مرحوم تو اپنے عزیز ہی تھے۔ پرنسپل مجیب سے بھی رشتہ برادری اور قرابت کا پہنچتا ہے، گو نظریات الگ الگ ہیں۔ ان سے ملنا جلنا جب بھی ہوتا ہے ان کے والد ماجد

مولوی محمد نسیم صاحب مشہور ایڈوکیٹ لکھنؤ کا چہرہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ میرے بزرگ بھی تھے اور محسن بھی۔ بہر حال دعوت پا کر سہ پہر کی چائے ناشتہ پر حاضری لازم ہو گئی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر سعید انصاری، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، اسی لطف بشاشت اور تپاک سے ملے جو ان کا معمول تھا۔ حافظ فیاض کی زیارت سالہا سال کے بعد ہوئی۔ قدیم جامعہ کے مخلص وفاداروں میں اب سب سے پرانے وہی ہیں نئے چہرے بھی دو ایک نظر آئے۔ ان میں ضیاء الحسن فاروقی سے مل کر بات چیت کا جی چاہا افسوس ہے کہ موقع نہ ملا۔ سب سے بڑھ کر مستعد کارگزار صاحب فہم رسالہ "جامعہ" کے ایڈیٹر عبد اللطیف اعظمی نظر آئے۔ اور یہ بعد کو اسٹیشن رخصت کرنے بھی آئے۔ مغرب کا وقت قریب آ گیا اور نماز جا کر محمد علی ہال میں پڑھی جو مسجد کا کام دے رہا ہے۔ جامعہ کی موجودہ حالت کی ابتری دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے بہت کچھ سننے میں آ چکی تھی، لیکن نماز مغرب کی حد تک تو صحیح نہ نکلی۔ نمازیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اور چھوٹے طلبہ تو کثرت سے تھے۔ مسلمان طلبہ کی تعداد کا مسئلہ بہت اہم تھا اور بہت اہم ہے اور خدا نہ کرے کہ اسلامی عنصر کی اہمیت گھٹتی اور رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی جائے۔ گو یہ بھی ظاہر ہے کہ قدیم اسلامیت کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا اب کسی کے بس کی بات نہیں۔

ایسی ہی ایک دوسری پر لطف صحبت بڑے پر تکلف چائے ناشتہ کی صحبت درگاہ حضرت نظام الدین میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے صاحبزادے حسن ثانی نظامی (یا حسن نظامی ثانی) کے ہاں منعقد ہوئی۔ خواجہ صاحب کی گوناگوں حیثیتیں اور جو کچھ بھی ہوں بہر حال وہ اردو کے ایک بڑے اچھے لکھنے والے اور بڑے اچھے دوست، ملنسار، متواضع مہمان نواز اور خدمت کا شوق وولولہ رکھنے والے تھے۔ مدتوں اُن سے تعلقات مخلصانہ بلکہ عزیزانہ رہے۔ اور بارہا ان کے ہاں مہمان رہ کر نمک خواری کا لطف اٹھایا۔ اخیر ۱۹۲۲ء میں مسلسل کئی ہفتے ان کے مہمان خانے میں قیام کے گزارے تھے۔ ایکی عصرانہ اسی مکان کے ایک حصہ میں رہا اور ۴۰ سال قبل کی بے ثبات و تغیر پذیر دنیا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا! لڑکے کم سے کم مہمان نوازی کی حد تک تو اپنے والد

بزرگوار ہی کے نقش قدم پر نظر آئے۔ ان کی والدہ کی خدمت میں بڑے تاثر کے ساتھ اپنا سلام نیاز کہلایا۔ یہیں جمعیۃ علماء کے ناظم مولانا محمد میاں سے ملاقات ہوئی اور جامعہ کے استاد مولانا زین العابدین سے بھی دوبارہ۔ جمعیۃ علماء کے ذکر پر نام صاحب الجمعیۃ مولانا فارقلیط کا یاد پڑ جانا قدرتی ہے۔ ان سے لطف مکالمت و مجالست دو بار رہا۔ ایڈیٹروں کی صف میں دل دردمند کے ساتھ ایسا مسکیں و بے زبان بلکہ بے نفس کم ہی دیکھنے میں آیا۔ عمر کے لحاظ سے شاید دیرینہ سال لیکن قلم کے لحاظ سے ماشاء اللہ ہر طرح جوان تنومند۔ اللہ ان کے اخلاص اور ان کے قلم کی روانی دونوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔

جماعت اسلامی ہند کے نام اور اس کی فعالیت سے ملک کے طول و عرض میں کون ناواقف ہے، اس کے امیر مولانا ابو اللیث ندوی اپنے اخلاص ہی نہیں بلکہ اپنی آدمیت، مصالحت پسندی، سنجیدہ مزاجی و متانت فکری کے لحاظ سے بھی ہر طرح اس منصب کے اہل ہیں اور رزم سے کہیں زیادہ بزم کے آدمی ہیں۔ فرطِ محبت انھیں اسٹیشن بھی کھینچ لائی۔ اور پھر ایک دن اپنے دفتر میں دھوم دھام سے کھانا کھلایا (یہ دھوم دھام نہ تکلف کے مرادف ہے اور نہ اخلاص و سادگی کے منافی) یہیں روزنامہ "دعوت" کے کارکنوں سے ملاقات رہی اور نئے انگریزی ہفتہ وار RADIANCE کے ایڈیٹر عبد الرؤف (مدراسی) سے تعارف ہوا، دوسروں کے درجنوں انگریزی روزناموں اور ہفتہ واروں کے سامنے انگریزی کے اس ایک مسلم ہفتہ وار کی بساط ہی کیا ہے۔ لیکن اپنی ملت کی قسمت کو کیا کہہ کر روئیے کہ اتنا کام بھی کسی دوسرے سے نہ بن پڑا۔ توفیق ہوئی تو اسی جماعت کو ہوئی اور پرچہ نکالا بھی تو اپنی مخصوص جماعت کا نقیب بنا کر نہیں، بلکہ ساری اُمت اسلامی کی آواز کی حیثیت سے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی والے تقریر تحریر تنظیم میں خوب برق ہیں، لیکن خشیت قلب کی دولت ان کے حصہ میں کچھ واجبی ہی آئی ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح ہو بھی تو اس میں شرمانے، جھجکنے کی کیا

بات ہے۔ کلمہ ایمان میں اقرار لسانی کو تصدیق قلبی کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا ہے بلکہ ذکر میں مقدم رکھا گیا ہے۔ اسلام کے تنظیمی پہلو کو نمایاں کرنا بھی دین کی خدمت اور حق ہی کی ایک شکل ہے۔

دہلی میں چاندنی چوک سے اگر گزرنا ہوا ہو تو عجب نہیں کہ نظر گھڑیوں کی ایک بڑی اور شاندار دوکان پر پڑی ہو۔ پکارڈ واچ کمپنی کے نام سے اس کے مالک الحاج محمد شفیق صدق ومدیر صدق کے قدیم مخلص ہیں اور ان کے چچا پریمیر واچ کمپنی کے مالک، گویا پیشہ ان کا خاندانی اور اس اعتبار سے انھیں "ابوالوقت" اگر قرار دے دیا جائے تو کیا بیجا ہے۔ دن میں کامیاب تاجر اور رات میں عبادت گزار، جماعت تبلیغی کے خصوصی خادم وکارکن، دین ودنیا کی یہ جامعیت خوش نصیبوں ہی کے حصہ میں آتی ہے۔ اپنے گھر لے جاکر کھلایا پلایا، بعض مزارات پر ساتھ لے گئے اور ہر طرح بھی خاطر مدارت میں لگے رہے، اور جب میں دہلی سے رخصت ہو رہا ہوں تو تحفہ تحائف کا ایک بنڈل لئے ہوئے اسٹیشن پر موجود! ناشتہ کی لطافت وشیرینی یوں ہی کیا کم تھی اس پر ان کے اخلاص کی حلاوت کا اضافہ!

دِلّی بے شمار قابل دید چیزوں کا شہر ہے۔ لیکن یہاں پہنچ کر اگر آپ نے دواخانہ ہمدرد اور اس کے متعلقات کو نہ دیکھا تو کچھ نہ دیکھا۔ یونانی دواخانے بڑے بڑے شہرت ونیک نامی والے پہلے بھی تھے اب بھی ہیں اور کئی تو اسی شہر دہلی میں ہیں، لیکن ہمدرد کی آن ہی دوسری شان ہی نرالی ہے۔

بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

دوخانہ اوّل تو خود ہی "ایک بحر ناپید اکنار" خدا جانے کتنے شعبوں اور صیغوں میں تقسیم اور ہر شعبہ اپنی وسعت، اپنے تنوع، اپنے انضباط، اپنے سلیقہ، اپنی کارکردگی، اپنی صفائی، غرض اپنے ایک ایک کرشمہ سے دامن دل اور دامان نظر دونوں کو اپنی طرف کھینچ لینے والا۔ شربت سازی کے شعبہ میں قدم رکھئے تو بے پیاس کی پیاس لگ آئے۔

اور خواہ مخواہ اس آب طہور کے گلاس پر گلاس چڑھانے کو جی چاہے۔ سینکڑوں نہیں ہزار ہا بوتلیں خوش رنگ اور جھلکتی ہوئی وردی پوش پلٹنوں کی طرح امراض سے مقابلہ کو صف بستہ اور ماء اللحم کی تو پوچھئے ہی نہیں۔ حافظ شیرازی اور ریاض خیر آبادی اگر اس کوچہ میں آنکلتے تو بادۂ گلگوں کے جاموں پر لاحول بھیج کر عجب نہیں اس کے زمزمے سنانے لگتے اور شیخ کے وعظ اور محتسب کے تازیانے کے بغیر ہی رند بلانوش سے صوفی صفا کوش بن جاتے۔ جہاں دوائیں کٹتی ہیں وہاں کے کھرل دیکھئے تو دیو پیکر! ظفر علی خانی صحافت کے لفظ "البرز شکن" کی یاد دلانے والے۔ غرض مرکبات، مفردات، تشخیص امراض وغیرہ کے جس حصہ میں بھی جائیے قدرت حق کے نظارے کا لطف اٹھایئے اور حکیم صاحب کے حسن انتظام اور ان کے کاروبار کی وسعت وعظمت پر عش عش کیجئے...... جزئیات کی تفصیل اگر بیان ہو تو عجب نہیں کہ پڑھنے والے کو ٹھوس واقعات اور سنجیدہ حقائق پر گمان "فسانہ عجائب" کا گزرے اور حکیم صاحب کے کتب خانہ کی ماشاءاللہ وسعت وجامعیت تو خود ایک مستقل عنوان کی محتاج۔

اور یہ سارا لق ودق کاروبار اور لکھوکھا کی جائیداد بجائے ذاتی ہونے کے اب ایک وقف کے ماتحت اور حکیم صاحب بجائے اس کے مالک بلاشرکت غیرے ہونے کے محض اس کے متولی ومنتظم۔ یہ ایثار ہی اپنی مثال بس آپ ہے اور حسن انتظام جہاں عالی دماغی کی دلیل ہے وہاں یہ ایثار شہادت دے رہا ہے قلب کی فراخی اور روح کی بیداری کی...... اور جیسے کہ یہ سارے فضائل وکمالات ناکافی ہوں اب حکیم صاحب نے کمال عالی ہمتی سے بڑے پیمانہ پر ایک جامعہ طبیہ کا انتظام ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس کے لئے چن چن کر ملک کے اطبائے حاذقین کو جمع کر لیا ہے۔ چنانچہ ہمارے لکھنؤ کے بھی نامور طبیب شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کو بھی لکھنؤ سے کھینچ بلایا اور شیخ الجامعہ انھیں کو بنایا ہے۔

دہلی کی لکھنؤ پر ایک اور تازہ ترین فتح! چنانچہ یہ راز وہیں شب کے کھانے کی دعوت میں حکیم صاحب سے مل کر کھلا۔ اور جہاں دلّی کے نصیبے پر رشک ہی آیا کہ انھیں

لکھنؤ سے چھین لیا وہیں لکھنؤ کی محرومی پر دل میں کچھ کڑھن بھی محسوس کی "باسایہ ترانمی پسندم" کی بات کچھ غلط تھوڑے ہی ہے۔ عین فطرت بشری کا اقتضا ہے۔

دلّی کے دو ہی دیسی ادارے ایسے ہیں جنھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ شہر شہر بلکہ قصبہ قصبہ ان کا نام پھیل گیا ہے بلکہ بیرون ہند بھی ان کے چرچے تذکرے ہو رہے ہیں ان میں سے ایک نیک نام اور تقریباً بین الاقوامی سا ادارہ یہی ہمدرد کا ہے۔

حکیم صاحب اس سے بیک وقت نام ہندوستان کا بھی اونچا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا بھی۔ وطن و ملت دونوں کی خدمت ساتھ ساتھ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ...... رہا دوسرا ادارہ اسی زور شور کے ساتھ قریہ قریہ اپنا نام پہنچانے والا، تو اب اسی کا نام کیا لیا جائے اور اس کی نشاندہی کن لفظوں میں کی جائے۔ مسلمانوں کی گردنیں شرم سے جھکا دینے کے لئے کافی ہے۔

روئیداد سفر کا آخر نمبر بھی ادھیا گیا اور میزبان محترم کا ذکر اب تک نہ ہونے کے برابر رہا گو ان کا مرتبہ اخلاص اس سے برتر ہے کہ وہ اپنی مدح سننے کے منتظر یا اپنے ذکر خیر کے مشتاق رہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کوئی بڑی لمبی چوڑی عبارت ان کے تعارف کے لئے ضروری بھی نہیں۔ جامعہ ملیہ سے بعد نماز مغرب جب میں رخصت ہونے لگا تو میرے قدیم و بے تکلف دوست ڈاکٹر سعید انصاری نے بھرے مجمع میں مجھ سے سوال کر دیا کہ کہیئے گورنر بہار اور نائب صدر جمہوریہ میں آپ نے کچھ فرق پایا ہے؟۔ جواب اس طرح بے تکلف چٹ پٹ یہ عرض کر دیا گیا کہ گورنر بہار! میں نے تو پرنسپل جامعہ اور نائب صدر جمہوریہ میں کوئی فرق نہ پایا اور لوگ یہ جواب سن کر ہنس پڑے...... ہنسی تائید و تحسین کی تھی انکار یا استعجاب کی نہ تھی......

لطیفہ نہیں واقعہ یہ ہے کہ مجھے تو سوا دڑھی میں قصر ہو جانے اور اس قصر کو بھی اب مدت ہو چکی ہے، اور عمر کے طبعی تقاضوں کے اور کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ نہ ظاہر

میں اور نہ باطن میں۔ وہی سادگی، وہی قناعت، وہی صفائی، وہی میٹھی زبان، وہی ہر ایک سے تواضع، وہی تصنع و تکلف سے اجتناب، وہی تعیشات سے احتیاط، وہی فرض شناسی، وہی اسلام دوستی، وہی بے تعصبی، وہی ذوق مطالعہ، وہی گھریلو پن اور وہی شیروانی، پاجامہ تین دن کے قیام میں میں نے یہ دیکھا کہ چائے لانے کھانا کھلانے وغیرہ کی ساری خدمت اپنے ذاتی ملازم (اور ملازم کیوں انھیں کی زبان میں "رفیق" قدیم) سے لیتے رہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ انھیں چپراسی وغیرہ سرکاری ملازموں کی کیا کمی ہو سکتی تھی، جس کوٹھی میں رہتے ہیں وہ محض منسٹروں کے رہنے کی ہے۔ حالانکہ گورنمنٹ ہاؤس میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں اور گورنر اور منسٹر کے معیار معیشت کے درمیان فرق ہی نہیں فرق عظیم ہے۔ گورنری سے ترقی پا کر اس منصب عالی پر آنے کے بعد انھیں حق تھا کہ اپنے لئے کوٹھی بھی ویسی طلب کریں جو اپنی آرائشوں کے لحاظ سے ایوان صدارت سے کچھ ہی کم ہوتی لیکن ان کی سادہ مزاجی اور قناعت پسندی نے صدر کیا معنی وزیر اعظم کی ٹکر کی بھی کوٹھی طلب نہ کی اور جو جگہ بھی رہنے کو مل گئی، بس اسی پر ہنسی خوشی گزر شروع کر دیا...... شرافت اور وضعداری ان کا امتیازی جوہر ہے اور اسلام دوستوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کی مذہبیت کا سکہ اونچے حلقوں میں دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ روایت معتبر ذرائع سے سننے میں آئی کہ کسی اونچے سرکاری ڈنر کے موقع پر محض اتفاق سے ایک ایسے افسر کے پاس سے گزرے جو مصروف نائے و نوش تھے تو وہ معاً تعظیم کے لئے کھڑے تو ہو گئے مگر جس ہاتھ میں گلاس تھا اسے پیچھے کر کے! ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ابکی ملاقات میں ڈاکٹر تاراچند نے اپنی بڑی محنت سے ایڈٹ کی ہوئی ایک ضخیم فارسی کتاب دکھائی یہ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب اپنشد کا فارسی ترجمہ دارا شکوہ کا کروایا ہوا ہے کتاب قابل داد ہے۔ اس کی شکل دیکھ کر دل للچا کر رہ گیا۔ کتاب چھپی ہوئی ایران کی ہے۔ ہندوستان میں اس کے ملنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی میں نے اس کا ذکر میزبان سے محض ضمناً کر دیا اور اپنے اشتیاق کا قصداً مطلق ذکر نہ کیا یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ تیسرے دن جب میں چلنے لگا تو عین رخصت کے وقت

موصوف یک بیک بولے کہ "ایک کتاب آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ڈاکٹر تاراچند کی اپنشد میرے پاس اس کا ایک نسخہ خالی ہے۔ میں دنگ رہ گیا کہ اپنے اشتیاق کا تو میں نے ان سے کچھ ذکر بھی نہ کیا تھا انھیں اس کا علم کیسے ہو گیا۔ بس زبان سے صرف اتنا کہہ سکا کہ اچھا اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ کشف صدور بھی ہونے لگا ہے۔

دکھ کی بات ہے کہ آپ کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ایک میل روزانہ صبح کی مشی جاری ہے اور کھانا بھی بالکل پرہیزی اور نپا تلا کھاتے ہیں پھر بھی دو شکایتیں زبردست عارض ہیں ایک ذیابیطس دوسرے مرض قلب، شکایتیں دونوں ہی سخت ہیں۔ لیکن شافی برحق کے لئے سختیوں کو آسانیوں میں تبدیل کر دینا کیا دشوار ہے اور عجب کیا کہ ان کے حق میں لاکھوں کروڑوں کی دعائیں سن ہی لی جائیں! قلب سے مراد افسوس ہے کہ طبی قلب ہے کاش مراد وہ قلب ہو تا جو صوفیہ کے دماغ میں بسا ہوا اور شاعروں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔وہ قلب جس کے آزار کی تمنا اور دعا بڑے بڑے عارفوں نے کی ہے۔

عاشقی پیدا است از زاریٔ دل
نیست بیماری چو بیماریٔ دل

عشق اگر اپنے جائز محل میں مجازی ہو جب بھی رہبر حقیقت بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

عاشق گرزیں سر د گرزان سرست
عاقبت مارا بداں شے رہبرست

اگر شروع ہی سے حقیقی ہے جب تو بندے کے حق میں ایک بڑا انعام الٰہی ہے۔

(صدق جدید ۶/ستمبر ۱۹۶۳ء)

چند گھنٹے دہلی میں (۱۹/اپریل ۱۹۶۵ء)

یو پی سرکار کی قائم کی ہوئی ایک مجلس ہندی، سنسکرت اور اردو کتابوں سے متعلق ہے۔ مستقل صدر اس وقت راجستھان کے گورنر ہیں۔اس تقریب سے کمیٹی کے اجلاس جے پور میں طلب ہوتے ہیں۔ ۱۴/مارچ کے اجلاس کے لئے ۱۳/مارچ کی شب میں براہ دہلی جے پور جانا تھا۔ کالکا میل تین گھنٹے لیٹ ہو کر دہلی ۱۲ بجے شب کے بعد پہنچا جس سے ادھر کی گاڑی نہ مل سکی، مجبوراً اور ارادہ کے خلاف کچھ گھنٹے دہلی میں گزارنے پڑے۔ اس تھوڑی سی مدت میں جسم کی آنکھوں کے ساتھ دل کی آنکھوں نے بھی بہت کچھ دیکھ ڈالا۔

دہلی آمد ورفت کا سلسلہ ۱۹۱۳ء سے قائم ہے اس ۵۱، ۵۲ سال کے عرصہ میں کیسے کیسے انقلابات نظر سے گزر گئے۔ دنیا کیا سے کیا ہو کر رہی! کیا زور، کیا طنطنہ، کیا ہمہمہ برطانیہ کا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں دہلی کو دارالسلطنت بنے ہوئے دو ہی ایک برس ہوئے تھے۔ در و دیوار تک انگریزی حکومت کا کلمہ پڑھ رہے تھے اور دلوں پر نقش عظمت و احترام سے کہیں بڑھ کر رعب وداب، ہیبت و جلالت اور اقبال مندی کا قائم تھا۔ ہر شمس العلماء چمکا ہوا تھا اور دھوم ہر خان بہادر کی مچی ہوئی تھی۔ پھر وہ دور بھی دیکھا جب دہلی اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور آصف علی کی تھی اور خان بہادر مولوی عبدالاحد (مطبع مجتبائی والے) اور شمس العلماء مولوی سید احمد (جامع مسجد والوں) کا ستارہ گردش میں آچکا تھا اور دور ان پر کسمپرسی کا طاری تھا۔ حسن نظامی اور ان کے رفیقوں ملا واحدی، دیوان سنگھ مفتون اور بھیا احسان کا طوطی بول رہا تھا۔ پادری اینڈریوز انگریز ہو کر ہندوستانیوں سے بڑھ کر ہندوستانی تھے۔ راشد الخیری بھی اپنے محدود حلقہ میں نوانجی کی داد لے رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے ساتھ ساتھ مولانا شوکت علی بھی نیم دہلوی بن چکے تھے۔ سید جالب، میر محفوظ علی، میر باقر علی داستان گو، آصف علی، جسٹس عبدالرحمٰن، خواجہ غلام حسین سب سے ملاقاتیں پہلی بار کامریڈ و ہمدرد

کے دفتر ہی میں ہوئیں۔ فاضل جید مفتی کفایت اللہ اور واعظ شیوا بیان مولانا احمد سعید کی زیارت بار بار ہوتی رہی۔ ملا واحدی کے ہاں جاڑوں کے موسم میں صبح کی نہاری کا ذائقہ اب تک یاد ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی مہمان داری کا لطف دنوں نہیں ہفتوں اٹھایا اور جی بھر کر قوالی سنی۔ پھر وہ دور بھی نظروں کے سامنے پھر گیا جب خلافت کمیٹی کے جلسے بار بار ہوا کرتے تھے اور مولانا لقاء اللہ پانی پتی کے نورانی چہرے کے ساتھ عارف ہنسوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، مہر صاحب، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ابوالکلام، مولانا عرفان خاں کی صورتیں لوح حافظہ پر ابھر آئیں۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک روزنامہ ہمدرد کے سلسلے میں خدا جانے کتنی بار دہلی کی حاضری ہوتی رہی اور محمد جعفری، سعید احمد بریلوی، مولوی احتشام الدین سب ہی سے خلا ملا رہا۔ جامعہ کے شفیق الرحمٰن قدوائی تو خیر اپنے عزیز ہی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مولانا اسلم جیراجپوری، خواجہ عبدالحئی فاروقی، ڈاکٹر سعید انصاری بھی رنگ اخلاص میں کچھ کم نہ رہے۔ وقت کا بائسکوپ ذرا اور کھسکا تو دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر یاد پڑا اور ساتھ ہی بابائے اردو عبدالحق، سید ہاشمی فرید آبادی اور پنڈت برج موہن ناتھ کیفی کے ہنستے بولتے چہرے ابھر آئے۔ سید مرتضیٰ علی، حکیم عبدالحمید (ہمدرد دواخانے والے) مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا سعید اکبر آبادی اسی دور کی یادگار ہیں۔ یہاں تک کہ زمانہ طلوع آزادی کا آجاتا ہے۔ اب دور مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر سید محمود اور شیو پرشاد سنہا کا آجاتا ہے۔ رفیع احمد قدوائی اور مجیب صاحب تو برادری اور وطن ہی کے تھے ...... کثرت سے یہ شمعیں اب گل ہو چکی ہیں۔ دو چار جو باقی ہیں وہ چراغ سحر کے حکم میں ہیں۔

قیام جتنی دیر بھی رہا دہلی کے ایک مخلص قدیم حاجی شفیع گھڑی والے (اپکار ڈواچ کمپنی) کے ہاں رہا۔ مولانا محمد میاں (جمعیۃ علماء والے) کی "دید" تو بس برائے نام ہی رہی۔ البتہ ان کے مناقب کی "شنید" اپنے میزبان کی زبانی بڑی خوش آئند رہی۔ اور یہاں جتنی دیر ملاقات صاحب الجمعیۃ مولانا فارقلیط سے رہی اس نے کلفت سفر کو بھلا دیا۔ ایسی بے زبان اور بے نفس ہستی، صحیح معلومات اور صائب رائے اور دل دردمند رکھنے

والی وقت کے صحافتی حلقوں میں کم ہی نظر سے گزری ہے۔ ان کا ایڈیٹوریل صفحہ معلوم ہوتا ہے کہ روشنائی سے نہیں خونِ جگر سے لکھا ہوتا ہے۔ اس مثنوی کا الہامی مصرعہ

در مناجاتم ببیں خونِ جگر

میں ان کے حق میں ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں پڑھا کرتا ہوں ع

در مقالاتم ببیں خونِ جگر

اور اس کمال جذب کے باوجود مجذوب نہیں، سالک ہیں، واللہ اعلم کس مجاہدہ سے کام لے کر جوش پر ہوش کو حاکم رکھے ہوئے ہیں، کسی دوسری قوم میں ہوتے تو آج ان کی پرستش ہوتی یہاں پرسش ہی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ دوسری ملاقات امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اور ان کے رفیق ماسٹر افضل حسین سے رہی، جنھوں نے درسی کتابوں کے ذریعہ سے تعمیری خدمت کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ان دونوں کی شرافت کو دیکھ قدرتِ خدا یاد آئی کہ انھیں کی جماعت میں کیسے کیسے "ذات شریف" بھی شامل ہو گئے ہیں مگر پھر اقبال کا قول یاد آگیا کہ اُمتیوں نے تو اپنے پیغمبر تک کو غیروں کی نظر میں بدنام کر کے چھوڑا ہے ...... افسوس ہے کہ ریڈینس RADIANCE والوں سے بھی ملاقات کی مسرت حاصل نہ کی جا سکی۔

اسٹیشن سے بلی ماران تک کی مسافت ایک بار پیدل طے کی۔ کمپنی باغ کے اندر سے ہو کر، یہ اتفاق سالہا سال کے بعد ہوا اور کیسی کیسی یادیں اس وقت کی تازہ ہو گئیں! وہ گھنٹہ گھر سرے سے غائب تھا جو چاندنی چوک کی مستقل رونق اور زبردست یادگار رہا تھا، کوئی تصوّر کر سکتا تھا کہ آزادی کے بعد جہاں ایک طرف کونے کونے پر مورتیاں نصب ہوں گی، گھنٹہ گھر جیسی کار آمد چیز یوں آناً فاناً ہست سے نیست ہو جائے گی! مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے! وقت ہی کہاں تھا نہ جامع مسجد کی حاضری ہو سکی اور نہ اس کے سامنے والے اس میدان کی جس کے ایک کونے پر آرمگاہ مولانا شوکت علی کی ہے اور وسط میں مولانا ابوالکلام کی! اور مولانا حفظ الرحمٰن کے مزار تک پہنچنے کے لیے وقت نکالنے کا سوال ہی نہ تھا۔

(صدق جدید ۱۹/اپریل ۱۹۶۵ء)

سرکاری تقریب میں

"ایک نااہل نوازی" کے عنوان سے ۲ر ستمبر ۶۶ء کے پرچے میں جو کچھ عرض ہوا تھا اگر اسے سامنے رکھ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ بہر حال مارچ ۶۷ء میں حکم پہنچا کہ ۱۵ر اگست کو یوم جمہوریہ کے سلسلے میں "عربی اسکالر" کی حیثیت سے جس سند اعزاز کا اعلان ہوا تھا وہ سند صدر جمہوریہ کے ہاتھ سے ۱۱ر اپریل کو عطا ہوگی۔ دہلی ایک دن قبل پہنچ جاؤ۔

دربار میں حاضری کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ گو اس قصر معلّا کی سرسری زیارت ایک بار قبل کسی پارٹی کے سلسلے میں ہو چکی تھی۔ قصر معلّا کا لفظ شاید مبالغہ سے خالی ہے اللہ اللہ! کیا شان و آن، کیا جاہ و جلال ہے! زینت و جمال کا کمال اگر شاہی محل میں بھی نہ ہوگا تو اور کہاں ہوگا؟ راشٹرپتی بھون یا قصر شاہی اپنی وسعت و رفعت میں شان و شوکت میں، شاہان سابق کے کسی قصر و ایوان سے کم نہیں اور آخر کم ہو تا ہی کیوں؟ انگریزی حکومت کے انتہائی عروج کے زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔ شہنشاہ ہند و برطانیہ کے نائب السلطنت کے لئے تھا۔ وائسرائے بہادر تو اس میں مستقل رہتے ہی تھے خیال اس کا بھی رکھ لیا گیا تھا کہ برطانیہ کے ولی عہد اور کبھی خود تاجدار برطانیہ بھی اس میں قیام فرمائیں گے اور دوسرے ملوک و سلاطین بھی بطور چند روزہ مہمان کے ٹھہرا کریں گے۔ صناعی اور تکلفات کے لحاظ سے یہ عمارت عہد شاہجہانی کی شاہی عمارتوں کے ٹکر کی۔ لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ریڈنگ بیچارے سب اسی خیال میں تھے کہ وہی اور ان کے بھائی بند ہمیشہ قیمتی پتھروں کے ان قلعوں میں رہیں گے اور کوئی انھیں یہاں سے بے دخل نہ کر سکے گا۔

کمروں کی تعداد سننے میں آیا کہ ڈھائی سو ہے۔ برآمدے، ہال، گیلریاں، صحن، چمن، نشاط خانے، کھیل گھر، تالاب، حوض، غسل خانے، باورچی خانے خدا معلوم کتنے۔ وسیع و بلند برآمدے خصوصاً جاڑے، گرمی، برسات، ہر موسم کے لائق۔ کل عمارت مع اپنے ملحقات کے کئی فرلانگ (عجب نہیں کہ کئی میل) کے دور میں۔ قدم قدم پر چوکی پہرے۔ باہری پھاٹک سے لے کر دربانوں، محل داروں کی پلٹن، بلم بردار، مسلح سپاہیوں

محافظوں کی فوج کی فوج اور انھیں کے درمیان اور انھیں کے جھرمٹ میں وہ رہا ہے جو "جمہوریہ" ہند کا صدر ہے۔ ایک خاموش، سادہ مزاج، قناعت پسند، مفکر و فلسفی اہل قلم...... اپنے دورہ کے پہلے ہی لمحہ سے دیر تک یہ سوچ دل میں آتا رہا کہ عیش و تنعم کے اس سیلاب، غفلت و تکلف کے اس تلاطم میں اگر کسی کو اپنی بندگی کا احساس کبھی کبھی بھی ہو جائے اور اپنے پالنہار کی یاد اس کے دل کو کسی وقت بھی گرما دے تو بڑھ کر اس کے ہاتھ چوم لیجیے اور اس میں کوئی نہ کوئی شمہ فقر و عرفان کا مان ہی لیجیے!

دربار کا وقت ۵ بجے سہ پہر کا تھا اور ہر ایک کو اپنے ساتھ دو مہمان لے آنے کی بھی اجازت تھی۔ ہدایت تھی کہ لباس درباری ہو یعنی سیاہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ جو پنڈت جواہر لال کا لباس تھا اور یہ بھی حکم تھا کہ آدھ گھنٹہ قبل ضرور پہنچ جایا جائے۔ لباس کے سوا اور ہدایتوں کی تعمیل ہوئی اور کارڈ اور پاس کی جا بجا چیکنگ ہونے کے بعد بالآخر اپنے نمبر کی کرسی ڈھونڈھ لی۔ خیال تھا کہ طلبی صرف چند اہل علم کی ہوئی ہوگی اور صدر محترم کے لطف و کرم کے مخاطب ہم خادمان علم ہی ہوں گے۔ دربار ہال میں باریابی پر کھلا کہ اندازہ تمام تر غلط اور محض اپنے طبقہ سے متعلق حسن ظن پر مبنی تھا۔ اعزاز علمی کی سند پانے والے تو کل چار پانچ تھے تین یا دو سنسکرت والے اور ایک ایک عربی و فارسی کے اور ہم خاکساروں کی کرسیاں آخر میں، سب سے آخر میں تھیں کہ اس کے بعد کوئی اور قطار نہ تھی۔ اگلی قطاروں پر صف بہ صف پچاسوں ہی دوسرے حضرات تھے۔ سرکاری خطابوں سے مشرف ہونے والے، پدم بھوشن، پدم وبھوشن، پدم شری وغیرہ اور انھیں میں علاوہ حکام والا مقام اور علوم و فنون کے استادان کرام کے فلاں گویے بھی تھے اور فلاں سازندے بھی!...... ایاز قدر خود بشناس کی حقیقت ایک بار پھر روشن ہوئی اور دل کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ظاہر کی آنکھوں پر بھی روشن ہو گیا کہ آج کی سرکار بھی ارباب نشاط کی سرپرستی اور ہمت افزائی میں پورا وہی کام کر رہی ہے جو اگلے راجے مہاراجے اور قیصر و سلطان کرتے چلے آئے ہیں۔

ٹھیک وقت پر صدر محترم برآمد ہوئے اور انھیں تکلفات کے ساتھ جو اگلے

شاہوں اور شہنشاہوں کے نام کے ساتھ مربوط ہیں۔ سونے کی کرسی پر براجمان ہوئے۔ نگاہ روبرو کی صدائیں راشٹر بھاشا میں نقیبوں نے لگائیں اور استقبال اس بھاشا کے قومی ترانے کے ساتھ کیا گیا۔ پھر ایک ایک کے نام کی پکار اور پیشی ادب و قاعدہ کے ساتھ ہوتی رہی کہ پیش گاہ مبارک سے اتنے انچ کے فاصلہ پر فلاں رخ سے کھڑا ہو جائیے اور جب صدر محترم کھڑے ہو کر تمغہ یا سند عطا کر چکیں تو فلاں زاویہ سے ہٹا جائے کہ کہیں پشت چہرۂ مبارک کی طرف نہ ہو جائے، وقس علیٰ ہذا...... بیسویں صدی کے ثلث آخر میں مغلئی دربار کے آداب اور کورنشات کا نقشہ نظر کے سامنے پھر گیا ...... اپنی باری جب آخر میں آئی اور درباری نہیں معمولی و عام لباس میں، تو پہلے ایک ریشمی سفید چادر عطا ہوئی اور پھر ایک لمبے سے خریطے کے اندر رکھی ہوئی سند علمی خدمات کی ایک طرف رخ پر اردو دوسرے پر ہندی میں لکھی ہوئی مرحمت ہوئی۔

ساری کارروائی ایک گھنٹے کے اندر ختم ہو گئی اور اس کے بعد پروگرام میں ایٹ ہوم درج تھا۔ دربار ہال سے چل کر پاس کے دوسرے وسیع اور لق ودق ہال، اشوک ہال میں آنا ہوا۔ یہاں بیٹھنے کا کوئی نظام نہ تھا اور کھڑے کھڑے کھانے پینے کا جو تکلیف دہ اور خالص فرنگی رواج چند سال سے چل نکلا ہے اس پر اس شاہی محل کے اندر عمل تھا!۔ یقین تھا کہ میزیں کھانے پینے کے سامان سے لدی ہوں گی۔ ایٹ ہوم صدر جمہوریہ کی طرف سے تھا۔ نظر اٹھا کر جو دیکھا تو اچھے اچھے ثقہ لوگ کچھ گلاس ہاتھ میں لئے شربتوں سے شاد کام ہو رہے ہیں اور کچھ چائے کی پیالیاں بھاپ نکلتی ہوئی ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں۔ منٹ دو منٹ کے بعد یہ راز منکشف ہو کر رہا کہ اس شاہی ایٹ ہوم میں صرف مشروبات ہی ہیں۔ زمانہ کے گرم و سرد کی مناسبت سے صرف گرم یا صرف ٹھنڈے پانی، ماکولات کے قسم سے نام کو بھی کوئی چیز موجود نہیں! ایک صاحب نے فرمایا کہ یہ کفایت شعاری اور سادگی کا سبق دینے کے لئے ہے اس گرانی اور خشک سالی کے دَور میں...... اور یہ کفایت کا درس عین اس وقت دیا جا رہا ہے جب اسی ہال میں دن کی پوری روشنی میں بجلی کے پچاسوں قمقمے بیک وقت روشن تھے! بہر حال بڑوں کی مصلحتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں اور "رموز مملکت" میں "گدائے گوشہ نشیں" کے "دخل و خروش" کے کوئی معنی ہی نہیں۔

ہال میں کئی صاحبوں سے چلتے پھرتے ملاقات ہو گئی۔ چودھری برہم پرکاش (سابق وزیر اعلیٰ دہلی)، ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین وغیرہا۔ بعض سے صرف سرسری علیک سلیک رہی اور اپنے ہم جنس تو سارے ہال میں ایک قاضی سجاد حسین (فتح پوری والے) نظر آئے جنھیں سند اعزاز فارسی میں اسی سال ملی ہے۔

قیام کل ڈیڑھ دن رہا۔ دِلّی کے سے "غدار" شہر میں یہ مدت ہی کیا ہوتی۔ بات کی بات میں کٹ گئی۔ جامعہ ملّیہ والوں سے ملنا یکسر رہ گیا حالانکہ وہاں ایک سے زائد مخلص موجود ہیں۔ ایک مخلص صبح ناشتہ کے وقت دہلی کا خصوصی تحفہ وہاں کی نہاری لے کر آگئے اور دو مخلصوں نے حسب معمول رخصتی ناشتے ساتھ کئے۔ "الجمعیۃ" کے اداریے لکھنے والے مولانا فارقلیط قابل زیارت بزرگ ہیں، ان سے ملنے کی سعادت رہی۔ "دعوت" والے مسلم صاحب بھی جوش و اخلاص میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ان سے اور جماعت اسلامی کے کئی ارکان و عمائد سے ہم کلامی کے ساتھ ہم طعامی کی بھی مسرت حاصل رہی۔ دعوت والجمعیۃ کے مسلک میں ظاہری و سیاسی اختلاف جو کچھ بھی ہو اسلامیت اور خدمت ملت کے لحاظ سے دونوں یکساں ہی نظر آئے اور حضرت اکبر کا شعر یاد دلا گئے۔

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں
فرق اتنا ہے کہ اک جنگل میں ایک زو میں ہیں

(مولانا شوکت علی مرحوم اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد میں جو اختلافات تھے انھیں ذہن میں لے آیئے جب شعر کا لطف آئے گا اور اس پر جنگل اور Zoo بستان حیوانات کا نقشہ بھی ذرا نظر میں جما لیجئے۔)

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب اپنی ذات سے خود ایک ادارہ ہیں بلکہ کئی کئی اداروں کے بانی ہونے کے لحاظ سے یہ کہئے کہ ایک ادارۂ اعظم ہیں۔ کم وقت میں اُن کے لئے وقت کمتر ہی نکل سکا پھر بھی جتنا نکلا وہ ضائع نہیں گیا۔ ابکی اُن کے صرف ایک ادارہ انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی زیارت کا موقع ملا وہ اس کے متعدد کارگزار

ناظم سیّد اوصاف علی کی رہنمائی و سربراہی میں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ مسلمانوں کے کوئی ادارے ایسا ٹھوس کام کرنے والے اور ماشاء اللہ ایسی سرسبز حالت میں ہیں ہی کہاں...... جتنی مسرت دیکھ کر ہوئی اس سے بڑھ کر حسرت زیادہ نہ دیکھ سکنے کی رہی۔

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

وہیں مفتی عتیق الرحمٰن دیوبندی سے بھی لطف مکالمت و مجالست رہا اور ایک "ظالم" مالک رام نامے سے بھی۔

ہے ولی پوشیدہ وہ کافر کھلا

حکیم صاحب ماشاء اللہ مردم شناس بھی ہیں۔ اپنے گردو پیش رفیقوں مشیروں، کارکنوں کا انتخاب بھی خوب کر رکھا ہے لیکن آخر انسان ہی ہیں۔ کبھی نیک نفسی کی بنا پر نظر چوک ہی جاتی ہے اور اپنے حسن ظن سے پتھر پر شیشے اور شرار سنگ پر روئے گل کا گمان کر بیٹھتے ہیں۔ ایکی ایک افسوسناک مثال اس کی بھی دیکھنے میں آئی۔

میزبان قدیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نائب صدر جمہوریہ کا تذکرہ کیا کیا جائے۔ ان کی رفعتیں یوں ہی کیا کم تھیں اور اب تو درجہ احتمال میں دُنیوی اعتبار سے مرتبہ و منزلت کی آخری سربلندی بھی ہے۔ چاہا تھا کہ اب کی ان کے وقت عزیز پر بار ذرا سا بھی نہ پڑنے پائے۔ مصروفیت ان کی بالکل ظاہر تھی لیکن حکم حاضری کا تار پر تار پہنچا اور جب دیکھا کہ سن اور مصروفیت میں زیادتی کے ساتھ ماشاء اللہ تواضع انکسار اور خدا ترسی میں بھی ترقی ہے اور کھانے کی سادگی لباس کی سادگی اور عام رہن سہن کی سادگی کا وہ عالم ہے کہ باہر والوں کو اس کا یقین بھی مشکل ہی سے آئے گا۔ الوداع کے وقت جو بالکل آخری بات مصافحہ کے لئے میرا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے ان کی زبان سے نکلی وہ یہ تھی کہ "بس میرے حق میں دعا کیجئے گا"۔ اور قبل اس کے کہ اس فقرے کو کلمہ تام سمجھ کر کچھ جواب میں عرض کروں، اسی لمحے جملہ ناتمام کو یوں تمام کیا "دعا سے مراد کامیابی ہرگز نہیں"...... میں تڑسے بول اٹھا کہ "جی نہیں میں اتنا نا سمجھ کیوں ہوتا۔ اللہ دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی نصیب کرے اور اس کے علم میں یہ منصب و مرتبہ بھی داخل خیر ہے تو اس پر بھی پہنچا کر ملت کا دل خوش کر دے"۔

مشاہدات کلکتہ

اپنے قصبہ کے چند جوانمردوں، عالی ہمتوں کے تعلقات کلکتہ سے بہت قدیم چلے آرہے ہیں، اور بعض کا تو گویا وطن ہی کلکتہ ہو گیا ہے۔ ان میں سے کچھ محبین، مخلصین کی تمنا عرصہ دراز سے تھی کہ یہ ننگ خلائق بھی وہاں جائے اور گنتی کے چند دن ان کی مہمان نوازیوں سے لطف اٹھائے۔ غرض و غایت اس سے زیادہ کچھ نہیں، نہ وعظ نہ تقریر، نہ جلسہ نہ جلوس، نہ کانفرنس نہ مشاعرہ، نہ لیکچر نہ تبلیغ، نہ صدارت نہ خطابت، مقصود محض ملاقات اور دم بھر کا لطف صحبت!...... اللہ اللہ! اخلاص میں بھی کیا کشش اور بے تکلف سادگی میں بھی کیسی جاذبیت اس نے رکھ دی ہے۔ اپنی کم فرصتی کہیے یا کم آمیزی اور ملاقات چوری، اس کا حال اپنے پرائے سب پر روشن ہے۔ اس کے باوجود قلب و دماغ نے اس کے لئے وقت نکالا اور ضمیر نے اس میں کوئی کلفت اور گھٹن نہیں، کچھ فرحت ہی محسوس کی! اپنے قصد سفر کی سبک ساری کوئی ان پر تکلف احباب اور عقیدت مندوں کے دل میں کوئی کیسے اُتار دے جو دور بیٹھے ہوئے لمبی لمبی رجسٹریاں اور بڑے بڑے تار بھیجتے رہتے ہیں کہ خدا کے لئے فلاں ادبی اور فلاں دینی جلسہ میں ضرور ہی شرکت کیجئے، آپ نہ آئے تو جلسہ ہی نہ ہوگا اور اتنے اہم اجتماع کے التواء کا وبال آپ ہی کے سر رہے گا!

کلکتہ کی لائبریریاں، خصوصاً نیشنل (سابق امپیریل) اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی والی بات دل میں مدت دراز سے گدگدی پیدا کئے ہوئے تھیں۔ کتاب کا کیڑا اپنی غذا کے لئے عرصہ سے بے قرار تھا، طبیعت کو ایک بڑا سہارا مل گیا کہ چلئے اسی بہانہ ان عظیم الشان کتب خانوں کی زیارت نصیب ہو جائے گی...... پروگرام ایک سال قبل جون ۱۹۵۴ء ہی میں طے ہو گیا تھا لیکن عین وقت پر ایک خانگی مانع پیش آگیا اور بندہ کو بشری ارادہ کی بے بساطی اور انسانی پروگرام کے ضعف و دہن کا تجربہ ایک بار اور کرا دیا

گیا۔ وقت میں گنجائش اب کی بھی کل آٹھ دن کی نکل سکی، اس میں آنا جانا اور ٹھہر نا …… دو دن آنے جانے کے اور چھ دن ٹھہرنے کے …… فی ستۃ ایام کی مناسبت اور ایک مبارک تفاؤل کے خوب ہاتھ آگئی!

جون ۱۹۵۵ء کی ۱۷ر تھی کہ صبح ساڑھے ۱۰ بجے دیرہ ایکسپریس سے ایک چھوٹا سا قافلہ ہمراہ لئے روانہ ہو گیا۔ اپنے قصبہ سے دو ایکسپریس کلکتہ سیدھے جاتے ہیں، کہیں ادلنے بدلنے کا جھگڑا ہی نہیں، فیض آباد، بنارس، مغل سرائے، گیا، شہر در شہر طے کرتا اور یوپی، بہار اور بنگال تین صوبوں کو پار کرتا ۱۸ر کو صبح سویرے کلکتہ پہنچ گیا اور پورے چھ دن سفر میں وطن کا، پردیس میں دیس کا، مسافرت میں اقامت کا لطف لیتا ہوا ۲۴ جون کو ساڑھے ۱۰ بجے دن کو واپسی کی ٹرین پر بیٹھا اور راستہ میں ایک بڑے صدق نواز مخلص شیخ عبدالرحمٰن انصاری کی سابقہ دعوت کے مطابق جھاجھا اسٹیشن پر ۵ گھنٹہ کے لئے اترنا ہوا۔ ۲۵ر جون کے سہ پہر کو دیرہ ایکسپریس سے مع الخیر اپنے وطن کے اسٹیشن پر واپس پہنچ گیا۔

شہر اپنا دیکھا ہوا تھا، شہر پہلی بار دیکھنے میں آیا، دعوے دونوں متضاد مگر دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح …… پہلا دعویٰ صحیح یوں کہ یہ دیکھنا ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا جب اپنی نوجوانی اور یونیورسٹی کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لیکن مولانا ابوالکلام کا "الہلال" ہر ہفتہ طلوع ہو رہا تھا بلکہ اپنے شباب شہرت کے لحاظ سے بدر کامل بنا ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ عمادی، آغا رفیق بلند شہری، آہ کہ آج سب مرحوم ہیں۔ اس وقت اس کے اسٹاف کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اپنا قیام بھی مولانا کی عنایت سے یہیں ہوا تھا۔ آغا صاحب تو اپنے لئے ذرا اجنبی سے تھے، باقی ان تینوں یاران باصفا نے تو جیسے وطن کی یاد ہی دل سے بھلا دی تھی …… دوسرا دعویٰ صحیح یوں ہے کہ جس نوجوان عبدالماجد نے یہ سفر کیا تھا وہ اب بجز نام کے اس دنیا میں زندہ ہی کہاں؟ ۴۰، ۴۲ سال کی مدت کوئی معمولی مدت ہوئی؟ دنیا کیا سے کیا ہو گئی اور خیر کلکتہ تو وہ کیا رہتا اس کا دیکھنے والا ہی وہ نہ

رہ گیا اور نہ اس کے دیکھنے والے کی نظر ہی وہ رہ سکی، تو اگر قلم سے یہ نکل گیا کہ کلکتہ پہلی بار دیکھنے میں آیا تو شاید کوئی ایسی غلط بیانی تو نہ ہوئی!

اتنا بڑا غدّار، لق ودق شہر، جس کا کہنا چاہئے کوئی اور نہ چھور، رقبہ میلوں نہیں، میلوں تک پھیلا ہوا، اور آبادی ہلکے تخمینہ کے مطابق بھی ۳۰ لاکھ! اس کے چھ دن میں دیکھ ڈالنے کا حوصلہ اگر جنون نہیں تو جنون سے کچھ ہی کم تھا۔ لیکن سیاحی کا یہ حوصلہ تھا ہی کب! مقصود تو محض اپنے میزبانوں کا دل خوش کرنا، بعض کتب خانوں کی سرسری زیارت کر لینا اور ایک بہت ہی محدود حلقہ احباب میں مل ملا لینا تھا، خطوط میں تاکید کے ساتھ عرض کر دیا گیا تھا کہ ملاقات کا دائرہ خواص نہیں صرف اخص خواص تک محدود رہے اور اخبارات تک تو بھنک بھی نہ پہنچنے پائے! …… یہ میزبانوں کے اخلاص اور اس سے بڑھ کر فہم سلیم ہمت و مستعدی کا کرشمہ تھا کہ اتنی سی قلیل مدت میں اتنا کچھ دیکھ ڈالا کہ بعد کو سوچنے سے حیرت ہی ہوتی ہے۔

انصاری برادری کو ہمارے بہت سے سید صاحبان اور شیخ صاحبان خدا معلوم ذرا حقارت سے دیکھنے کے کیوں عادی ہو گئے ہیں۔ اگر مقصود اس سے محض نفس کی "تسلی" اور "شیخی" ہے جب تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں، اور یوں سوچنے بیٹھئے اسلامی نظر سے تو کیا عقلی پہلو سے اس کا جواز کہیں آس پاس بھی نہ نکلے گا۔ پارچہ بافی، پارچہ سازی، پارچہ فروشی میں آخر عقلی نقلی کسی اعتبار سے بھی قباحت ہی کیا ہے؟ اور کیوں اس پیشہ میں کوئی سبکی فرض کر لی گئی ہے، زرہ سازی تو آخر ایک پیمبر جلیل القدر داؤد علیہ السلام نے کی ہے اور ایک دوسرے پیمبر جلیل نوح علیہ السلام کی کشتی سازی کا ذکر خاصی تفصیل سے تو قرآن مجید نے کیا ہے۔ گلہ بانی خود ہمارے پیمبر اعظم ہادی کائنات ﷺ نے اپنی ابتدائی زندگی میں کی ہے اور تجارت کا مشغلہ تو مدتوں بعد تک جاری رہا۔ ہاتھ سے کام کرنے کے کسی پیشے میں بھی عیب کا کوئی پہلو آخر کہاں سے نکال لیا گیا ہے؟ تاریخ اسلام میں کثرت سے مشاہیر و اکابر ایسے ہی ہوئے ہیں جو اپنے کو غزّال (کاتنے والا)

نساج (بننے والا) حلّال (روئی دھنکنے والا) حدّاد (لوہار) خصّاف (موچی) خرّاز (موچی) بزاز اور حلوائی کہتے ہوئے شرماتے نہیں فخر محسوس کرتے تھے، اور ماضی قریب اور حال کے بھی ہندوستان، پاکستان میں امت کے معززین و مشاہیر کی اگر ایک فہرست تیار کی جائے تو کتنے ہی نام خاص اسی پیشہ اور برادری کے شعر وادب، فقہ و کلام، صحافت و طبابت کی مسندوں سے لے کر جاہ و منصب کی اونچی سے اونچی کرسیوں تک نظر آتے چلے جائیں!...... اپنے بھی دونوں میزبان اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور دونوں شہر کے اسلامی حلقوں میں نام اور عزت پائے ہوئے ہیں۔

پہنچتے ہی بے قراری امپیریل لائبریری کے لئے تھی جواب نیشنل لائبریری ہے۔ اپنی وسعت اور طول و عرض کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں فرد۔ پہنچتے ہی اسے جاکر دیکھا، دیکھا کہاں؟ دیکھنے کے لئے مدت ہفتوں اور مہینوں کی نہیں مدت العمر کی چاہئے۔ یہاں یہ کہئے کہ ایک سرسری نظر کچھ الماریوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ضخیم دفتر در دفتر، فہرستوں پر کرلی اور نام کرنے کو دو چار کتابیں ادھر ادھر سے نکلوا کر ریڈنگ روم کی میز پر رکھ لیں۔ اور دل کو دھوکا یہ دے لیا کہ بہر حال ایک سرسری سیر لائبریری کی ہو گئی!...... زندگی کی زندگی ہی انھیں تمناؤں، آرزوؤں، حسرتوں کے فریب میں گزرتی رہتی ہے اور یافت کی جگہ حسرت یافت پر قناعت کرنا پڑتی ہے! آہ نایافت کی وہ کثرت جس پر نادان اور بر خود غلط انسان کو اس عالم عنصری میں عمر بھر یافت ہی کا دھوکا ہوتا رہتا ہے!...... خیر یہی غنیمت ہوا کہ لائبریری کی ممبری سے متعلق معلومات اچھے خاصے حاصل ہو گئے۔ باہر کے شائقین کے لئے بھی ممبری کا دروازہ ایک اوسط تعداد کی رقم ادا کرنے پر کھلا ہوا ہے۔ گو عملاً یہ ممبری کچھ آسان نہیں، لائبریری کے کارکنوں میں ایک مسلمان صاحب مل گئے جو نام سے واقف نکلے اور ان کے حسن توجہ سے سہولتیں اور زیادہ حاصل رہیں۔

نیشنل کے معاً بعد نمبر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کا ہے۔ یہ پارک لین میں واقع ہے اور قدیم مطبوعات و مخطوطات کے لئے بے نظیر ذخیرہ عظیم کے لحاظ سے

اس قابل ہے کہ بس چلے تو ایک عمر کیا معنی عمریں یہیں گزار دی جائیں۔ یہاں رسائی صاحب "برہان" دہلی مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی وساطت سے ہوئی اور مولانا نے یہاں کے خاص کارکنوں سے تعارف بھی کرا دیا دو کے نام یاد رہ گئے، ایک عربی و فارسی کتابوں کے کیٹلاگر (فہرست نگار) کے ایم مترا، یہ ایک مجسمہ علم و معلومات نظر آئے، شریف و شائستہ اور مسلمان اہل قلم سے واقف ہی نہیں، حیرت انگیز حد تک واقف، مدتوں لاہور میں بھی رہے ہیں، ایک زندہ لائبریری تو کہنا چاہئے کہ یہ خود ہیں اور دوسرے مکھن لال چودھری کلکتہ یونیورسٹی میں لیکچرر اور شعبۂ اسلامی تاریخ کے غالباً صدر بھی۔ موٹر کے ایک تازہ حادثہ سے آنکھ میں بہت سخت چوٹ آگئی تھی اس کے کرب و تکلیف میں مبتلا تھے۔ ان کی انگریزی کتاب اکبر کے دین الٰہی پر خود تو نظر سے نہیں گزری لیکن ایک مسلمان مبصر نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے تو کچھ اچھی رائے کتاب کے حق میں قائم نہیں ہوتی۔

②

کلکتہ کی شہرت کان میں بچپن سے پڑی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے شاید یوں کہ "حبل المتین" جو ملک بھر میں اس وقت فارسی کا شاید تنہا ہفتہ وار تھا اور ایک خاص اثر و وقعت بھی رکھتا تھا، وہ یہیں کلکتہ سے کسی شیرازی آقا کی ادارت میں نکلتا تھا۔ پھر جب اور سن آیا تو یہیں کے قدیم انگریزی مطبعوں کی ٹائپ میں چھپی ہوئی کتابیں اپنے بزرگوں کے کتب خانوں میں، تفسیر، حدیث، لغت، سیرت وغیرہ پر دیکھیں، کشاف حصہ اوّل، اتقان فی علوم القرآن، شرح سفر السعادۃ، جذب القلوب الی دیار المحبوب، برہان قاطع، طحطاوی (شرح در مختار) اور خدا جانے اور کون کون سی کتابیں یہیں کی چھپی ہوئی دیکھنا یاد ہیں۔ اسی سن میں یہ بھی سنا کہ اودھ پنچ کے ایک ممتاز نامہ نگار نواب سیّد محمد خاص کلکتہ ہی کے ہیں، مدرسہ عالیہ کے مشہور پرنسپل سر ڈینسن راس، اور غالب کے رنگ میں کہنے والے رضا علی وحشت اور ایشیاٹک سوسائٹی کے لائبریرین ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی اور وقت کے ممتاز ادیب شمس العلماء محمد یوسف رنجور

کی علمی و تحقیقی، شعری، ادبی شہرتوں کی گونج بھی اسی زمانہ میں لکھنؤ اور اس کے اطراف میں سنائی دی۔ جب اور سن آیا تو اسٹیٹسمین، انگلش میں، امپائر، بنگالی میں پتریکا کا شور و شغب کانوں تک پہنچنے لگا اور کالج کے زمانہ میں محمد علی جوہر کے کامریڈ، اور ابوالکلام کے الہلال نے قبضہ دل و دماغ دونوں پر جما لیا تھا، پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا جب یہاں کے مسلمانوں نے ایک انگریزی اخبار کی بدتمیزی سے مشتعل ہو کر ناموس رسول ﷺ کی خاطر اپنے کو کٹنے مرنے کے لئے بے تکلف پیش کر دیا۔ یہ وقت وہ تھا (۱۹۱۸ء میں) کہ ابوالکلام اور محمد علی دونوں نظر بند یا قید تھے اور محمد علی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس طرح کے شعر کہہ ڈالے تھے ؎

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ ۔۔۔ روح رسولؐ آج ہے مہمانِ کلکتہ
یثرب کی خاک پاک کے ہر ذرہ کیلئے ۔۔۔ سو جان سے فدا ہیں غلامانِ کلکتہ
ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ سرخپوش ۔۔۔ ہے آج کل بہار پہ ایمانِ کلکتہ

اور خیر، یہ سب تو داستان پاستان ہے، ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ تقسیم ملک سے ذرا پہلے تک یہ شہر ایک مخلص مسلمان عبدالرحمٰن صدیقی کا معلوم ہو رہا تھا!

چشم تصور کے سامنے یہ خوشگوار خوش آئند نقشہ پرانے کلکتہ کا بار بار آ رہا تھا، لیکن مادی آنکھوں سے مشاہدہ ماضی کا نہیں، حال کے جس کلکتہ کا ہو رہا تھا وہ بھی ایک یوپی سے آنے والے کے لئے کچھ کم خوش کن نہیں، کم سے کم ایک مقام اور وہ بھی اتنا بڑا مقام اس کے مشاہدہ میں بھارت میں ایسا آیا جہاں "اقلیت" حقیر و خوار نہیں۔ روایتیں بمبئی اور مدراس سے متعلق بھی ایسی ہی سننے میں آئی ہیں۔ لیکن یہاں ذکر شنید کا نہیں دید کا ہو رہا ہے۔ خبر کا نہیں معائنہ کا ہو رہا ہے۔ اس سرزمین پر مسلمان آزاد ہیں، جس حد تک کسی اقلیت کا آزاد ہونا ممکن ہے، گھروں میں خودداری کے ساتھ سو سکتے ہیں۔ سڑکوں پر گردن اٹھا کر، سینہ تان کر چل سکتے ہیں، ان کی اپنی دوکانیں ہیں، بڑے بڑے کارخانے ہیں، تجارتی کاروبار ہیں، بڑے بڑے ہوٹل ہیں، اپنے اسکول

ہیں، ہسپتال ہیں، یتیم خانے ہیں اور ہاں یہ کیا کہ ان کے ہوٹلوں پر جا بجا تختیاں جو انگریزی حروف میں لگی ہیں NO BEEF HERE یعنی "یہاں گائے کا گوشت نہیں ہوتا" اس کے معنی یہ کہ یہاں ان کا حق ذبیحہ بالکل محفوظ ہے۔ یہ جس جانور کو چاہیں انھیں پوری آزادی ہے کہ اسے ذبح کریں، کھائیں، کھلائیں۔ یہ اور بات ہے کہ دوسروں کی خاطر یا اپنی کسی اور مصلحت سے خود ہی کسی جانور کو کھانے کی میز پر لانے سے پرہیز کرنے لگیں!...... یہ اجازت اور اتنی آزادی آج کی فضا میں معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ تھوڑی نہیں بہت ہے۔ اور جس سرزمین پر اتنی رواداری، اتنی بے تعصبی، اتنی انسانیت، اتنی انصاف پسندی ابھی باقی ہو، وہاں کی اکثریت اور حکومت دونوں قابل مبارکباد ہیں...... خیر ایک مسلمان کی حیثیت سے تو ان منظروں سے جی جیسا خوش ہوا ظاہر ہی ہے، لیکن اچھی خاصی خوشی ایک ہندوستانی کی حیثیت سے بھی ہوئی۔ لکھنؤ اور دہلی، پٹنہ اور الہ آباد، حیدر آباد، ناگپور نہ سہی کلکتہ تو بہر حال ایسا ہی نکلا جس نے "سیکولرزم" کے بلند بانگ دعوے کی لاج رکھ لی۔ اور جہاں اقلیت اکثریت سے دبی ہوئی سہمی ہوئی، دہشت کھائی ہوئی نہیں، اس کے شانہ بشانہ، صف بہ صف کسی حد تک تو نظر آئی...... کیا کلکتہ میں ہندو اکثریت اور بڑی اکثریت نہیں؟ یا یہاں کی ہندویت کچھ کمزور ناقص بے دم سی ہے؟

مسلمان کی بڑی پہچان اس کی نماز ہے، اور کہیں کی اسلامی آبادی کی جانچ پڑتال کرنا ہو تو بس یہ دیکھئے کہ وہاں کی مسجدیں کس حد تک آباد اور کس حد تک ویران ہیں...... کلکتہ کی ایک نہیں مختلف محلوں کی کئی مسجدوں میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، اور انھیں میں ایک مسجد اہل حدیث کی تھی، ماشاءاللہ ساری ہی مسجدیں آباد اور پر رونق پائیں اور جامع مسجد یعنی مسجد ناخدا کا تو کہنا ہی کیا!...... مسجد کا ترجمہ خانہ خدا ہے۔ یہ خانہ خدا بھی خوب ہے جو منسوب ایک ناخدا کی جانب ہے!...... یہاں نماز پڑھ کر جیسے آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ اس کا طول و عرض وہ اس کی رونق و آراستگی وہ اس کی خوش تعمیری

اور پھر اس کی نمازیوں سے معموری! اس میں داخل ہوتے ہی دل کی کلیاں کھل جاتی ہیں۔ بے نمازی اگر یہاں قدم رکھ لے تو عجب نہیں کہ نمازی ہی بن کر نکلے۔ یہاں کے امام صاحب جو غالباً شامی الاصل یا مدنی الاصل ہیں بجائے خود قابل زیارت ہیں۔ خوش آواز، خوش الحان ہونے کے ساتھ چہرہ پر نورانی داڑھی مستزاد!

مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کے ناخدا اب لکھنؤ کے مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی سلمہ اللہ ہیں ان کا یہاں خاصا اثر دیکھا۔ اور شاید یہ اسی کی برکت ہے جو یہاں اتنی اسلامی بیداری قائم ہے۔ تحریک کے روح رواں یہاں کے ایک تاجر سیٹھ غلام رسول بہاری نظر آئے۔ اسلامیت کے پتلے، نور ایمان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، دوڑ دوڑ کر دوسروں کی خدمت کرنے والے، پیشانی پر سِیمَا هُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ کا ٹھپا لگا ہوا، بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر دل خود اندر سے پکار اٹھتا ہے کہ بے شک یہ جنتی ہیں۔ ایسے ہی گنے چنے خوش نصیبوں میں ایک چلتے پھرتے جنتی یہ نظر آئے...... اور ایک مسلمان کے اخلاص کی داد کے لئے شاید انتہائی اور آخری الفاظ یہی ہو سکتے ہیں۔

اور دینی خدمت گزاریوں میں تقشف و پندار زُہد کے قریب گئے بغیر، انھیں کے قدم بہ قدم اپنے میزبان حاجی عبدالقیوم انصاری دکھائی دیئے۔ اب تو ماشاء اللہ کشور گنج میں ایک شوگر مل بھی بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں (اور شیریں زبانی جو پہلے بھی کم نہ تھی، اب شکر سازی کے بعد شاید کچھ اور بڑھ گئی ہے) اس سے پہلے بھی اپنے چھوٹے بھائی محمد امین انصاری کے ساتھ کلکتہ کے مشہور ہوٹل امینیہ ہوٹل (زکریا اسٹریٹ مقابل مسجد ناخدا) کے مالک تھے، اس کا شمار کلکتہ کے ہندوستانی ہوٹلوں میں چوٹی کے ہوٹلوں میں ہے، اور اب نیو مارکیٹ میں ایک جدید اور شاندار ریستوران امینیہ ریستوران کے نام سے بھی کھول دیا ہے جو مقبولیت اور مرجعیت میں شاید اپنے ہم نام ہوٹل سے بھی بازی لئے جا رہا ہے۔ انھیں دیکھ کر اور ان سے مل جل کر جہاں یادِ الٰہی کو تحریک ہوتی ہے وہیں ان بھائیوں کا باہمی اتحاد قابل رشک نظر آیا، اور یہ سب برکت

اسلامی زندگی اختیار کر لینے کی ہے۔ چھوٹے بھائی امین انصاری ایک روز کلکتہ کا مشہور اور انٹرنیشنل ہوائی اڈہ دَم دَم دکھانے لے گئے (لکھنؤ کے چھوٹے سے معمولی ہوائی اڈے کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں) اتفاق سے ذرا دھوپ کا وقت تھا۔ موٹر سے اُتر کر کچھ دور تک پیدل چلنا اور ایک جگہ دیر تک کھڑا رہنا پڑا۔ یہ اللہ کا بندہ ساری مدت پسینہ پسینہ ہونے کی طرف سے بے پروا میرے سَر پر خادموں کی طرح چھتری لگائے یا چلتا رہا یا کھڑا رہا، میں لاکھ ہاں ہاں کرتا رہا لیکن جس کو اجر حاصل کرتے رہنے کا چسکا پڑ چکا ہو اور جو خدمت ہی کو راحت سمجھنے لگا ہو اس پر کیا اثر ہوتا! دونوں بھائی ماشاء اللہ پورے رئیسانہ ٹھاٹ کے ساتھ چاندنی کی ایک پنج منزلی رفیع الشان ذاتی کوٹھی رحیم منزل میں رہتے ہیں اور دل میں اس آیت والی ہدایت کو جمائے ہوئے ہیں۔

وَابْتَغِ فِيْ مَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ. (سورہ قصص ع ۸)

اللہ نے تجھے جو انعام و اکرام سے سرفراز کر رکھا ہے اس سے اپنے آخرت کے گھر کی فلاح تلاش کر اور ہاں دنیا سے بھی اپنا حصہ نہ بھلا۔ اللہ نے جس طرح تیرے ساتھ سلوک کیا تو بھی دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیتا رہ اور روئے زمین پر فساد نہ برپا کر۔ (ترجمہ مع تشریح)

یہ لوگ تو ابھی سب جواں عمر ہیں اور اسی لئے زیادہ قابل داد باقی پرانے قسم کے دینداروں میں دوسرے میزبان حاجی عبدالجبار انصاری کا قدم کچھ پیچھے نہیں آگے ہی ہے۔ کولوٹولہ میں دو دو ہوٹلوں اسلامیہ اور جدید اسلامیہ کے مالک ہیں اور اپنے دو جواں لڑکوں احمد زماں و محمد زماں کے ساتھ بہ فراغت بسر کر رہے ہیں۔ صدق کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ گو اب پڑھنے لکھنے سے تقریباً معذور ہو چکے ہیں اور سامعہ بڑی حد تک جواب دے چکا ہے اور خود صدق بھی ان کے مذاق قدیم سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتا، پھر بھی پرچہ اوپر کی جیب میں اپنے سینہ سے چمٹائے رہتے ہیں اور جب تک کسی سے پڑھوا کر سن نہیں لیتے دم نہیں لیتے، ایسے اخلاص کی مثالیں اب شاذ

ہی رہ گئی ہیں...... چھ دن کے قیام میں اپنے پہلے تین دن انھیں کے ہاں گزارے اور چوتھی صبح جب ان کے ہاں سے رخصتی ہوئی تو ان کی محبت و خلوص کی نہ مٹنے والی یاد کا نقش دل پر لئے ہوئے!

③

کلکتہ صدق نوازوں سے خالی نہیں۔ ایک بڑے پرانے صدق نواز اطراف سورت کے اور احمد دادا بھائی داؤجی کے خاندان کے سیٹھ سلیمان داؤڈا ملے۔ ذاتی نیاز ان سے پہلی بار حاصل ہوا، ملنے آئے اور بار بار ملے، اپنے ہاں لے گئے، خوب کھلایا پلایا اور اپنے ہمراہ یہاں کے دو مسلم اداروں کی سیر کرائی۔ ایک یتیم خانہ اسلامیہ، دوسرے اسلامیہ ہسپتال...... اپنا دل مسلم اداروں کی طرف سے کچھ ایسا کھٹا سا ہو گیا ہے کہ کسی ادارہ کو دیکھنے کے لئے اب شوق سے قدم نہیں اٹھتا لیکن کچھ اپنے میزبانوں کی اور کچھ انھیں سیٹھ سلیمان داؤڈا کی خاطر سے اس یتیم خانہ کو جا کر دیکھا۔ یہ نمبر ۸ سیّد صالح لین پر واقع ہے، اوپر نیچے سب گھوم پھر کر دیکھا، باورچی خانہ، دفتر طعام خانہ، لڑکوں کے رہنے کے کمرے وغیرہا۔ عمارت خاصی ہے۔ صفائی وغیرہ کا انتظام اوسط درجہ کا نظر آیا۔ زیادہ قابل داد نہیں، تو کچھ قابل ہجو و لائق ملامت بھی نہیں۔ متعدد مسلمان تاجر تو اس کے چلانے میں دل کھول کر حصہ لے ہی رہے ہیں۔ ان کے علاوہ یتیم خانہ کی مستقل املاک ہیں۔ مکانات کے کرائے وغیرہ سے معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ بڑی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ کارپوریشن بھی ۵، ۶ ہزار سالانہ کی گرانٹ اس "فرقہ وار" ادارہ کو دے رہی ہے۔ دینی تعلیم پر سنا ہے کہ خاص توجہ کی جاتی ہے۔ ایک شعبہ صنعت و حرفت کا بھی قائم ہے۔ انتظامی کمیٹی کے سرپرست صوبہ کے گورنر ہز ایکسی لینسی ڈاکٹر ایچ سی مکرجی ہیں جو مذہباً مسیحی ہیں اور یہ کلکتہ کے مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں گورنر ایسا ہمدرد اور درویش صفت ملا ہے۔ ان کی سادہ زندگی انصاف پسندی اور درویش منشی کے تذکرے پوری مداحی کے ساتھ مسلمانوں ہی کی زبان سے بار بار سننے میں آئے اور چند سال قبل کا زمانہ اپنے صوبہ کا یاد آ گیا جب یوپی کی گورنر مسز نائیڈو

جیسی نیک دل شریف مسلم نواز خاتون تھیں۔ اس وقت حالانکہ وہ عین مارکاٹ کا زمانہ تھا، اس وقت یوپی ہی اپنے گورنر کو دوسروں کے سامنے فخریہ اور بطور مثال کے پیش کر سکتا تھا۔

یاد آں روزے کہ دست افشاں گزشتم از حرم
از غرور آں کہ من ہم آستانے داشتم!
یاد آں روزے کہ دور از ماجرائے جہاں
ماجرائے با نگارے نکتہ دانے داشتم!

یتیموں کی خدمت تو اسلام کے اہم ترین احکام میں سے ہے۔ قرآن مجید اور اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں اس پر شاہد ہیں ناطق ہیں۔ مبارک ہیں کلکتہ کے وہ مسلمان جنھیں اس حکم پر عمل کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔

یتیم خانہ سے بھی کہیں بڑھ کر خوشی اسلامیہ ہسپتال کو دیکھ کر ہوئی۔ انھیں سلیمان داؤڈا صاحب کی رہنمائی میں اسے بھی دیکھا اور ہر منزل کے بکثرت کمروں کو خوب گھوم پھر کر دیکھا۔ موجودہ معیار کے مطابق ہسپتال کو چلانا کوئی آسان کام نہیں۔ صفائی، کارکردگی وغیرہ کا اب جو معیار ہے اس پر کسی ہسپتال کو قائم رکھنے کے لئے یہی نہیں کہ بہت بڑا سرمایہ درکار ہے بلکہ تنظیم اور اعلیٰ فنی مہارت کی ضرورت قدم قدم پر ہے۔ ہسپتال کو دیکھ بھال کر خوشی کے ساتھ قائل ہونا پڑا کہ کلکتہ کے مسلمان ماشاءاللہ ان اوصاف سے بالکل کورے نہیں اور کم سے کم اپنے اس ادارہ کو بغیر زیادہ شرمائے ہوئے دوسری قوموں کو دکھا سکتے ہیں۔ عمارت اچھی خاصی وسیع اور گنجائش والی اب بھی ہے اور اب اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اندرونی اور بیرونی مریضوں کی عام تقسیم کے علاوہ بھی خدا معلوم کتنی ضرورتوں کے لئے مختلف اور بکثرت کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سرجری کا کمرہ ہے، اس میں آپریشن ہوتے ہیں، یہ ریڈیالوجی کا کمرہ ہے اس میں ایکسرے وغیرہ کے آلات قرینہ سے لگے ہوئے ہیں، یہ زچہ خانہ ہے اس میں

مائیں لیٹی ہوئی ہیں، یہ ننھے بچوں کا کمرہ ہے اس میں ہفتوں اور مہینوں کی عمر کے بچے سو رہے ہیں، یہ کمرہ دندان سازی کا ہے، یہ کمرہ آنکھ کے مریضوں کا ہے، یہ کمرہ نرسوں کا ہے اور خدا جانے کتنے اور کمرے اور وارڈ، مریضوں کے ہجوم، ڈاکٹروں کی توجہ، مشغولی، نرسوں کی تیمارداری، کمپاؤنڈروں کی چلت پھرت سب کے نظارے گھنٹہ بھر کی سیر میں ہو گئے۔ اوپر کے درجوں میں آمد و رفت لفٹ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اسٹاف مختصر نہ ٹٹ پونجیا، ڈاکٹر اچھے اچھے سند یافتہ اور خاصی بڑی تعداد میں موجود، موٹے اور سرسری انداز میں پچاس سے کیا کم ہوں گے۔ ایک بڑی بات اور موجودہ فضا میں بہت بڑی بات یہ کہ اسٹاف میں مسلمانوں کے علاوہ کثرت سے بنرجی اور چترجی اور داس اور پال، بوس اور سین اور سنہا اور گھوش اور گپتا بھی شامل! یوپی والا یقیناً حیرت زدہ کہ یہاں کے ہندو کیسے ہیں جو بے تکلف ایک "اسلامیہ" ادارہ کا جزو بنے ہوئے ہیں اور کیسے یہاں کے مسلمان ہیں کہ ہنسی خوشی اتنے ہندوؤں کو اپنے ادارہ میں لئے ہوئے ہیں! اور عجب بالائے عجب یہ کہ ان غیر مسلموں میں بہت سے محض آنرریری ہیں! خادم بلامزد، کارکن بلا تنخواہ!...... اور ایک لطیفہ عجب ہوا، جونہی میں داؤد صاحب کے ساتھ ہسپتال کے صدر دروازہ میں داخل ہوا، پیشوائی کے لئے ایک سینئر ڈاکٹر ملے، عجب نہیں کہ آنرریری سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ بڑھ کر ہاتھ ملایا اور گشت کے بیشتر حصہ میں وہی ساتھ رہے۔ قدرۃً خیال یہی قائم رہا کہ یہ تو بہرحال مسلمان ہی ہوں گے۔ داؤد صاحب نے ملاتے وقت ان کا نام لیا بھی، لیکن بے خیالی میں پوری طرح سمجھ نہ سکا اور دوبارہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ گشت کے خاتمہ پر اور رخصت کے وقت جب میں ان کی زحمت کا شکریہ ادا کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی ہندو صاحب ڈاکٹر بوس یا ایسے ہی کچھ اور ہیں!...... چشم تصور کے سامنے اس یوپی مرحوم کا نقشہ پھر گیا جس میں پنڈت موتی لال، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ، پنڈت جواہر لال، چودھری خلیق الزماں کے ساتھ، سرتیج بہادر سپرو، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ اور پنڈت جگت نرائن راجہ صاحب محمود آباد کے ساتھ شیر و شکر نظر آتے تھے۔

دو اور صدق نوازوں سے بھی اب کی پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب حکیم محمد زماں حسینی بلیاوی مالک دواخانہ قاسمی ہیں۔ بزرگان دیوبند سے متوسل۔ بیعت و تلمذ دونوں کا سلسلہ وہیں قائم۔ اور سیاسی مسلک و مذاق بھی شاید کچھ اہل جمعیۃ ہی کا سا ہے، لیکن صدق و صدقیات کو از راہ محبت آنکھوں پر جگہ دینے والے، تفسیر ماجدی کی قدر کرنے والے ہیں۔ قدر بڑھانے والے، اسٹیشن ہی سے مل گئے اور پھر بار بار اپنے مطب دواخانہ کا ہرج کر کے اخلاص کی گرمجوشی سے ملتے رہے۔ اور دوسرے صاحب ایک عالم دین مولانا قریش نکلے۔ اچھے خاصے صاحب علم و نظر یہاں کسی درسگاہ میں ہیڈ مولوی ہیں اور شہر میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، سنا ہے کہ بیان بھی خوب کرتے ہیں اور نماز عید کی امامت بھی خلافت کمیٹی کی طرف سے کرتے ہیں۔ خلافت کمیٹی کے نام کو طبع و کتابت کی غلطی نہ سمجھئے بمبئی کی طرح کلکتہ میں بھی خلافت کمیٹی کا وجود اب تک قائم ہے۔ دینی مسائل میں مدیر صدق اپنے بعض تفردات کے لئے بدنام ہے اور جب کبھی ٹھیٹھ علمائے کرام کے طبقہ سے اپنے ان تفردات یا آزاد خیالیوں کی تھوڑی بہت تائید مل جاتی ہے تو مسرت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے اور تائید کا درجہ بعد کا ہے۔ مولوی صاحبان کی طرف سے رواداری ہی کا ثبوت غنیمت بلکہ ایک نعمت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا قریش اسی قسم کے چند گنے چنے علماء میں سے ملے جن کے ہاں تحقیق کے معنی تحقیق کے ہیں، علمائے متقدمین کی چھوٹے بڑے ہر معاملہ میں سو فیصدی تقلید کے لئے نہیں۔ ملے تو پھر اسٹیشن تک ساتھ نہ چھوڑا، اور اسٹیشن پر ان آنکھوں نے یہ نظارہ بھی کیا کہ میرے سامان کا کچھ حصہ قلیوں کے ساتھ یہ بھی اٹھائے ہوئے ہیں اور دن دوپہر کی روشنی میں بے تکلف ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر اسے لئے ہوئے چل رہے ہیں!...... اخلاص کی دولت بڑی دولت ہے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھانے کے بجائے خلق کی نظر میں اپنے کو پست و حقیر دکھانا ایک مرد مومن و مجاہد ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ کمال قال العارف الرومی

اشتہاء خلق بند محکم است   در رہ ایں از بند آہن کے کم ست

خویش را رنجور سازی زار زار　　تا ترا بیرون کنند از اشتہار

انھیں نے بڑے کام کا مشورہ یہ دیا کہ "صدق" میں آئندہ تفسیر پارۂ عم کی مسلسل وبا ترتیب چھپتے رہنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ کبھی کسی سورت کی نکل آئی اور کبھی کسی کی۔ ان کا یہ مشورہ بہت معقول نظر آیا اور دو ہی چار ہفتہ سے ان شاء اللہ اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔

کلکتہ جا کر اگر ان سب مخلصوں کی زیارت نہ ہوتی تو یقیناً اس کا شمار اپنی محرومیوں میں ہوتا اور اپنی خوش بختی میں کسی عنوان کی کمی رہ جاتی۔

اردو اخبارات یہاں سے ایک نہیں متعدد نکلتے ہیں، لیکن زیادہ مشہور و مقبول جیسا کہ ایک سرسری مسافرانہ عاجلانہ اندازے میں نظر آیا دو ہیں ایک آزاد ہند، دوسرے عصر جدید۔ آزاد ہند غالباً نیشنلسٹ مسلمانوں کا ترجمان ہے۔ لیکن اس کی اسلامیت اس کی نیشنلزم سے مغلوب اور نمبر دوم پر نہیں، بلکہ اس پر غالب اور نمبر اوّل پر ہے۔ اس کے ایڈیٹر میرے ایک سابق دوست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے فرزند ارجمند ہیں اور اس رشتہ سے اور دوسرے رشتوں سے بھی میرے ہر طرح چھوٹے ہیں۔ خیال نہ تھا کہ ملاقات ہوگی، مگر خبر سن کر ملنے آئے اور اس کے بعد بھی ملے۔ ملے تو اس طرح کہ جیسے ہمارے مشرقی اسلامی معاشرہ میں ایک "عزیز وافر تمیز" اپنے کسی بڑے سے ملتا ہے، مل کر جی خوش ہوا۔ الحمد للہ آثار رُشد و سعادت پائے گئے؛ اللہ انھیں ہر طرح فخر خاندان، فخر وطن، فخر ملت بنائے...... دوسرے روزنامہ کے ایڈیٹر سید محمد مصطفےٰ صابری شروع ہی میں ایک روز مغرب کے وقت ایک مسجد میں مل گئے اور پھر گھر تک ساتھ آکر بہت دیر تک بیٹھے، اطراف سہارن پور کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ "صدق" بلکہ "سچ" کے پڑھنے والوں میں سے ہیں۔ عصر جدید کلکتہ کا ایک بہت پرانا روزنامہ ہے۔ مولانا شائق احمد عثمانی بہاری (شاگرد حضرت شیخ الہندؒ) کا پرچہ تھا اور مسلم لیگ کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کے نام سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں، خدا کرے یہ صاحب اس کی نیک نامی میں اضافہ کرنے والے ہیں...... بہر حال اخباری پالیسیاں جو

کچھ بھی ہوں، دونوں کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے مل کر مسرت ہی ہوئی اور دونوں کی ملاقات کی خوشگوار یاد دل میں قائم ہے۔

④

برطانوی دور کی یادگاریں کلکتہ میں دو چار دس بیس نہیں بے شمار ہیں۔ انگریزوں نے اپنے عروج کی سب سے لمبی مدت اور مہلت ہندوستان میں کلکتہ میں پائی بھی تو اس لئے ان کی بڑی سے بڑی اور بہترین یادگاروں کا یہاں قائم رہ جانا بالکل قدرتی ہے۔ وکٹوریہ میموریل کا نام مدت سے سننے میں آرہا تھا، تصویریں بھی بار بار دیکھنے میں آچکی تھیں، اصل عمارت کے دیکھنے کا اتفاق اب کی ہوا، ایک نہایت وسیع حلقہ سرسبز و شاداب ہر طرف چمن ہی چمن، اندر ایک چھوٹی سی خوبصورت نہر گزرتی ہوئی وسط میں ملکہ وکٹوریہ کا عظیم الشان پُر اجلال سنگین بت۔ اس کے بعد بڑی اونچی کرسی پر ایک عظیم الشان حسین عمارت، بالائی اور زیریں حصہ ملا کر بیسیوں درجے گویا ملکہ وکٹوریہ سے متعلق ایک پورا میوزیم ملکہ کے فوٹو ہر سن و سال کے اور مختلف موقعوں اور تقریبوں کے وقت کے لگے ہوئے، تصویریں صرف ملکہ کی نہیں، ان کے شوہر اور پہلی اولاد اور متعلقین کی بھی۔ اور پتھر کے بت جو نصب ہیں وہ ان کے علاوہ۔ مختلف کمروں میں اس وقت کے ہتھیار کسی میں لباس، کسی میں فرنیچر وغیرہا۔ ہشت پہلو درمیانی ہال میں ملکہ کے فرمان ہندوستان کی حکومت ۱۸۵۸ء میں سنبھالتے ہوئے اور پھر ۱۸۷۵ء میں شہنشاہیٔ ہند کا لقب اختیار کرتے ہوئے وقتوں کے یہ شاہی فرمان دیواروں اور پتھروں پر کندہ ہیں اور علاوہ انگریزی، ہندی، بنگلہ کے اردو زبان میں بھی ہیں، اردو کے دونوں فرمان پڑھ کر دل نے بڑا اثر قبول کیا۔ ایک صدی قبل کی اردو آج سے کتنی مختلف تھی اور اس وقت اس کی کتنی عظمت وقعت واہمیت رعایا اور بادشاہ دونوں کی نظر میں تھی! اور اب کوئی شاہی فرمان کیوں کبھی اس سر زمین پر اُردو میں جاری ہونے لگا!...... صاحب "برہان" مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا بس اگر چلتا تو شاید چوبیسوں گھنٹہ ساتھ رہتے، تعطیلات گرما کا زمانہ ختم ہو کر ان کا مدرسہ عالیہ اب کھل رہا تھا اور شروع سال میں پرنسپل

کو جیسی مشغولیت ہوتی ہے ظاہر ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کے گھر میں کئی کئی بیمار تھے اور شدید خانگی پریشانیوں میں مبتلا۔ اس پر بھی وقت برابر نکالتے رہتے۔ چنانچہ آج کے پروگرام میں بھی وہ برابر ساتھ رہے اور رفاقت و رہنمائی دونوں کا حق ادا کرتے رہے۔

کلکتہ میں دیکھنے کے قابل یہاں کا ''زولاجیکل گارڈن'' باغ حیوانات یا عوامی زبان میں چڑیا گھر بھی ہے۔ بڑا لق و دق فرلانگوں کا نہیں، کئی میل مربع کا رقبہ گھیرے ہوئے، کوئی ایک وقت میں سارا دیکھ ڈالنا چاہے تو پیر تھک جائیں گے اور سیر ختم نہ ہو گی۔ کوئی دو چار خانے یا پنجرے میں رہتے ہوں تو بیان کیا جائے، شیر، چیتا، تیندوا، لکڑبگھا، ہاتھی، گینڈا، بندر، لنگور، بن مانس، سانپ، چیتا، شتر مرغ، ریچھ، بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، بلی، کتا، مچھلی، گلہری، مرغی، طوطا، وغیرہ آبی، صحرائی، پالتو، ہوائی ہر قسم کے چھوٹے بڑے، دیسی، ولایتی، ہیبت ناک و خوشنما جانور اور پھر ایک ایک جانور کی درجنوں بیسیوں قسمیں اور سب کے لئے ان کے مناسب حال الگ الگ تالاب اور درخت اور جھیلیں اور رمنے بنے ہوئے۔ کوئی کہاں تک گن سکتا ہے اور کس کس کو دیکھ سکتا۔ بار بار قرآن مجید کی آیت دماغ میں گشت کر رہی تھی کہ

وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ (سورہ الحجر، رکوع ۲)

ترجمہ: کوئی بھی چیز ایسی ہے جس کے ڈھیر کے ڈھیر ہمارے پاس موجود نہیں اور ہم ان میں سے ایک اندازۂ مقرر ہی کی تعداد میں دنیا میں نازل کرتے ہیں۔

جب انسانی دماغ اتنے ہی سے محدود، خزانہ کو دیکھ کر چکرا جاتا ہے تو خزانۂ قدرت کی وسعتوں کو کس بندہ کی مجال ہے کہ اپنے تصور کی گرفت میں بھی لا سکے؟...... لکھنؤ کا چڑیا گھر (زو) بھی اس میں شبہ نہیں کہ بہت بڑا اور قابل دید ہے لیکن بقول شخصے

آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟

کلکتہ کے چڑیا گھر سے اسے بھی وہی نسبت ہے جو خود لکھنؤ کو شہر کلکتہ سے

ہے...... مولانا سعید اکبر آبادی اپنے مشاغل کو چھوڑ اس سیر سپاٹے میں بھی ساتھ ساتھ۔

کلکتہ بمبئی کی طرح بالکل لب سمندر نہیں، سمندر یہاں سے ۵۰، ۶۰ میل کے فاصلہ پر ہے لیکن دریائے ہوگلی جو عین ہوڑہ اسٹیشن کے پاس سے گزرتا ہے اور شہر کے ایک بڑے حصہ کا حصار کئے ہوئے ہے اپنی وسعت و پہنائی میں سمندر کی قائم مقامی کئے ہوئے ہے اور اوّل نظر میں اس پر سمندر ہی کا دھوکا ہوتا ہے۔ کشتیاں، اسٹیمر، جہاز سب اس کی سطح پر رواں، تفریح کا بہترین منظر ہر وقت پیش کئے ہوئے اور شام کے وقت تو علی الخصوص...... میزبان حاجی عبدالقیوم انصاری کی دینداری کا یہ عالم کہ بڑی سی جانماز موٹر پر مستقلاً رکھی ہوئی۔ شام کو دریا کے کنارے سے گزرے کہ ایک بڑا میدان دیکھ کر رک گئے۔ سواریاں جو دونوں موٹروں میں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اتریں، باقاعدہ اذان ہوئی۔ پڑوس کے قلی خلاصی بھی دوڑ دوڑ کر شریک جماعت ہو گئے اور نماز مغرب دھوم دھام کے ساتھ ادا ہو گئی۔ راستہ چلتا رہا، موٹروں پر موٹریں گزرتی رہیں اور ہندو اور پارسی، عیسائی اور یہودی سب نے نظارہ کر لیا کہ مسلمان کا دین مندر و کلیسا کا پابند نہیں۔ رب السّماوات والارض کی بنائی ہوئی ساری ہی زمین مومن کے لئے سجدہ گاہ ہے۔ وہ سفر میں ہو کہ حضر میں وقت نماز اس کے لئے یکساں!

کلکتہ کی لکھوکھا کی خلقت میں ہر ملت و مذہب اور ہر ملک و قوم کا آدمی آباد ہے۔ ایک دریابادی مخلص ڈیزن لین میں رہتے ہیں، ایک دن ان کے ہاں جاتے ہوئے گزر چینیوں کی آبادی سے ہوا، رہنے والے سب کے سب چینی، چینی لڑکے کھیلتے ہوئے، چینی عورتیں گزرتی ہوئی، چینیوں کے ہوٹل، چینیوں کے مسلک و مذاق کے سارے ساز و سامان۔ واپسی میں نماز عصر اسی چینی محلہ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں پڑھی۔ اس سے متصل دیکھا کہ ایک یہودی معبد کا سائن بورڈ لگا ہوا، بس دیوار بیچ، ادھر مسلمانوں کی مسجد، ادھر یہودی کی ہیکل۔ کتابوں میں ذکر پڑھ لینا اور چیز ہے اور خود مشاہدہ کرنا اور۔ کسی ہیکل یہود کو آج تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پہلی بار اسے دیکھا مگر یہ بہت ردی

حالت میں تھی۔ دو بوڑھی غریب سی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، بچھی ہوئی لکڑی کی بنچیں الماریاں وغیرہ سب شکستہ اور بہت بوسیدہ۔ دیکھ کر کچھ جی خوش نہ ہوا اور معلومات بہت ہی کم حاصل ہو سکیں۔ سوالات جتنے کیے گئے ان کے جواب میں تقریریں تو بڑی لمبی سننے میں آتی تھیں لیکن ۹۰ فیصدی غیر متعلق، کبھی آپس کے جھگڑے، قضیے، کبھی مقامی اکابر یہود کی شکوہ و شکایت، ہاں الماریوں میں رکھے ہوئے کچھ تبرکات کی زیارت البتہ ہو گئی اور وہاں گفتگو عموماً اردو ہی میں ہوتی رہی اور یہ دیکھ کر دل کی کلیاں مسرت سے کھلتی رہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کی رہنے والیاں نہیں، کلکتہ کی عورتیں اور وہ بھی مسلمان نہیں، یہودنیں اردو ایسی صاف، رواں اور بے تکلف بول رہی ہیں کہ جیسے وہ ان کی مادری زبان ہے!...... خیر دیر کے بعد کام کی بات صرف اتنی مل سکی کہ یہاں نہیں بلکہ ایک دوسرے محلہ میں عزرا اسٹریٹ پر ان کے بڑے معبد ہیں۔ عین اس وقت یعنی ۶ بجے شام کو نماز ہو رہی ہوگی۔ سر ڈیوڈ عزرا، ابھی حال ہی میں یہود کے ایک ممتاز لیڈر کلکتہ میں گزرے ہیں، یہ سڑک انھیں کے نام پر ہے، عجب نہیں کہ ارد گرد اور بھی یہود آباد ہوں۔ شوق نے چند منٹ میں یہاں پہنچا دیا۔ یہ معبد واقعی عالی شان تھا۔ یہود جیسی ممتاز قوم کے شایان شان، اونچی کرسی اور اس پر کلیسا نما ایک بلند عظیم عمارت۔ نماز جاری تھی ہال بہت بڑا تھا، اچھے قسم کے فرنیچر سے مزین لیکن نماز اس عبادت کو صرف اس معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ خطیب قبلہ (بیت المقدس) کی طرف رخ اور حاضرین کی طرف پشت کئے ہوئے توریت عبرانی سے عبارتیں سنا رہا اور حاضرین کبھی آمین اور کبھی کچھ اور مناسب حال فقرے کبھی بیٹھے بیٹھے اور کبھی کھڑے ہو کر کہتے جاتے تھے، باقی اور کوئی بات مسلمانوں سے ملتی جلتی اس آدھ گھنٹے کے اندر دیکھنے میں نہ آئی، اور سجدہ تو خیر کیا ہوتا، رکوع یا مقتدیوں کی صف بندی یا نمازیوں کی تمام تر قبلہ رخی کوئی شے مسلمانوں کی نماز کی سی نظر نہ آئی اور اس سے زیادہ ٹھہرنے کا وقت نہ تھا...... یہود کی تاریخ جو کچھ بھی شہادت دیتی ہو، اور آج بھی اس قوم کی عملی حالت جو کچھ بھی ہو، تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ دنیا میں آج توحید و نبوت

کے نام لیوا اگر روئے زمین پر کوئی قوم مسلمانوں کے بعد ہے تو وہ یہی قوم یہود ہے، ورنہ شرک نے تو ہر ہر مذہب کے اندر اپنے قدم جمائے ہیں اور عقیدہ وحی و نبوت سے دنیا کے بیشتر مذاہب اس وقت بیگانہ ہو چکے ہیں، خود قرآن مجید ایک طرف یہود پر سخت سے سخت گرفتیں کرتا ہے، ان کی تاریخ سے نافرمانی، سرکشی، شوخ چشمی کی ان گنت مثالیں پیش کرتا ہے، لیکن دوسری طرف قرآن ہی کو اگر ذرا غور سے پڑھیے اور الفاظ کے ساتھ ساتھ بین السطور کو بھی ذہن میں رکھیے تو جابجا اسی قوم پر انعامات الٰہی اور خصوصی سرفرازیوں کی بارش کا ذکر بھی ملے گا، اور اسی قوم سے مخاطب میں بار بار انّی فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ کی تکرار بھی موجود ہوگی، لب ولہجہ کہیں بھی ایسا نہیں جیسا کہ توحید دشمن و توحید بیزار مشرکوں کے مقابلہ میں ہے۔ بلکہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفیق باپ اپنے نالائق بیٹے کو خطاب کر رہا ہے کہ "اے بدبخت میں نے تو تیرے ساتھ یہ یہ احسانات کئے، لطف و کرم خصوصی سے تجھے سرفراز رکھا، تیرے تمام ہمجولیوں میں تیری عزت بڑھائی اور تو نے اس سب کے معاوضہ میں اس درجہ ناشکری دکھائی، شروع سے اب تک برابر نافرمانی ہی کرتا چلا آرہا ہے"...... مسلمان کو ان ابراہیم زادوں، اسحاق زادوں، اسرائیل زادوں کے کیش وملت سے لگاؤ ہونا ایک حد تک بالکل قدرتی ہے۔

(5)

کلکتہ آکر مسلمانوں کے مشہور مایہ ناز "مدرسہ عالیہ" (جواب جزو "عالیہ" حذف کر کے صرف "مدرسہ" رہ گیا ہے) کی شکل نہ دیکھنا خود اپنے اوپر ظلم کرنے کے مترادف تھا۔ عین وہی زمانہ تعطیل کلاں کے بعد مدرسہ کے کھلنے کا تھا۔ صدر مدرسہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی محض اعزازی مولانا نہیں دیوبند کے باضابطہ فارغ و فاضل ہیں اور اس کے بعد انگریزی امتحانات کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ ایم اے ہوگئے، ایسی مثالیں ندویوں میں تو خاصی مل جائیں گی، دیوبندیوں میں شاذ ہی ملیں گی، بہر حال ان مجمع البحرین پرنسپل کی عنایت مجھے بغیر مدرسہ کا گشت کرائے کیوں چھوڑتی، افسوس ہے کہ وہ وقت

درس کانہ تھا ورنہ جی میں تو یہی تھا کہ استادوں کے درس میں شریک ہوا جائے اور بہ قدر ظرف اس سے استفادہ کیا جائے۔ بہر حال سہ پہر کے وقت مدرسہ کی شاندار عمارت اوپر سے نیچے تک تفصیل سے گھوم پھر کر دیکھی، کلاسوں کی وسعت و تعدد کا اندازہ کیا اور پھر ایک کمرہ میں سارے استادوں سے یکجائی ملاقات بھی ہوئی...... ان میں مولانا عبدالحلیم صدیقی اپنے قدیم عنایت فرما نکلے، انھیں دیکھتے ہی دورِ خلافت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جب جمعیت خلافت اور جمعیت العلماء ایک دوسرے کے دوش بدوش کام کر رہی تھیں، ان سے اس سے قبل بھی ملاقاتیں ہو چکی تھیں، مدرسہ میں پھر ہوئی اور نماز عصر مسجد میں انھیں کے اقتداء میں ادا ہوئی۔ مولانا حمید الدین صاحب (عزیز خاص مولانا حسین احمد صاحب) سے بھی عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ مولانا حفظ الکریم معصومی، مولانا ابو سلمہ محمد شفیع (جن کے مقالے "برہان" کے اوراق میں اکثر نظر سے گزرتے رہے) کاظمی صاحب ہیڈ ماسٹر اور دوسرے محترم استادوں کی بھی زیارت ہوئی ...... یہیں ایک صاحب نے مدرسہ کے اسکول میگزین "صبح نو" کے کچھ پرچے پیش کئے۔ رسالہ انگریزی، بنگلہ، اردو کا مجموعہ ہے جس میں ۳۲ صفحہ اردو کے حصہ میں آئے اور نام تو تمام تر اردو ہی ہے۔

اتنے قریب پہنچ کر مولانا صدیقی کے مسکن پر حاضری کیوں رہ جاتی بیچارہ اپنی بے سروسامانی اور ہم لوگوں کے اعتذار کے باوجود چائے تیار کرانے میں لگے رہے، ادھر میں ان کے ہاں دیوار سے لگی ہوئی کتابوں کا جائزہ لینے میں مصروف رہا، اچھا خاصا ذخیرہ جمع تھا، تفسیر، فقہ، ادب ولغت ہر قسم کا، سیاست کا چسکا برا ہوتا ہے، اگر مولانا اپنے وقت کو علمی خدمات کے لئے مخصوص کر دیتے تو قرآنی صرف و نحو یعنی اعراب القرآن پر ایک اچھی کتاب کی بڑی ضرورت ہے، ضرورت کے پورا کرنے کی سعادت وہ اپنے نام الاٹ کرا سکتے ہیں۔

اپنے دور کے عزیزوں میں ایک رامپوری الاصل بیرسٹر حیدر آباد دکن میں

ہائیکورٹ کے جج تھے، خلیق الزماں صدیقی ریٹائر ہوتے وقت غالباً چیف جسٹس تھے، کلکتہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہیں ہیں اور ریٹائر ہونے کے بعد پھر ایک بڑے سرکاری عہدہ پر لے لئے گئے ہیں۔ بھارت راج میں اب سرکاری منصبوں اور عہدوں کے انتخاب میں کسی مسلمان کے آجانے پر حیرت ہی ہوتی ہے، لیکن زیادہ حیرت اس لئے نہیں ہوئی کہ مسلم بیزاری کی یہ رو عموماً نیچے اور متوسط درجہ کے عہدوں تک محدود ہے۔ ورنہ جو بہت اعلیٰ قسم کے عہدے ہیں اور جو عموماً صوبہ سرکار کے اختیار میں نہیں بلکہ براہ راست مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں ان میں تو مسلمانوں کا قحط بحمد اللہ اب بھی نہیں۔ بہر حال ان کے بعد پنشن پر از سر نو منتخب ہو جانے پر مسرت کے ساتھ تھوڑی سی حیرت بھی ضرور ہوئی خصوصاً اس لئے کہ یہ بیچارہ سیدھے سادہ، نیم درویش اور متوکلانہ طبیعت کے آدمی ہیں۔ دوڑ دھوپ اور رسوخ واثر پیدا کرنے کے موجودہ طریقوں سے ناآشنا، تلاش کے بعد ان کا پتہ لگا اور ان تک رسائی ہوئی، کچھ عرصہ سے بعض بڑے شہروں میں سرکار نے ایک عدالت عالیہ لیبر ٹریبونل کے نام سے قائم کی ہے (کارخانہ داروں اور اہل حرفہ کی نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لئے) اور اس کا درجہ ہائیکورٹ کے برابر ہی رکھا ہے۔ یہ جسٹس صدیقی یہاں اس عہدہ پر ہیں اور عدالت کے محض ممبر یا رکن ہی نہیں بلکہ چیف جج (رکن اعلیٰ) دو اور جج دونوں غیر مسلم ان کے ماتحت ہیں۔ اس پر حیرت اور زیادہ رہی۔ یہ جب ملے تو پھر اسی طرح گھل مل کر ملے جس طرح ایک عزیز اپنے سے سن میں بڑے عزیز سے ایک عرصہ کی جدائی کے بعد ملتا ہے۔ دلی مسرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ ان کی مذہبیت اور سادگی میں ماشاء اللہ کچھ اضافہ و ترقی ہی ہے۔ نماز کے پابند شروع سے تھے اب لباس و عام معاشرت میں سادگی اور بڑھ گئی ہے۔ محض کرتا پاجامہ پہنے لوگوں سے ملنے ملانے بے تکلف باہر نکل پڑتے اور بیٹھتے اٹھتے سادگی و بے تکلفی اس درجہ کی کہ اتنے بڑے عہدیدار تو کیا معمولی عہدیدار بھی معلوم نہیں ہوتے! ...... ان کی والدہ ماجدہ کو دیکھا، تو دل نے خاموش پند و موعظت کے بہت سے سبق حاصل کر لئے۔ ۳۰، ۳۵ سال قبل حیدر آباد میں دیکھا تھا تو گو

جوان اس وقت بھی نہیں رہی تھیں پھر بھی خوش جمالی، خوش لباسی، خوش دماغی، خوش تدبیری میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ اب جو دیکھا تو محض ایک مجموعہ پوست و استخواں مسلسل مبتلائے کرب و فغاں، لیکن زبان پر برابر انابت و استغفار کے کلمات جاری، یہی رٹ کہ میں بڑی گنہگار ہوں، بداعمال ہوں، فرائض کی تارک رہی وغیرہا۔ عموماً تیمار دار اور عزیز قریب اس یاد کو بھلانے اس احساس کو مٹانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں حالانکہ ہر مومن و مومنہ کے لئے یہ بہترین علامتوں میں ہے۔ اور مبارک ہے وہ کلمہ گو جسے اپنی عمر کے اخیر حصہ میں انفعال و استغفار کی پوری توفیق ہو جائے۔ ہر ہر آنسو موتی کا قطرہ ہوتا ہے، نفس کو آلائشوں سے دھونے والا، روح کو پاک و صاف کرنے والا، جان کو جنت کے قابل زیادہ سے زیادہ بنا دینے والا! عارف رومی نے کچھ دیکھ کر کہا ہے ؎

خوش نماید نالۂ شبہائے تو
ذوقہا دادم بیا رب ہائے تو

تشریح:- اے ہمارے بندہ یہ تیرا رات رات بھر کراہنا آہ و زاری کرتے رہنا بیکار نہیں جا سکتا، یہ تو عین قدر کا باعث اور مقبولیت کی علامت ہے یہ تیرا "یارب، یارب" رٹتے رہنا تو ہمارے دل میں تیرے لئے اور جگہ پیدا کرنے والا ہے۔

کلکتہ مادی آنکھوں میں شہر کا شہر پورا دلہن کی طرح بناؤ سنگھار سے آراستہ گل و گلزار بنا ہوا ہے۔ دن تو دن رات کا بھی بڑا حصہ دن ہی بنا ہوا۔ ملوں، مشینوں، انجنوں، کارخانوں کی ہر وقت چیخ و پکار باشندوں کی بھاگ دوڑ کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس شہر کو سکون کبھی بھی نصیب ہوتا ہے۔ مادی رونق اور چہل پہل کے اعتبار سے کم کس حصہ کو کہئے اور زیادہ کس کو۔ اور چورنگی کا خیر پوچھنا ہی کیا، معلوم ہوتا ہے کہ تمدن جدید کی ساری بہار اور مزیداری کا عطر کھنچ کر اتنے سے خطۂ زمین میں آ گیا ہے!..... خیال پھر پھراتے بار بار یہ آتا تھا کہ زندگی کے اتنے شدید ہیجان میں کبھی موت کا بھی گزر ہوتا ہے۔ بیشمار موٹروں، بسوں، ٹرام کاروں کے درمیان کبھی کوئی جنازہ گزرتے نہ دیکھا،

اتفاق سے ایک شام کو بعد مغرب ایسے حصہ سے گزر ہوا جہاں مسلمانوں کا قبرستان تھا، موٹر کسی اور ضرورت سے رکا، دل بے اختیار چاہا کہ اتر کر قبرستان کے اندر چلئے اور فانی زندگی کی جلوہ آرائیوں سے کچھ دیر کے لئے تو صرف نظر کر کے ان مستقل شہر خموشاں والوں کی خدمت میں حاضری دیجئے..... "زندہ" کو "مردہ" ہوتے چلتے پھرتے جسم کو سطح زمین سے زیر زمین منتقل ہو جاتے، ناسوت سے عالم برزخ میں قدم رکھتے کچھ بھی دیر لگتی ہے؟ اور کسی کو کیا خبر کہ فاتحہ پڑھنے والا کس گھڑی، کس لمحہ، خود ہی فاتحہ کا محتاج ہو جائے..... وقت میں اتنی گنجائش تو نہ نکل سکی۔ احاطہ گورستان سے باہر ہی بیٹھے بیٹھے سب کے لئے دعائے مغفرت کر دی۔ اور دیر تک تصور یہ بندھا رہا کہ اس ڈھیر میں کیسے کیسے خاصان خدا کیسے کیسے مقبولین و مجاہدین بھی ہوں گے، دنیا میں کس طرح بسر کی ہو گی، یوں رہے ہوں گے ووں رہے ہوں گے اور آج پیمبروں کے وعدوں کی تصدیق کان سے نہیں، آنکھ سے کر رہے ہوں گے! دم دم کے ہوائی اڈے کو جاتے ہوئے شہر سے میلوں باہر جانا ہوتا ہے اور راستہ میں مضافات شہر یا دیہات کا بھی کچھ حصہ پڑتا ہے۔ یہ علاقہ بھی شہر کی جگمگاہٹ کے معابعد قابل دید ہوتا ہے۔ راستہ میں وہ ریل بھی پڑی جو پہلے کلکتہ کو مشرقی بنگال سے ملائے ہوئے تھی اور آج بھی پاکستان کو جاتی ہے! ڈھاکہ، کشور گنج، نرائن گنج کے مسافر اسی لائن سے آ جا رہے تھے، لائن کے مشاہدہ نے خیال کو کہاں تک پہنچا دیا۔ کل تک ڈھاکہ اور کلکتہ ایک تھے، بھائی بھائی تھے، ملے ہوئے تھے، جڑے ہوئے تھے آج کتنے ایک دوسرے سے بیگانہ ہو چکے ہیں! دوئی اور تفریق اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی، جغرافیہ اب بھی وہی، طبعی حدود کے نقشہ میں اب بھی کوئی فرق نہیں لیکن سرحد پار کرنا اب کس درجہ دشوار ہو گیا ہے اور قدرتی میل ملاپ میں یہ مخاصمانہ جدائی تمام تر انسان کے اپنے ہاتھ کی پیدا کی ہوئی! مسلمانوں کو اپنا حق حکومت خود اختیاری ملنا بالکل واجبی، لیکن اس کے معنی اس شدید تفریق کے کہاں سے لازم آ گئے تھے؟ پاکستان کے حدود کچھ ہی دور بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ چند قدم اٹھا کر اپنے ان بھائیوں سے جا کر ملنے ان کے دیکھ آنے کی صورت اب ممکن ہے،

تاوقتیکہ فلاں فلاں فارموں کی خانہ پری نہ کی جائے، فلاں فلاں محکمہ سے درخواست کی منظوری نہ عطا ہولے۔ فلاں فلاں دفتر کے چکر نہ کاٹے جائیں اور کتنا وقت کتنا روپیہ اس ''پیروی'' میں نہ برباد کرلیا جائے۔

⑥

نامہ لکھا لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

حکایت سفر ختم ہونے کو آئی ہے اور کلکتہ میوزیم کا ذکر اب تک نہ آیا خیال کئی بار آیا، ہر دفعہ قلم پر آتے آتے رہ گیا، کلکتہ خود ایک دار العجائب ہے، یہاں آکر اس کے میوزیم (عجائب خانہ) کو نہ دیکھنا اپنے کو معلومات و واقفیت عامہ کے ایک بڑے خزانہ کی دید سے محروم رکھنا ہے، میوزیم ہندوستان کے اور بھی بڑے بڑے شہروں میں ہیں، کلکتہ میوزیم سے انھیں وہی نسبت ہے جو خود ان شہروں کو کلکتہ سے ہے۔ یہاں کا میوزیم متعدد منزلوں اور بیسیوں درجوں پر شامل۔ خدا معلوم کتنے وسیع رقبہ کے طول وعرض میں ہے۔ پہلی بار تو اس کا اندازہ ہونا مشکل ہے۔ ایک مہربان میزبان جب اپنے ہمراہ دکھانے لائے تو پہلی بار دیکھ کر جیسے آنکھیں کھل گئیں، یہ اندازہ ہوتا تو شاید پورا ایک دن اس کے لئے رکھ لیا جاتا، اتنے سیکشن تھے، اور ان میں گھومنے کے لئے اتنا فاصلہ طے کرنا تھا کہ سب سیکشنوں کا سرسری گشت بھی دو گھنٹہ میں ناممکن تھا، مجبوراً کئی کئی سیکشنوں کو چھوڑنا پڑا اور جنھیں دیکھا بھی انھیں کیا دیکھا! بس دیکھنے کے نام کی ایک ہوس پوری کرلی۔ یہاں تھا وہی جو ہر میوزیم میں ہوا کرتا ہے، البتہ کمیت میں اس سے کہیں زائد اور بہ اعتبار کیفیت بھی کہیں نادر و اعلیٰ، عجیب و غریب جانوروں کے ڈھانچے دیکھ کر قدرت خدا یاد آتی تھی اور آیت کریمہ وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ایک مصری ممی لپٹی ہوئی رکھی تھی اس کا نظارہ خاص طور سے موثر تھا۔ مصر والے اپنے معززین و اکابر کے لاشے ان کے پیٹ کے اندر کی آلائش صاف کر کے طرح طرح کے مسالے لگا کر اس طرح محفوظ کر دیتے تھے کہ سینکڑوں کیا

ہزاروں برس گزر جانے پر بھی وہ جوں کی توں موجود ہیں، تابوت کے اوپر تصویر اصل زندگی کے زمانہ کی موجود رہتی ہے۔ کہاں زندگی کے زمانہ کی تازگی و شادابی اور کہاں مرض الموت کے بعد کی لاغری و پژمردگی! دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں معلوم ہوتی اور حالانکہ یہ مشاہدہ روزمرہ کا ہے اپنے گزرے ہوئے عزیزوں، دوستوں، شناساؤں سب ہی سے متعلق پھر بھی اس کا مشاہدہ تین چار ہزار سال قبل کی میت پر کر کے دل پر اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے! اسی میوزیم میں ایک ممی (ممکن ہے کہ یہی ہو) ۱۹۱۳ء میں بھی دیکھی تھی، اس وقت اس کی حیثیت محض ایک تماشہ کی تھی، اب کی یہ نظارہ ایک منظر عبرت تھا...... انسان اپنی بقا کا کس درجہ حریص ہے! اور کیسی کیسی تدبیریں اس کے لئے سوچتا رہتا ہے۔ روح کا تعلق جب جسم سے باقی رہنا نا ممکن ہو جائے تو خود جسم ہی باقی رہ جائے اس کا ڈھانچہ ہی سلامت رہ جائے طرح طرح کے مسالہ دے کر!

بمبئی کی طرح کلکتہ بھی ہوٹلوں کا شہر ہے۔ قدم قدم پر ہوٹل اور ریستوران، دلی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس بڑے کاروبار میں مسلمانوں کا خاصا بڑا حصہ ہے اور پھر اس عموم میں خصوص یہ کہ اس میں اپنے وطن والوں کو امتیاز خاص حاصل ہے۔ رزاق مطلق کی کیا شان رزاقی ہے کہ کلکتہ جیسے عظیم الشان شہر میں رزق رسانی اور حضرت میکائیلؑ کی میکائیلیت کی نیابت کے فرائض ایک بڑی حد تک سپرد کئے بھی تو دریاباد جیسے حقیر و صغیر قصبہ والوں کے! رزق رسانی صرف مسلمانوں ہی کی نہیں عامہ خلائق کی۔ ان مسلم ہوٹلوں میں یہ نظارہ دل کو بہت سرور بخشنے والا تھا کہ مسلمانوں کی بغل میں انھیں میزوں پر غیر مسلم بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور بے تکلف قورمہ کباب، وغیرہ تناول فرما رہے ہیں اور ان کے اطمینان کے لئے نمایاں تختیاں NO BEEF HERE (یہاں بڑا گوشت نہیں ہوتا) کی لگی ہوئی ہیں۔ کھانے پینے کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کا تو ذکر ہی نہیں جو دریاباد والوں کی ہیں اور کلکتہ بھر میں پھیلی ہوئی ہیں صرف اچھے بڑے اور اوسط درجے کے ہوٹلوں کو نظر میں رکھئے تو ان کی تعداد بھی ایک پر ختم نہیں ہو

جاتی۔ سب سے پہلے توزکریا اسٹریٹ کا عین مسجد ناخدا کے سامنے امینیہ ہوٹل ہے جسے یہاں کے مسلم ہوٹلوں کا سرتاج کہنا چاہئے اور جب اس کے مالک محمد امین کے بڑے بھائی حاجی عبدالقیوم نے امینیہ ریستوران نیو مارکیٹ میں کھول دیا ہے تو وہ کچھ اس سے بھی بازی لئے جارہا ہے۔ بڑے بھائی پھر آخر بڑے ہی بھائی ہیں۔ ایک روز شام کو دیکھا تو کھانے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا! یہ دونوں بھائی اپنے دعوت نامہ کے تقدم کے لحاظ سے میزبان اوّل تھے، پھر کولوٹولہ کے دو ہوٹل ایک اسلامیہ دوسرا جدید اسلامیہ، ان کے مالک حاجی عبدالجبار اپنے سن کی بزرگی اور اپنی ذاتی دینداری کے لحاظ سے میزبان نمبر دوم نہیں بلکہ میزبان نمبر اوّل ہی کہلانے کے مستحق، وہ خود اور ان کے دونوں لڑکے احمد زماں و محمد زماں جو دینداری میں اپنے والد ماجد سے کتنے ہی پیچھے ہوں لیکن مہمان نوازی میں تو ان سے کم نہیں اور پھر ان چاروں کے بعد چترنجن ایونیو کا عالمگیر ہوٹل جو اپنے قدر و قیمت کے لحاظ سے گھٹیا نہیں...... اور یہ سارے ہوٹل تو ایک ہی برادری والوں کے ہوئے، اس انصاری برادری کے علاوہ قصبہ کے خاندان سادات کا کاروبار بھی یہاں ماشاء اللہ فروغ پر ہے، ان کا ایک ہوٹل چاندنی میں صابرس SABIR'S کے نام سے خاص شہرت و مرجعیت حاصل کئے ہوئے ہے اور جس کی چائے اور بریانی اور شاہی ٹکڑے، کھانے والوں کا بیان ہے کہ ایک حیثیت امتیازی حاصل کئے ہوئے ہے، اس کے مالک حاجی حافظ سید صابر علی وہی ہیں جنھوں نے کچھ روز سے لکھنؤ ہی میں ایک اونچا ہوٹل ری پبلک ہوٹل کے نام سے اسٹیشن سے دو ہی تین فرلانگ کے فاصلہ پر لاٹوش روڈ کے ایک چوراہے پر (گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول کے مقابل) کھول رکھا ہے۔

بمبئی کے بعد کلکتہ بھی انگریزی کتابوں کی ایک بڑی منڈی ہے۔ متعدد قدیم ولایتی کمپنیوں کی شاخیں یہاں موجود ہیں، میکملنس، لانگ مینس وغیرہ اور بعض یہیں کے قدیم و جدید پبلشر خاصی شہرت رکھتے ہیں، تھیکر اسپنک، نیو مینس اسٹینڈرڈ لٹریچر

وغیرہ اپنی پہنچ سب کہیں تو کیا ہو سکتی تھی۔ ایک میزبان صاحب کی مہربانی سے نیو مینس (NEWMANS) کے ہاں ہو گئی۔ کتابوں کا ایک جنگل لگا ہوا، گو زیادہ تر کتابیں اپنے مذاق کی نہ تھیں، پھر بھی گھوم پھر کر دو ایک کتابوں پر نظر رکی اور قیمت کے دریافت کرنے کی نوبت آئی۔ گھر واپس پہنچا تو کچھ دیر کے بعد دیکھنے میں کیا آتا ہے کہ انتخاب کی ہوئی تینوں کتابیں اپنی میز پر لگی ہوئی! بغیر مجھ سے کچھ دریافت کئے ہوئے وہاں سے خرید کر آگئی تھیں...... ایسے مزاج شناس، خدمت گزار قسم کے میزبان ہر مہمان کو نصیب کہاں ہوتے ہیں۔ میزبانی کو اگر ایک فن قرار دیا جائے تو اس فن کی ٹریننگ (تحصیل و تکمیل) کے لئے ایک بہترین مدرسہ شاید یہی ہوٹل والے چلا سکتے ہیں۔ داستان سفر ختم اور اتنے لوگوں کے ہجوم میں ایک صاحب کا ذکر ہی اب تک نہ آیا، جو کوچ و مقام میں ہر وقت کے ساتھی، گویا دوسرے ہمزاد بنے ہوئے تھے، اسٹیشن پر استقبال کے وقت جو سب سے آگے ہو کر ملے تو ساتھ اس وقت بھی نہ چھوڑا جب دوبارہ اسٹیشن پر رخصت کرنے والے وہیں کے وہیں رہ گئے...... اور ڈیڑھ دو سو میل اور جھاجھا اسٹیشن تک ساتھ ہی ساتھ چلے آئے! یہ اپنے قصبہ ہی کے نہیں عین اپنے پڑوس کے محمد صدیق انصاری تھے...... اس سے زیادہ کچھ ان کے لئے لکھنا شاید ان کے اجر میں کچھ کمی کرا دینا اور انھیں ذرا سا محجوب کرنا ہے۔

۲۴ر جون کو قبل دوپہر ہوڑہ کا پلیٹ فارم چھوٹا اور سہ پہر کو جھاجھا پر صدق کے ایک عملی ہمدرد عبدالرحمٰن انصاری نے ہاتھوں ہاتھ اتارا اور چند گھنٹوں کی مسلسل مہمان نوازیوں کے بعد شب کی ٹرین سے رخصت کر دیا۔ راستہ میں دن چڑھے پر اس طرح مغل سرائے اور پھر بنارس پڑے، بنارس سے دوسری گاڑی بدلنا تھی، ڈھائی گھنٹہ انتظار کرنا پڑا، شہر کے اس حصہ کی صاف شفاف سڑکیں اسٹیشن سے دکھائی دے رہی تھیں۔ دل میں خیال آتا رہا کہ یہیں ایک پرانے ہندو رشیوں کی زندہ یادگار ڈاکٹر بھگوان داس رہتے تھے، اب شہر سے باہر کسی دیہات چلے گئے ہیں، کلکتہ کے پہلے سفر

(۱۹۱۳ء والے) میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت بھی خاصے سن رسیدہ تھے اور اب تو نوے سال سے کیا کم ہوں گے۔ مغربی فلسفہ کے ساتھ ساتھ قدیم یوگ کی خوب ریاضتیں کئے ہوئے اور اپنے علم و عمل دونوں کے لحاظ سے ایک زندہ رشی، حضرات صوفیہ کے کلام کے عاشق، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن عظیم دونوں کی اپنے دل میں قدر و منزلت رکھنے والے، اور بہت بڑی داڑھی کے لحاظ سے تو صورۃً بالکل مسلمان، انھیں نے میرے نام کے خط میں کبھی اپنے کو "عبدالقادر" لکھا ہے، جو لفظی ترجمہ ہے "بھگوان داس" کا اور مجھے مسلم "پنڈت" قرار دیا ہے...... کاش ملک میں ایسے "ہندو" لاکھوں اگر نہیں تو ہزاروں کی تعداد میں تو ہوتے (مدراس کے گورنر ہزایکسی لینسی سری پرکاش انھیں کے فرزند ہیں)۔

وطن کے متصل اجودھیا اور فیض آباد اسٹیشنوں پر بندروں کی دست درازیاں مسافروں کے ساتھ ایک بار پھر دیکھنے میں آئیں اور اکبر کا وہ نہ بھولنے والا شعر پھر ذہن کے سامنے آگیا ۔

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں
ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

(صدق جدید ستمبر ۱۹۵۵ء)



لاہور

سفر لاہور

انٹرنیشنل اسلامی کالوکیم (مذاکرہ) کا خدا بھلا کرے کہ اس کی بدولت پاکستان کے ایک بڑے اور مشہور شہر لاہور کی زیارت، بغیر کسی سابق ارادہ و توقع کے زندگی میں ایک بار پھر نصیب ہو گئی...... پاکستان کی زیارت کا شوق اور ارمان کس ہندی مسلمان کے دل میں نہیں؟ مصر، افغانستان، عراق، انڈونیشیا، دنیا کا کون سا ملک ہندی مسلمان کی برادری کے حلقہ سے باہر ہے چہ جائیکہ پاکستان جو اپنے ہی جگر کا ایک ٹکڑا اور ابھی کل تک اپنے ہی ملک کا ایک حصہ تھا اور جس سے دینی رشتے کے علاوہ تہذیبی اور تمدنی واسطے بھی ہمسائیگی، دوستی اور قرابت داری کے خدا معلوم کتنے قائم ہیں! لیکن سارے شوق و اشتیاق کے باوجود دوسری طرف خدا غارت کرے اس بیسویں صدی کی سیاسیات کو کہ اس نے دو ہمسایوں کے درمیان دوری اور بیگانگی کے پہاڑ بھی کیسے اُٹھا کھڑے کئے ہیں! اور لکھنؤ سے لاہور تک کے سفر کو جو کل تک ایک معمولی اور سہل سی بات تھی، ایک مستقل ہفت خواں کے سر کرنے کے مترادف بنا دیا ہے! سیاسی، قانونی، جغرافی وفاداری ظاہر ہے کہ ہر ملک والے کی اپنے ہی ملک کے ساتھ ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کے لئے جب تک کہ وہ یہاں کی سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں، اپنے ہی ملک کے ہر قاعدے قانون کی پابندی لازمی ہے خواہ وہ طبیعت کو کیسا ہی کھلے۔ پاسپورٹ اور ویزا کا تمام ضمنی سختیوں اور پابندیوں کے ساتھ دوڑ دھوپ، جد و جہد کر کے حاصل کرنا خصوصاً مجھ جیسے عافیت پسند گوشہ نشین کے لئے ہرگز نہ آسان ہے نہ خوشگوار، لیکن خیر جوں توں کر کے وہ بھی زیادہ تر ذاتی اثرات کے باعث یہ مرحلے بھی طے ہو گئے اور دریاباد سے لکھنؤ آ کر یہاں سے روانگی ۲۸ر دسمبر کے تین بجے سہ پہر کو لاہور کے لئے پنجاب امرتسر میل (سابق پنجاب میل) سے ہوئی۔

اپریل ۱۹۵۵ء کے سفر لاہور و کراچی میں قافلہ چار آدمیوں کا تھا اس وقت جانا ملک غلام محمد، دریا دل گورنر جنرل پاکستان کی دعوت پر ہوا تھا اور مصارف کی طرف سے اطمینان تھا۔ ابکی دعوت گورنر جنرل یا گورنر کی طرف سے نہیں محض پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے تھی۔ اور صرف ڈیلی گیٹ (مندوب) کی ذات کے لئے تھی اس کے اسٹاف یا خاندان کے لئے نہ تھی اس لئے ابکی ساتھ صرف اپنے بھتیجے اور داماد محمد ہاشم قدوائی (لیکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو بطور سیکرٹری کے لیا۔ یہ ناگزیر تھا، بغیر سیکرٹری کے سفر کرنا اپنے کو سخت صعوبتوں میں ڈالنا تھا۔ اسٹیشن ایک مختصر سی جماعت عزیزوں، مخلصوں کے ساتھ آئی اور گاڑی اپنے وقت پر روانہ ہو گئی...... چند روز پیشتر تک خوشی اس کی تھی کہ ساتھ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا رہے گا اور لاہور پہنچ کر ملنا ملانا نو مسلم یورپین فاضل محمد اسد سے رہے گا، مگر اب یہ دریافت ہو کر بڑی مایوسی ہو چکی تھی کہ ندوی سلمہ، کسی مرکزی تبلیغی اجتماع کے باعث (جو عین اسی زمانہ میں منعقد ہو رہا تھا) اس کانفرنس میں شرکت سے معذور رہیں گے اور امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی بھی کسی معذوری کے باعث نہ جا سکیں گے اور فاضل اسد کو کسی اندرونی اختلاف کی بنا پر (اور یہ "اندرونی اختلاف" ہمارے کسی دینی علمی، سیاسی ادارہ کے لئے نئی بات کونسی ہے؟) مذاکرہ کی ڈائریکٹری ہی کے عہدہ سے الگ ہو جانا پڑا ہے، دل جو پہلے ہی سے سرد یہ خیال کر کے ہو چکا تھا کہ ملاقات نہ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرنساوی سے ہو سکے گی، نہ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مدراسی سے اور نہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (پرنسپل مدرسہ کلکتہ) سے اب یہ خبریں سن کر کچھ اور زیادہ ہی سرد ہو گیا۔ پھر بھی جتنوں کے ملنے کی توقع لاہور میں تھی ان کی کشش بھی سفر کی بڑی محرک ہوئی یا تھوڑا بہت خیال یہ بھی تھا کہ ملک ملک کے فاضلوں کی تقریروں اور مقالوں سے کچھ علمی استفادہ بھی ہو جائے گا۔

امرتسر تک کا سفر کوئی ۸ بجے صبح ختم ہوا اور اس درمیان میں کوئی خاص بات

پیش نہ آئی بجز اس کے کہ لکھنؤ اور کاکوری اور ملیح آباد اور سندیلہ اور ہردوئی اور شاہجہاں پور اور بریلی، رامپور اور مراد آباد اور سہارنپور اور انبالہ اور جالندھر اور امرتسر، چھوٹے بڑے کتنے اسٹیشنوں سے گاڑی کے گزرتے ہوئے وہاں کی پرانی اور اکثر خوشگوار یادوں کا نقشہ ذہن کے سامنے غیر شعوری اور بے ارادی طور پر ابھرتا اور دل پر حسرتوں کے کچوکے لگاتا رہا!...... رامپور محمد علیؒ کا وطن تھا اور مسلم اقتدار کا نشان مدتوں رہ چکا ہے۔ یوسف علی خاں ناظم جیسے سخن سنج و ادب نواز، اور کلب علی خاں جیسے دیندار رئیس کہنا چاہئے کہ یہیں کے تخت پر جلوس افروز رہ چکے ہیں اور امیرؔ و داغؔ کا مسکن یہی سرزمین رہی ہے اس سے دل کو وابستگی کیونکر نہ ہوتی اور اسی طرح انبالہ سے لے کر امرتسر تک اور اس کے سارے گرد و نواح کی حسرتناک یادوں کو دل کی گہرائیوں سے کیونکر نکال پھینکا جاتا!...... درد و حسرت کی یادوں کا مزہ، لطف و مسرت کی یادوں کے مزہ سے کیا کچھ کم ہوتا ہے؟

۲۹ر کی صبح کو امرتسر کی واقعیت کا تجربہ ان خیالی اور تصوری تجربوں سے کتنا مختلف پیش آیا! یہ دن کی بیداری تھی، خوابوں والی رات نہ تھی!...... یہ کسٹم کی چوکی تھی اور کسٹم کی تلاشی گویا ناسوت میں عالم برزخ کے احتساب نکیرین کا ہلکا نمونہ! عوام تھرڈ کلاس والوں بیچاروں کی تو خبر کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ عورتیں، بوڑھیاں، بچیاں، برقعوں میں لپٹی لپٹائی جو ہندوستان کے خدا معلوم کن کن گوشوں سے چلی آ رہی تھیں اپنا سارا بوریا بدھنا کھولے بیٹھی کھڑی ہیں، کٹوروں، پتیلیوں، برتنوں کے بھرے بورے کھول کھول کر ایک ایک چیز دکھائی جا رہی ہے، کسے کسائے بستر ے، گٹھڑیاں، پٹاریاں کھل کر کپڑوں کے ایک ایک تار کی جانچ ہو رہی ہے! اور کشمکش افراتفری کا عالم بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ فرسٹ کلاس والے خواص جو اپنی اپنی برتھ ریزرو کرائے اپنے زعم و پندار میں بڑے آرام و آسائش سے چلے آ رہے تھے ساری سٹی پٹی بھولے ہوئے اپنے اوپر نفرین کر رہے اور اپنے نصیب پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ ٹارچ کھول کر دکھایئے اور ٹفن باسکٹ کا کوئی خانہ بے دکھائی کے جانے نہ پائے میدان حشر کا سا منظر۔ یہ اے

دھکیل رہا ہے وہ اس پر پلا پڑتا ہے، بچے چیخ رہے ہیں، چلّا رہے ہیں، بڑے بوڑھے قلیوں کے ہمراہ غل مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں...... اعلیٰ وادنیٰ، عوام وخواص، عامی وعالم، راجہ پرجا کے سارے امتیازات اس وقت رخصت، سب نفسی نفسی کے عالم میں گرفتار، اقبال کا مشہور شعر، گو ایک بالکل دوسرے سیاق میں حرف حرف مصور ومجسم

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز!

یا یوں سہی

تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

ذرا ان ڈپٹی صاحب کو دیکھئے کس شوق اور چاؤ، نفاست اور سلیقہ مندی کے ساتھ سوٹ کیس کے اندر اپنے کپڑے مرتب کر کے لئے جا رہے تھے کہ کہیں شکن نہ پڑنے پائے۔ ایک ایک چٹ یوں اُلٹ پلٹ کر دیکھی جا رہی ہے کہ جیسے پولیس مال مسروقہ کا کھوج لگا رہی ہے! اور ان پروفیسر صاحب کو ملاحظہ کیجئے، شدید سردی کے موسم میں چسٹر اور کوٹ اور قمیص اور واسکٹ اور بنیان ایک ایک لتے کی جامہ تلاشی لی جا رہی ہے!...... قصور شخصی طور پر کسٹم اسٹاف کے کسی رکن کا نہیں کام ہی ایسا گندہ ہے نظام کار ہی کچھ اسی طرح کا رکھ دیا گیا ہے کہ ہر شریف کو شروع سے مجرم ہی فرض کر لیا جائے...... آخر دنیا میں اور بھی تو سارے ملک ہیں جن کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں، کسٹم وہاں بھی ہوتا ہے کہیں بھی انسانیت اتنی پست سطح پر اتری ہوئی دکھائی دیتی ہے! یورپ کے مسافروں کا تو بیان ہے کہ فرانس سے جرمنی میں داخل ہوتے تو گویا پتہ بھی نہیں چلنے پاتا۔ گاڑی سے خود اترنا پڑتا ہے، نہ سامان کا اُتارنا وہیں ڈبے میں بیٹھے بیٹھے سامان کی جانچ (چیکنگ) ہو جاتی ہے، منٹوں بلکہ کبھی کبھی سیکنڈوں کے اندر! یہ بدبختی ہم ہی دونوں ہمسایوں پر کیوں مسلط ہے کہ جب ایک بار ادھر سے ادھر کا سفر کا تجربہ کر لیجئے تو مدتوں کے لئے ہمت جواب دے جائے اور دہشت دل میں ایسی

سما جائے کہ سفر کی حسرت وارمان میں برسوں گزر جائیں اور دوبارہ تجربہ کرنے کا حوصلہ کسی طرح نہ ہو!...... نجات کی شرط اگر محض مجاہدہ ہی ہے خواہ وہ کسی نیت سے اور کسی نوعیت کا ہو تو بشارت ہو پاکستان وہندوستان کی سرحد کے ہر پار کرنے والے کو کہ وہ بے شک وشبہ جنتی اور نجات یاب ہے!...... کاش دونوں مملکتوں کے بڑے عہدیدار ریل ہی سے سفر ایک دوسرے ملک کا اور عام مسافروں کی حیثیت سے کریں، جب شاید انھیں صحیح اندازہ مسافروں کی مصیبت کا ہو سکے۔

پاسپورٹ حاصل کرنے میں ایک بڑی پخ فوٹو کی لگی ہوئی ہے اور تصویر کھنچوانے میں علاوہ شرعی کراہت کے طبعًا بھی کراہت محسوس ہوتی ہے اور اس کے لئے بڑی حیص بیص کے بعد ہی اپنے کو آمادہ کر پاتا ہوں۔ اور پاسپورٹ کے حصول کے بعد دوسری سنگلاخ منزل اسی کسٹم کی ہوتی ہے...... خیر وہ وقت بھی دنیا کی ہر مصیبت کی طرح آخر گزر ہی گیا۔ سامان کی "چیکنگ" ہو چکی، پاسپورٹ بھی چند منٹ کے اندر پاس ہو گیا، درجے کے اندر سے بچے کھچے اسباب کے ساتھ از سر نو قدم رکھا اور اطمینان کا سانس لیا کہ ایک بڑے عذاب سے چھٹی پائی۔ لیکن نہیں، ابھی چھٹی کہاں ملی

سنگ اٹھایا تھا کہ سَر یاد آیا

ابھی ایک منزل لاہور کی چیکنگ کی بھی تو ہے۔ وہاں پھر سامنا اسی عذاب کا کرنا ہے۔

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور!

دیکھئے وہاں کیا کیا پیش آئے!...... گاڑی چلی اور جہاں سے مسجدیں دکھائی پڑیں دل نے کہا اب ہم پاکستان کے حدود میں داخل ہو گئے اور اپنا وطن پیچھے چھوٹ گیا...... دونوں طرف کے سرحدی اسٹیشنوں پر فوجی پولیس کے جو مسلح نوجوان بندوقیں لئے ان پر سنگینیں چڑھائے مسافروں کے دلوں پر رعب بٹھانے کے لئے کافی ہی نہیں، کافی سے زائد تھے اور اس نہ بھولنے والی تلخ حقیقت کو خواہ مخواہ یاد دلا رہے تھے کہ اب

سرحدیں اگر دشمن ملک کی نہیں تو نیم دشمن ملک کی ضرور ہی شروع ہو رہی ہیں! تقسیم ملک جس طرح اور جن حالات میں ہوئی وہ عمر بھر خون کے آنسو رلانے کے لئے کافی ہے۔ ہر تازہ سفر اس زخم کو از سر نو تازہ کر دیتا ہے اور اس دردناک حقیقت کو نئے سرے سے جلا دیتا ہے۔

گاڑی حدود پاکستان میں داخل ہو کر خدا معلوم کیوں اب بہت سست چلی، لیکن آخر منزل مقصود کو پہنچ ہی گئی۔ واہگہ گزرا، ہربنس پورہ نکلا، مغلپورہ گیا، لاہور چھاؤنی آیا اور لیجئے لاہور جنکشن آ گیا۔ نظر اضطراراً پلیٹ فارم کی طرف اُٹھی۔ میزبان یعنی یونیورسٹی کی طرف سے تو یقیناً کوئی آیا ہو گا۔ اور ملنے والوں میں سے بھی دو چار تو ضرور ہی موجود ہوں گے ...... لیکن یہ کیا! یہاں تو بجز قلیوں کی پلٹن کے بالکل سناٹا! اور ایک میرے ہی لئے کیا معنی کسی کے لئے بھی کوئی دوست عزیز پلیٹ فارم پر موجود نہیں! اسٹیشنوں کے دستور کے بالکل برخلاف! اور پھر وقت بھی رات کا کوئی ناوقت نہیں! جاڑوں کی عین دوپہر! یا الٰہی شہر کی اجنبیت کا کیا علاج ہو گا اور مہمان گاہ تک رہنمائی کی کیا صورت ہو گی! ...... لیکن خود یہ پلیٹ فارم بھی تو بہت تنگ سا ہے۔ ایک لمبی چٹ سی بس چلی گئی ہے۔ طول مع عرض نہیں بلکہ طول بلا عرض! اور عرض کے سارے رقبہ پر جنگلے اور کٹہرے کی عملداری! اور ادھر ادھر مسلح پولیس کا پہرا! ایک عجیب منظر اور توقع اور اندازے سے بالکل نیا ہی نقشہ! ...... آج عبارت کے لکھنے میں دیر لگ رہی ہے اور قدرۃً اس کے پڑھنے میں بھی اس وقت اتنا وقت کہاں تھا سارا سوچ بچار ایک آدھ سیکنڈ میں ختم۔ سامنے نظر اُردو کے مشہور انشا پرداز خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم پاکستانی اور ان کے ایک رفیق پر پڑی اور ذرا جان میں جان آئی ...... وہ لمحہ اور، اور سارا معمہ حل ہو گیا ...... یہ ساری برکت اسی ناشدنی "کسٹم" کی ہے جس سے ابھی ابھی سابقہ امرتسر اسٹیشن پر پڑ چکا! اب یہ پلیٹ فارم عام مسافروں کی راحت و آسائش کے لئے نہیں بلکہ کسٹم والوں کا تھانہ ہے، جو اپنے دبدبہ اور جبروت، اپنی دہشت انگیزی اور رعب افگنی

میں پولیس کے تھانے سے ٹکر لیتا ہے! ...... مردہ بدست زندہ۔ اب نجات کی صورت ہی کیا! یونیورسٹی نے اچھی میزبانی اور اپنے مہمان کی اچھی راحت آسانی کی! کاش کوئی صورت الٹے پاؤں واپس چلنے جانے کی ہوتی! امرتسر کی ساری زحمتیں ایک ایک کر کے نظر کے سامنے پھر گئیں! ...... کیا یہی برتاؤ برطانیہ اور کناڈا، سیلون اور تھائی لینڈ، افغانستان اور فرانس سے آنے والوں کے ساتھ بھی ہوا ہو گا؟ انھیں بھی اس ہفت خواں سے گزرنا پڑا ہو گا! ...... جی نہیں یہ لطف خاص تو شامت زدہ ہندوستانیوں ہی کے لئے مقسوم ہے جیسا کہ ادھر سے جانے والے پاکستانی مسافروں کے لئے بھی مقدر ہو چکا ہے!

اُردو کا انشا پرداز پلیٹ فارم پر ادب و انشا کے جوہر دکھانے کے لئے نہ تھا۔ اپنے کمال اخلاص سے اور اجنبی مسافر کی مصیبتوں کا اندازہ کر کے خالص مسافر نوازی کے جذبے سے متاثر، اس کی دستگیری کے لئے اسٹیشن آ موجود ہوا تھا۔ اور جو کام اصل میزبان یونیورسٹی کے کرنے کا تھا اسے خواہ مخواہ اپنے ذمہ لے لیا۔ اس کے اثرات یہاں محکمہ کسٹم کے کارکنوں پر تھے۔ اس کا وجود اس وقت فرشتۂ رحمت ثابت ہوا اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو گیا۔ چند ہی منٹ کے اندر ہم لوگ جنگلے سے باہر نکل آئے اور اب معلوم ہوا کہ قید میں نہیں آزاد دنیا میں ہیں! ...... اب یونیورسٹی کے نمائندے بھی ملے جو مجھے لینے کے لئے اسٹیشن آئے تھے اور اپنے دو ایک عزیز مقیم لاہور بھی دکھائی دیئے ...... موٹر موجود تھی اور چند منٹ بعد ہم لوگ ہوٹل میں اپنے کمرہ کے دروازہ پر موجود تھے۔ یہ لاہور کا مشہور "نیڈوز" ہوٹل تھا۔ نام بارہا کان میں پڑ چکا تھا کیا خبر تھی کہ کچھ دن کا آب و دانہ یہاں لا کر مہمان رکھے گا! پچاسوں بیرونی مہمان میں سے جو بالکل "صاحب" قسم کے لوگ تھے وہ اس سے بھی معزز تر ہوٹل "فلیٹی" میں اتارے گئے اور کچھ اونچے لوگ سرکاری سرکٹ ہاؤس میں، دوسرے درجہ کے لوگوں کے لئے مہمان خانے دو تجویز ہوئے تھے۔ ایک بہاولپور ہاؤس، دوسرا یہی نیڈوز ...... "گورے" اور

"کالے" یا "صاحب" اور "نیٹو" کا فرق مراتب یہاں بھی قائم! اور یہ ترتیب ہے بھی کچھ فطری ہی سی! ع

چابک سواراں یک طرف مسکیں گدایاں یک طرف!

یہ نیڈوز اب سرکاری اہتمام میں ہے اور اس میں عموماً سرکاری افسر اور عہدیدار ہی ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ہے بڑا لق ودق دو منزلہ طویل و عریض۔ ایک وقت میں صدہا مہمانوں کو جگہ دینے والا، گو انتظام اب انگریزوں کے زمانے کا سا نہیں۔ آکر دیکھا تو اپنے علاوہ اور بھی کئی مہمان اس ہوٹل میں مقیم پائے۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ (سندھ کے سابق ڈائریکٹر تعلیمات اور عربی زبان وادب کے ماہر) ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (سابق استاد عربی لکھنؤ یونیورسٹی اور اور استاد عربی کلکتہ یونیورسٹی) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی دہلوی ثم کراچوی (سابق وزیر مرکزی حکومت) اور سب سے بڑھ کر حیدر آباد دکن کے مشہور فلسفی وصوفی ڈاکٹر میر ولی الدین جن سے مدتوں کے کمال اشتیاق کے بعد پہلی بار ملاقات ہندوستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں مقدر تھی۔ ان کا کمرہ اپنے ہاں سے فاصلہ پر تھا اور ان کے ہمراہ زنانہ بھی تھا۔ تاہم یہی مسرت کیا کم تھی کہ وہ ہیں تو اسی ہوٹل میں۔ کھانے کے مشترک کمرے میں اکثر ان کا ساتھ ہو جاتا۔

ہوٹل کی زندگی گھر کی زندگی سے خاصی مختلف ہوتی ہے۔ مدت دراز ہوئی ایک بار بمبئی کے ایک اوسط درجہ کے اور شملہ کے ایک اونچے درجہ کے ہوٹل اور دہلی اور نینی تال کے معمولی ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا، اب ایک عمر گزر جانے اور نوجوان سے بوڑھے ہونے کے بعد پھر ۱۰، ۱۱ دن جم کر ہوٹل میں رہنے کا اتفاق ہوا، تو وہ پرانے اور بھولے ہوئے سبق تازہ ہو گئے۔ صبح تڑکے اور سہ پہر کی چائے کو چھوڑ کر باقی تینوں وقت کھانے کے کمرے میں جانا ہوتا تھا جو اپنے کمرے سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا اور یہ جانا آنا کھل جاتا تھا بے ضرورت وقت ضائع ہوتا تھا اور پھر انگریزی طریقہ جو کھانا کھانے کا ہے، یعنی سب کھانوں کے ایک ساتھ آجانے کے بجائے ایک ایک

کھانے کا، وہ بھی وقت کے فصل سے آنا، یہ اور زیادہ کھل کر رہا۔ اور جو کام ۱۵ منٹ میں ہو سکتا تھا بلاوجہ اس کے لئے ۳۵، ۴۰ منٹ ہر مرتبہ نکالنے پڑتے۔ ڈیڑھ ہفتہ کے قیام میں ان گھنٹوں کی میزان کتنی پہنچی! عمر عزیز جس کے کسی ایک لمحہ کی بھی قیمت کے لئے بادشاہ ہفت اقلیم کا خزانہ کفایت نہیں کر سکتا اور جس کی شان میں عارف رومی نے یہ فرمایا ہے

دادہ عمرے کہ ہر روزے ازاں
قیمت آں کس نہ داند در جہاں

وہ یوں بھی کیا کم نذر غفلت ہوتی رہتی ہے۔ اس کا اس بیدردی سے خون ہوتے رہنا طبیعت کو بہت ہی گراں گزرتا رہا۔ انگریزی معاشرت کے بعض پہلو یقیناً اچھے بھی ہیں لیکن ہماری شامت کہ اندھی تقلید میں ہم نے انگریزوں کی الٹی سیدھی ساری ہی عادتیں سیکھ ڈالیں اور انھیں میں سے یہ اتلاف و اضاعت وقت بھی ہے، طہارت وغیرہ کے سلسلہ میں ان کی جو بہت ہی گندی عادتیں ہم نے اختیار کر لی ہیں وہ تو سرے سے ناقابل ذکر ہیں!...... ہوٹل کے بیرے اور (کھانا کھلانے والے) کئی ایک یوپی (میرٹھ، بریلی وغیرہ) کے نظر آئے۔ بیچارے بھگدڑ میں بے سوچے سمجھے یہاں بھاگ آئے اور نتائج و عواقب پر نظر جب اچھے اچھے پڑھے لکھوں اور عقل و شعور والوں کی نہ گئی تو ان غریبوں کی کہاں سے جاتی۔

بڑے شہروں میں سواری کا مسئلہ ایک ٹیڑھی کھیر ہوتا ہے۔ کالو کیم والوں نے سواری کا انتظام خاطر خواہ تو نہیں البتہ درجۂ غنیمت میں رکھا تھا سوا سو مہمان کے لئے سوا سو موٹریں اور وہ بھی برابر دس دن تک مہیا کئے رہنا آسان تھا بھی نہیں، دو چار ٹیکسیوں کے علاوہ دو بسیں بھی مستقل کرایہ پر لی گئی تھیں۔ ایک بس فرسٹ کلاس مہمانوں یعنی فلیٹی ہوٹل والوں کے لئے اور دوسری ہم سیکنڈ کلاس مہمان یعنی نیڈوز ہوٹل اور بہاولپور ہاؤس والوں کے لئے۔ یہ جلسہ کے وقت آکر مہمانوں کو لے جاتیں

اور ختم پر ہوٹل اتار جاتیں یہاں تک تو ٹھیک تھا، لیکن اب اگر کسی مہمان کو اپنی کوئی ذاتی ضرورت پیش آجاتی (اور کیوں نہ پیش آتی) تو مشکل ہی پڑ جاتی اور ٹیکسی کیا معنی بس کے لئے بھی کچھ بے بسی ہی محسوس ہو کر رہتی! بس پر مختلف مندوبوں خصوصاً ڈھاکہ، راج شاہی، چاٹگام والوں کی یکجائی نصیب ہو جاتی اور خوب خوب باتیں سننے میں آجاتیں!...... نیڈوز ہوٹل کے کمرے کچھ اس رخ پر واقع ہوئے تھے کہ کمروں میں دھوپ کا گزر ہی نہیں، مرطوب ہونے کے علاوہ فجر کے بعد اور مغرب سے قبل بھی روشنی جلایئے جب جا کر لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کر سکیے۔

مندوبوں کے کمرے بھی سب متصل نہیں دور دور تھے۔ آپس میں ملنا ملانا یا تو ڈائننگ روم (کھانے کے کمرے) میں ناشتے اور کھانے کے وقت ہو جاتا یا بس پر آتے جاتے اور پھر جلسہ گاہ میں چائے کی میز پر! مسلمان اور یورپین (یا امریکن) کے ہاں کھانے پینے کی کیا کمی، ہر تھوڑی دیر کے بعد چائے یا کافی کا وقت آجانا لازمی تھا! (حالانکہ کھانے پینے کے معاملہ میں بدنامی غریب "مولوی" ہی کے حصہ میں آئی ہے)

......اور گپ شپ کا ہونا تو چائے اور ناشتے سے بھی بڑھ کر ضروریات میں داخل!

لاہور پہنچنا ۲۹ر دسمبر کی دوپہر کو ہوا تھا، مذاکرہ کا افتتاح آج ہی سہ پہر کو تھا، لاہور کے حساب سے ساڑھے ۳ پر یعنی لکھنؤ کے حساب سے ۴ پر مغربی پاکستان کی گھڑیاں ہند۔ ستان کی گھڑیوں سے آدھ گھنٹہ پیچھے ہی ہیں، کھانے اور نماز دونوں سے فراغت کر اور جلدی جلدی تیار ہو ہو اسرکاری بس پر یونیورسٹی ہال پہنچے۔ اجنبی ماحول، اجنبی چہرے، جانی پہچانی صورتوں میں سب سے پہلے جناب سالک نظر آئے...... فال نیک ہوئی پہنچ ہی کر اندازہ ہوا کہ صدر مملکت یا شاہ ذی جاہ کی آمد کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ سامنے لان پر فوجی بینڈ کی مسلسل موسیقی، تماشائیوں کی ریل پیل، فوٹو گرافروں کا ہجوم برآمدہ میں ملک ملک کے مندوبین سب دو رویہ قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے کہ صدر محترم سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل کریں گے، خاصا وقت انھیں تکلفات کی

نذر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے نزول اجلال ہوا۔ ایک صاحب کو دیکھا کہ صدر مملکت کے جلو میں سب سے پیش پیش ہیں، اور وہی ایک ایک کو ملا رہے ہیں، سر پر معمولی ترکی ٹوپی، جسم پر سیاہ شیروانی اور چہرہ پر کچھ سفید کچھ سیاہ داڑھی۔ یہ کون ہو سکتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے مشہور وائس چانسلر میاں افضل حسین یہی ہیں۔ اچھا یہ؟ ان کی "صاحبیت" کے تو اتنے چرچے سننے میں آچکے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ یہ تو سراپا انگریز نکلیں گے! خیر باطن کا حال تو سابقہ کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے...... ہال کے اندر فوٹو گرافروں کی یلغار بے پناہ تھی۔ ہر منٹ پر کیمرے کی کھٹ اور فلیش لائٹ کی چمک! گویا تصویریں زیادہ سے زیادہ اور ہر زاویہ اور ہر رخ سے لی جا کر رہیں گی! فوٹو گرافی جائز بھی ہو جب بھی یہ شدت اور یہ کثرت تو شاید کراہت طبعی پیدا کر دینے کے لئے بالکل کافی ہو۔ ایڈریس چار چار ہوئے، ایک صدر کا دوسرا گورنر صاحب مغربی پاکستان کا تیسرا وائس چانسلر کا چوتھا کلوکیم کے ڈائریکٹر کا۔ کسی میں کوئی بات خاص طور پر قابل اعتراض نظر نہ آئی، سب سے زیادہ ڈر و خوف صدر صاحب کے ایڈریس سے لگا ہوا تھا۔ لیکن خیریت ہی رہی۔ ملا پر چوٹیں اور خوب خوب چوٹیں اس میں تھیں ضرور لیکن یہ اپنی طرف سے صفائی بھی موجود تھی کہ اس ملا سے مراد کٹھ ملا یا علمائے سو ہیں، حقیقی اہل علم اور صاحب عمل علماء مراد نہیں...... اخباری روایتوں سے اندیشہ یہ ہو رہا تھا کہ علماء کی طرف سے پرزور مخالفت کا مظاہرہ ہوگا، یہ کچھ نہ ہوا اور نہ اس کے ہونے کی کوئی وجہ تھی۔

ڈائس پر صدر مملکت اور گورنر صاحب زریں کرسیوں پر جلوہ افروز تھے اور آگے پیچھے دائیں بائیں خدم و حشم، ڈائس کے سامنے کے رخ پر عام حاضرین تھے۔ بائیں طرف کلوکیم کے نمائندے ملک وار ترتیب کے لحاظ سے اور داہنی طرف ذرا ہٹ کر زنانہ سیکشن۔ لاہور کی آزادیوں اور بیباکیوں کے قصے اخبارات میں پڑھ کر خیال یہ تھا کہ ادھر کا منظر اسلامی غیرت رکھنے والوں کے لئے ذرا صبر آزما ہوگا، لیکن الحمدللہ کہ یہ

اندازہ غلط نکلا۔ بیبیاں اور لڑکیاں ایک تو زیادہ تر برقع پوش تھیں اور جو یوں نہیں تھیں ان کی بے پردگی بے حیائی کی حد تک نہیں پہنچنے پائی تھی اور یہ رنگ صرف اسی افتتاحی دن نہیں بلکہ مذاکرہ کے عام جلسوں میں آخر تک قائم رہا۔ بجز ایک رات کے کہ جب جلسہ گاہ میں ڈنر ہوا تھا تو اس وقت البتہ "بیگمات" کا لباس اسلامیت کیا معنی مشرقیت کا بھی منہ چڑا رہا تھا۔ اور اسی جلسہ میں ڈنر کے بعد فلم کے پردے پر بے حجاب خاتون پاکستان کی خواہ مخواہ نمائش اپنوں اور بیگانوں سب کے سامنے کرائی گئی تھی۔ اس نسبتہً اور بحیثیت مجموعی اعتدال قائم رہ جانے کا باعث شاید یہ ہو کہ انتظامی کمیٹی میں جہاں "ماڈرن" بلکہ "الٹراماڈرن" قسم کے متعدد ممبر تھے وہیں کچھ نمائندے قدیم اسلامی اور مسلم تہذیب کے بھی تھے۔

عصر کا وقت اخیر ہو رہا تھا جب جلسہ اس اعلان کے ساتھ برخاست ہوا کہ اب باہر لان پر ایٹ ہوم کے لئے چلئے۔ کاش اعلان یہ ہوا ہوتا کہ اب نماز عصر کے لئے چلئے...... اپنا معمول اب عرصہ سے بہت سے تلخ تجربوں کے بعد اب ایسے موقع پر نماز عصر بالکل اوّل وقت پر اور نماز ظہر کے بعد ہی پڑھ لینے کا ہے ورنہ اور سارے بڑے چھوٹے پروگرام تو خیر پورے ہو ہی جاتے ہیں، آئی گئی بس نماز ہی پر ہوتی ہے اور وقت حنفی کا اگر زیادہ اہتمام رکھئے تو نماز ہی سرے سے خطرے میں پڑ جائے!...... چنانچہ اس کے دوسرے دن کا ذکر ہے کہ شام کو جب گورنمنٹ ہاؤس میں صدر مملکت کا ریسیپشن (نزول اجلال) پورے شاہانہ کروفر اور شاہان مغلیہ کے درباری جاہ و جلال کے ساتھ ہوا، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے نظر کے سامنے یہ سماں بندھا رہا کہ جیسے اس دور جمہور میں تقریب کسی صدر مملکت کی نہیں بلکہ عہد ماضی کے کسی جہاں پناہ کسی ظل سبحانی، کسی شہنشاہ وقت کی ہو رہی ہے۔ نمازِ مغرب کے ساتھ معاملہ کچھ اسی قسم کا پیش آکر رہا۔

کلوکیم یا مذاکرہ کا تذکرہ ایک مستقل عنوان سے ان صفحات میں آچکا ہے۔ یہاں

سفر نامہ کے سلسلے میں اس کا ذکر محض ضمناً اور اجمالاً ہی آسکتا ہے اور اس نمبر کے بعد تو شاید اتنا بھی نہ آئے۔

مسلم ملکوں کے مندوبین میں سب سے زیادہ جاذبیت اور مرکزیت مصر کی معروف و مقبول شخصیت عبدالوہاب عزام پاشا کے حصہ میں آئی، جدھر نکل جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور وہ بھی اپنی طرف سے شاید ان کے اور ان کے سب کے دلوں کو گویا ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ ایک ہلکی سی جھلک گویا

ہم رو سوے تو بود و ہمہ سو روے تو بود

کی۔ عزام ایک تو معقول و متوازن خیالات کے ہیں، مغربی علوم وفنون سے نہ تو جاہل نہ اُن کے نام سے چڑنے والے اور پھر ایک بات یہ بھی کہ اُردو سے خوب واقف۔ اقبال کی بعض نظموں کے مترجم بلکہ اردو بول بھی لیتے ہیں۔ مصر، شام اور دوسرے مسلم ملکوں کے مندوب بھی، کسی کے اندیشے اور کسی کی امید کے خلاف عموماً اچھے پختہ مسلمان ہی ظاہر ہوئے اور ان میں زیادہ نمایاں شخصیتیں یہ یاد رہ گئیں: شیخ الحدیث بہجت البیطار (شام) ڈاکٹر عمر بہاء الدین الامیری (شام) شیخ ابوزہرہ (مصر) شیخ مصطفیٰ زرقا (مصر) محمد خلفت اللہ (مصر) اور ڈاکٹر عبداللہ المصری۔

غیر مسلموں میں اوّل نمبر پر قدرۃً مشہور و معروف پروفیسر فلپ ہٹی رہے پھر اٹلی کے پروفیسر الیگزینڈر بوسینی جو اردو کے بھی عالم نکلے۔ فرانس کے معمر پروفیسر مسینیان (منصور حلاج کی کتاب الطواسین والے) ہالینڈ کے ڈاکٹر ڈریوز اور برطانیہ کی مس لیمیٹن (لندن یونیورسٹی کی اُستاد فارسی)۔

مقالے بیشتر اچھے ہی پڑھے گئے۔ دو چار البتہ ایسے تھے جن میں تجدد زدگی نمایاں تھی۔ اس کا توڑ یوں ہوا کہ سہ پہر کے بھرے جلسوں میں ان پر خوب جرح وقدح، لے دے ہوئی اور افسوس ہے کہ ایسے سارے مقالے پاکستانیوں ہی کے نکلے۔ غریب ترکی خواہ مخواہ بدنام رہا۔ باہر والے خدا معلوم کیا تاثر پاکستان کی اس "روشن خیالی" اور تجدد نوازی کا لے کر گئے ہوں گے! حیرت کے ساتھ بڑی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ

ایران کے نمائندوں میں اول تو ایک شیعہ ڈاکٹر بدیع الزماں فروزاں فر ایسے تھے جو سرخیل صوفیہ حضرت مولانا رومیؒ کے خصوصی پرستاروں میں ہیں اور ان پر ایک سے زیادہ کتابیں شائع کرچکے ہیں بلکہ انھیں نمائندوں میں ایک ٹھیٹھ سنی بھی تھے یعنی شافعی المذہب شیخ الاسلام کردستان!...... بڑا سبق اس کے اندر ہندوستان و پاکستان دونوں کے گرفتاران ابوبکرؓ و علیؓ کے لئے ہے!

پاکستان کے نمائندوں میں نمایاں شخصیتیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، ڈاکٹر محمود حسین خاں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور مولانا ظفر احمد انصاری کی ثابت ہوئیں اور اپنے محدود حلقہ کے اندر "ثقافت" والے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور "طلوع اسلام" والے پرویز صاحب کی بھی اور ہندوستان کے مختصر سے وفد کی گو سرداری اس نااہل کے سر زبردستی ٹھونس دی گئی لیکن حقیقۃً اس کے اہل ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی تھے۔ مدعو اشخاص کی اہلیت سے متعلق گفتگو تو ہمیشہ ہی چل سکتی ہے اور چلتی رہتی ہے لیکن اگر کچھ ہی زیادہ سوچ لیا جاتا تو ہندوستان کی حد تک تو بہرحال نمائندگی بہتر اور کامل تر ہو سکتی تھی اور پاکستان سے بھی بعض اہم ناموں مثلاً اسد صاحب یا ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے رہ جانے پر حیرت ہی ہے۔

عیب جوئی کی آنکھ تو ہر مجمع میں بہت کچھ دیکھ سکتی اور عیب کی زبان ہر مجلس سے متعلق بہ آسانی کھل سکتی ہے لیکن اس کلوکیم سے کوئی اور نفع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، یہ نفع کیا کچھ تھوڑا ہوا کہ عالم اسلامی کی ایسی ایسی قابل فخر شخصیتوں کو آپس میں ملنے جلنے اور گفت و شنید کے مواقع ملے وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سمجھے...... بھائی چارے کے نظارے سے وہ شریف غیر مسلم بھی متاثر ہوئے جنھوں نے اسلامی اخوت کا ذکر، اب تک صرف کتابوں میں پڑھا تھا!...... کاش اسی تجربہ سے پاکستان پورا فائدہ اٹھائے! اس بار کی غلطیوں اور فروگزاشتوں سے سبق لے اور آئندہ جب بھی اسے اس اسلامی مذاکرہ کی دعوت دینے کی سعادت نصیب ہو تو وہ اجلاس اسی سے کہیں بڑھ کر نافع اور

جامع ثابت ہو۔

لاہور میں ایک محترم و برگزیدہ شخصیت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری ثم لاہوری کی ہے۔ ایک معمر بزرگ اور حضرت تھانویؒ کے خلیفہ اجل و ارشد، مسجد نیلا گنبد سے ملحق مقیم "ہمسایۂ خدا" کہنے کی جرأت تو بجز غالب کے اور کس کو ہو سکتی ہے، البتہ خانۂ خدا کے ہمسایہ تو بہرحال ۱۹۵۵ء کی طرح ابھی بھی۔ لاہور پہنچتے ہی ان کی زیارت کے لئے "شذرحال" کیا اور نمائش وغیرہ جانے کے بجائے ٹیکسی کر، ان کے ہاں حاضری دی۔ مولانا اب پیروں سے مستقل معذور ہو گئے ہیں اور یوں بھی صحت خراب ہی رہا کرتی ہے، لیکن چہرہ کی بشاشت اور خندہ جبینی میں ذرا فرق نہیں۔ جتنی دیر بیٹھنا نصیب ہوا بین طور پر محسوس ہوتا رہا کہ ایک اللہ والے کا قرب نصیب ہے...... مولانا باوجود اس گوشہ نشینی کے ترک علائق کے ایک عظیم الشان مسجد اور ایک رفیع الشان دینی درسگاہ مع عمارات متعلقہ تعمیر کرا رہے ہیں، ایک دن وہاں بھی جانا ہوا۔ مولانا ہی کے ایک مسترشد موٹر لے کر آئے اور لے گئے۔ بغیر آنکھوں دیکھے یقین کرنا مشکل تھا۔ کئی کئی مربع ایکڑ کا لق و دق میدان، مسجد اتنی بڑی اور اس شان کی کہ کوئی رئیس امیر تو کیا کوئی حکومت ہی اس کی ہمت کر سکتی ہے! اور درس گاہ، ہوسٹل (اقامت گاہ) وغیرہ کی عمارتیں سب اسی شان و شوکت کی اور اسی شاہانہ پیمانہ پر! مکمل ہو جانے پر ایک چیز دیکھنے کی ہو گی۔ لاکھ دو لاکھ نہیں ۲۰، ۲۵ لاکھ کے سرمایہ سے کم تو اندازہ کسی طرح نہیں ہوتا عقل دنگ و حیران کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام اس درویش گوشہ نشین نے آخر کر کیسے لیا!......

لاہور میں ایک مولانا ہی کی صحبت ایسی ملی جو حکومت پر اور اپنے ہی بھائیوں پر نکتہ چینی سے خالی تھی ورنہ اور جگہ تو عموماً یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہی اصل موضوع گفتگو ہے۔

تقسیم ملک سے جہاں بے شمار نقصانات ہوئے آخر کچھ فائدے بھی تو ہوئے ہیں انھیں میں سے اہل لاہور کے نفع کی چیز یہ ہے کہ انھیں گھر بیٹھے ایسی دولت مل گئی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی سے نیاز اب کی کوئی ۱۸، ۲۰ سال بعد حاصل ہوا، اور دیوبند اور تھانہ بھون کی صحبتیں یادیں تازہ ہو گئیں۔ اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا اور کیا اس کا انقلاب ہوا! پڑوسی پردیسی بن گئے جسم پر اثر جو کچھ بھی پڑا ہو، ماشاء اللہ ہمت اب بھی پوری طرح جوان ہے۔ کلوکیم کے جلسوں میں شرکت مستعدی و پابندی سے کرتے رہے بلکہ مباحثہ میں بھی حصہ خاصا لیتے رہے...... مولانا محمد داؤد غزنوی سے بھی نیاز قدیم کی تجدید ہوئی اور تحریک خلافت کے جلسوں اور کمیٹیوں کا سماں نظر کے سامنے پھر گیا۔ اہل حدیث میں مولانا کی ذات پہلے بھی ممتاز تھی اور اب تو شاید چوٹی کے لیڈر ہیں۔ صحت اب خراب ہو گئی ہے پھر بھی ہمت سے شریک ہوتے رہے اور اس نیاز مند سے گرمجوشی سے ملے...... مولانا محمد یوسف بنوری کی زیارت پہلی بار ہوئی۔ نام اور کام سے واقفیت مدت سے تھی ملاقات کی نوبت اب آئی...... ندوی برادری والوں میں مولوی قاضی نور الحق (صدر شعبۂ دینیات اسلامیہ کالج پشاور) سے ملاقاتیں بار بار رہیں۔ اور یہ دھوکا بھی بار بار ہوتا رہا کہ جیسے وہ پاکستان اور پشاور کے نہیں ہندوستان کے بلکہ اپنے لکھنؤ کے ہیں۔ کالوکیم کے حلقہ سے باہر مولوی فضل قدیر صاحب ندوی سے ملاقات گویا ایک بار ہوئی مگر ہر اعتبار سے اچھی۔ اُن کے سلجھے ہوئے دماغ، توازن و فہم سلیم اور ان کے اخلاص قلب کا تجربہ پہلے ہی کی طرح ابکی بھی رہا۔ چلتے پھرتے ملاقاتیں مولانا محمد ناظم ندوی صدر دار العلوم بہاولپور سے بھی رہیں۔ زیارت کئی سال بعد ہوئی اور یہ دیکھ کر جی خوش ہوا کہ قدیم ندویوں کی جھلک ان میں باقی ہے۔ ایک بڑے پرانے ندوی مولانا محمد طلحہ (سابق اُستاد اورنٹیل کالج لاہور) ہیں۔ ان سے بھی جلسہ گاہ کے باہر چلتے پھرتے نیاز حاصل ہو گیا۔ رہے مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی تو ان کا ساتھ کیا جلوت اور کیا خلوت کہنا چاہئے کہ شروع سے آخر تک رہا اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اب ان کا قلم پھر دینی خدمات کی طرف متوجہ ہوا ہے اور آج کل شاید صحیح مسلم کے کسی نئے ترجمہ میں مصروف ہے۔ وہ صاحب دل اس لحاظ سے بھی ہیں کہ "دل" نامی ایک ناول کے مصنف ہیں اور آج کل

بیچارے بیمار ہیں اور بیماری بھی اتفاق سے دل ہی کی جس کے لئے صاحب مثنوی فرما گئے ہیں ع

نیست بیماری چو بیماریٔ دل!

ان کا ذکر تو ایک مستقل عنوان چاہتا ہے۔ علماء کے ضمن میں تو خواہ مخواہ ہی آ گیا، جی میں آتا ہے ان کے لئے وہی دہرا دیجئے جو حضرت رومی نے مثنوی میں اپنے عزیز و محبوب شاگرد حسام الدین چلپی کے لئے کیا ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں بزرگی اور خردی کی نسبت مرتبۂ فضل و کمال کے اعتبار سے تھی اور یہاں محض سن و سال کی!...... علماء کا تذکرہ ناتمام رہ جائے گا اگر نام مولانا ظفر اقبال کا بھی نہ لیا جائے۔ وہ مذاکرہ کی انتظامی کمیٹی کے ممبر تھے۔ نظر ان پر بار بار پڑی تھی لیکن کوئی بتانے والا اتفاق سے نہ ملا۔ ملاقات ان سے صرف اس وقت ہوئی جب مذاکرہ والوں کی وداعی دعوت وزیر تعلیمات پاکستان مسٹر بی کے داس کی طرف سے ۸ر جنوری کو شب میں "فلیٹی" ہوٹل میں تھی۔ ملاقات بالکل سرسری رہی اور ان کی نورانیت سے استفادہ کی حسرت ہی رہ گئی۔ ان کے اوصاف و کمالات لکھنؤ میں مولانا علی میاں ندوی سے خاصے سننے میں آ چکے تھے۔ قرآن مجید کی صحت طبع میں اہتمام ان کا ایک کارنامہ ہے۔ کئی سال ہوئے انھوں نے انجمن حمایت اسلام کی طرف سے جو قرآن مجید بہت ہی خوشخط اور خوشنما اور بہت اچھے کاغذ پر چھپوایا تھا وہ غلطیوں سے تمام تر پاک تھا...... علماء کے ذکر میں اپنے لکھنؤ ہی کے ایک مشہور شیعی عالم بلکہ مجتہد مولوی سید علی نقی صاحب (اُستاد لکھنؤ یونیورسٹی) کا نام رہا ہی جاتا ہے۔ مذاکرہ کے دو ایک اجلاسوں میں یہ بھی شریک ہوئے اور مجھ سے قریب ہی بیٹھے رہے۔ گورنر کی طرف سے صوبہ حکومت کے لئے جو سرکاری تقریب منعقد ہوئی (اور جس میں ایک مذہبی اور اسلامی جمہوریت سے کہیں بڑھ کر شان ایک سیکولر یا نامذہبی مملکت کی تھی) وہاں بھی دیر تک نشست انھیں کے ساتھ رہی۔ علمائے شیعہ میں سب سے قریب تر اہل سنت سے شاید یہی ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کسی اور ذیل یا ضمن میں نہیں آتے بجائے خود ایک انجمن یا ادارہ ہیں۔ ان کے بعض مسائل سے چونکہ اختلاف ہے اس لئے ان کی جماعت کے رسالہ داروں (یاان کی فوج کے رسالہ داروں) نے مبالغہ و غلو سے کام لے کر مرد صدق کو ان کا شدید مخالف بلکہ معاند قرار دے لیا۔ ان کے دفتر جماعت اسلامی پر جا کر حاضری دی۔ اس وقت بھی وہ اپنے جلسے میں مصروف تھے۔ ملاقات کلوکیم کے اندر ہوئی اور پھر اندر اور باہر کئی کئی ملاقاتیں رہیں۔ ایک ناشتہ کے دستر خوان پر بھی دیر تک ساتھ رہا۔ ایک زمانہ میں ان سے تعلقات اچھے خاصے تھے۔ یہ صورت ان کی الجمعیۃ (ہفتہ وار) کی ایڈیٹری سے لے کر ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کے دارالاسلام پٹھان کوٹ میں منتقل ہونے تک باقی رہی۔ پھر جب سے وہ ایک پارٹی کے لیڈر یا امیر بن گئے ہم دونوں کے راستے بڑی حد تک الگ ہو گئے لیکن بحیثیت متکلم و اہل قلم دل میں اب بھی ان کی بڑی وقعت ہے۔ ان کے بعض اجتہادات کا ساتھ ان کے قدیم سے قدیم رفیق و مخلص بھی نہیں دے پائے اور ان سے الگ ہو جانے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں تو یہ ناچیز تو الگ ہے، باقی ان کا قلم اب بھی دین کی گراں بہا خدمات انجام دے رہا ہے بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ سے خالی ہو گا کہ تعلیم یافتہ گروہ کے بڑے حصہ کا ایمان سنبھالے ہوئے ہے، اور بحیثیت مجموعی ان کی تحریروں میں خیر کا عنصر شر کے عنصر پر کہیں غالب ہے...... کلوکیم میں جب وہ اپنا مقالہ اجتہاد پر پڑھنے کو آئے تو پہلی خوشی تو اس سے ہوئی کہ مقالہ انھوں نے بجائے کسی اور زبان کے اُردو ہی میں پڑھا۔ یہ ہمت سوا ان کے شاید ایک آدھ کوئی صاحب ہی کر سکے۔ دوسری مسرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ جب ان کا وقت ختم ہو گیا اور مقالہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا تو صدر کی گھنٹی بجانے پر انھوں نے معاً اس کی تعمیل کی اور مقالہ ناتمام چھوڑ کر اپنی جگہ پر واپس آگئے حالانکہ ان کے معتقدین کی ایک بڑی جماعت جو ان کا مقالہ سننے کو آئی تھی برابر پکارتی رہی کہ مقالہ ختم کر کے آئیے، ناتمام نہ چھوڑیئے۔

ایسے موقع پر معتقدین کے اس پرجوش مطالبہ کی پروا نہ کرنا اور جلسہ کے نظم و

انضباط کو مقدم رکھنا (خصوصاً جبکہ جلسہ ہی میں دوسری مثالیں اس کے برعکس موجود تھیں) بڑے حوصلہ اور بڑے ظرف کا کام ہے۔ الحمدللہ کہ مودودی صاحب شرافت کے اس امتحان میں پورے اترے۔

مولانا مودودی کے ذکر کے ساتھ معاً عزیزی امین احسن اصلاحی کا نام خیال میں آجانا قدرتی سا ہے۔ نام کے ساتھ بجائے مولانا کے عزیزی سہواً نہیں عمداً ہے۔ ایک تو وہ اصلاحی اور مدرسۃ الاصلاح (ضلع اعظم گڑھ) اس وقت تک گویا ندوہ ہی کی ایک شاخ تھا۔ اور پھر شاگرد اور زیر تربیت رہے مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم (سابق شریک ایڈیٹر سچ مرحوم) کے جس سے اپنے تعلقات برادرانہ تھے۔ خود اصلاحی سلمہ، سے جب تک یہ لکھنؤ میں رہے براہ راست تعلقات بالکل عزیزانہ رہے اور آج وہ چاہے جتنے بڑے بن گئے ہوں میری نظر میں تو ابھی ویسے ہی چھوٹے ہیں۔ ان کا مقالہ عربی میں سنا، ملاقاتیں بار بار رہیں لیکن ہر بار سرسری و ناتمام ہی رہیں۔ ایک دن صبح ناشتہ پر انھوں نے مدعو کیا۔ مولانا مودودی، مولانا شفیع دیوبندی اور کئی صاحب بھی تھے۔ خیال یہ تھا کہ دستر خوان سادگی کا سبق دے گا اور ناشتہ دعوت شیراز کا نمونہ ہو گا۔ جا کر دیکھا تو کھانے کی چیزوں کی وہ کثرت اور وہ رنگارنگی کہ مولوی کے دستر خوان پر دھوکا بار بار کسی آنریبل منسٹر کی میز کا ہوتا تھا!...... تجربہ سے معلوم ہوا کہ جہاں تک کہ زبان کے ذائقہ اور چٹخارے کا تعلق ہے اُمت کے سارے طبقے کیا درویش باصفا اور کیا رئیس ذی جاہ کچھ ایک ہی سے ہیں!

جماعت اسلامی ہی کے ایک اور اہم معزز رکن حکیم محمد اشرف صاحب ایڈیٹر المنبر اپنی محبت سے ملنے ہوٹل میں آئے اور اپنے پرچہ ہی کی طرح خود بھی گفتگو میں شستہ و نستعلیق اور سلجھے ہوئے دماغ کے نظر آئے۔

یہ بات نہیں کہ اپنی ملاقاتیں عالموں اور دینداروں تک محدود رہیں یا یہ کہ کلوکیم میں مجمع صرف ایسے ہی حضرات کا تھا۔ جی نہیں روشن خیالی اور تعلیم جدید کی

نمائندگی کثرت سے تھی، بلکہ کہنا چاہئے کہ اکثریت اسی طبقہ کی تھی اور یوں بھی ملنے ملانے میں تعداد ان حضرات کی اچھی خاصی رہی۔ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب کی نشست مقابل جانب فاصلے پر تھی اور پہلے کبھی کا تعارف نہ تھا۔ ازراہ کرم و مسافرنوازی خود ہی بڑھ کر تشریف لائے۔ اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا۔ بحیثیت مجموعی بہت غنیمت تھا، بلکہ بعض پہلوؤں سے قابل داد بھی۔ اب اخبارات میں پڑھا کہ ترقی پا کر سپریم کورٹ کے جج ہو گئے ہیں...... انھیں کے متصل نشست سپریم کورٹ کے جج جسٹس محمد شریف کی تھی وہ اخلاق و کرم میں ان سے بھی سوا نکلے۔ اس اجنبی محض سے بڑھ کر نہ صرف ملے بلکہ چونکہ "نوائے وقت" کے واسطہ سے "صدق" ان کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا اس لئے دس بیس مخصوص ڈیلی گیٹوں کے ساتھ ایک دن لنچ پر مدعو بھی کر دیا۔ پاکستان لاکمیشن کے صدر ہیں اور اخبارات میں پڑھا کہ سپریم کورٹ سے ابھی ابھی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ لنچ خوب تھا، اس لحاظ سے کہ کھانے جتنے بھی تھے سب اپنے مشرقی اسلامی قسم ہی کے تھے اور ان کو امریکی اور برطانوی نمائندوں نے بڑے ذوق و شوق سے تناول فرمایا۔ خصوصاً مرغ بریانی کو۔ گو ساتھ ہی افسوسناک پہلو یہ تھا کھانا کھلانے کا طریقہ تمام تر فرنگی اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی بجائے بیٹھ کے کھڑے کھڑے کھانے کا!...... "صاحب" نے پہلے تو تہذیب کا سبق یہ دیا تھا کہ پیشاب کھڑے کھڑے کیا جائے اور اب جنگ کے بعد سے جدید تحفہ یہ کھڑے کھڑے کھانے کا دیا ہے!......

مشہور مستشرق پروفیسر ہٹی (HITTI) سے ملاقات اور گفتگو یہیں رہی۔ کھانے کے بعد ہم لوگوں کی طرح وہ بھی طشت میں ہاتھ دھو رہے تھے۔ یہ مشرقی اور "اسلامی" منظر دیکھ کر نہ رہا گیا اور معمول و عادت کے خلاف بات چیت کی ابتدا اسی طرف سے کر دی گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کا حال کرید کرید کر پوچھتے رہے خصوصاً عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم کا۔ لکھنؤ، حیدرآباد، کلکتہ ان تین بڑے مرکزوں کے نام خود ہی لئے۔ اپنی نئی کتابوں تاریخ شام و تاریخ لبنان کا بھی تذکرہ کرتے رہے۔ یہیں تعارف سپریم کورٹ کے دوسرے جج جسٹس شہاب الدین مدراسی ثم پاکستانی سے بھی ہوا۔ مولوی محی الدین قصوری

سے بھی ملاقات سالہا سال کے بعد ہوئی، ان کے والد ماجد مرحوم مولوی عبدالقادر قصوری مرحوم تو کیا کہنا، ایک بزرگ آدمی تھے۔ ان کے بھائی مولوی محمد علی قصوری ایم اے (کیمبرج) بھی بڑے پرجوش اور باہوش مبلغ دین گزرے ہیں۔ غرض ایں خانہ ہمہ آفتاب است...... مہمانوں میں اعزاز و اکرام کے ساتھ اور بجا طور پر ہاتھوں ہاتھ عزام پاشا مصری لئے جا رہے تھے۔ تعارف ہوا۔ بات چیت شروع ہوئی پہلے انگریزی میں اور جب دیکھا کہ موصوف اردو بول رہے ہیں تو پھر اردو میں رہی۔ اقبال کی بعض اردو نظموں کا ترجمہ عربی میں کر رہے ہیں۔ ان کی شخصیت خاصی دلکش اور متوازن معلوم ہوئی یعنی نہ انگریزی علوم و فنون کے نام سے چڑ، اور نہ ان سے بیجا مرعوبیت۔ بعد میں بھی ان سے دو چار ملاقاتیں رہیں۔ ہر دفعہ جی خوش ہی رہا۔

روشن خیالوں کے ایک خاص حصہ کے سرخیل خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم ہیں۔ ان سے شناسائی حیدرآباد کے زمانہ سے ہے۔ آدمی مہذب و شائستہ ہیں۔ ابکی بھی ملاقات رہی اور اپنی طرف سے وضعداری انھوں نے نباہی۔ وحدت ادیان کے قائل ہیں اور نجات کے لئے شاید صرف عقیدۂ توحید اور اعتقادِ آخرت (بہ حذف عقیدۂ رسالت) کافی سمجھتے ہیں، چنانچہ جو مقالہ پڑھا اس میں بھی یہ رنگ جھلک رہا تھا...... جدید تعلیم یافتہ گروہ کی نمائندگی مذاکرہ میں کچھ کم نہ تھی اور کم ہونے کی وجہ بھی کیا تھی۔ کراچی، سندھ، پنجاب، ڈھاکہ، راجشاہی متعدد یونیورسٹیاں تو خود پاکستان ہی میں ہیں اور باہر کی یونیورسٹیاں ان کے علاوہ۔ کثرت سے ان یونیورسٹیوں کے دکاترہ اور غیر دکاترہ استادوں سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی (سابق مسلم یونیورسٹی والے) سے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور سندھ کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر داؤد پوتا اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی دہلوی ثم کراچوی (سابق وزیر مرکز) تو اسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ ان سے ملنا روزانہ اور کئی کئی بار ہوتا رہا۔ کراچی یونیورسٹی کے اُستاد تاریخ ڈاکٹر محمود حسین خاں سے جو ہمارے ہندوستان کے ڈاکٹر

ذاکر حسین خاں کے بھائی رشتہ ہی کے لحاظ سے نہیں صورت و سیرت کے اعتبار سے بھی ہیں، سے خوشگوار ملاقاتیں کئی بار ہوئیں اور یونیورسٹی کی طرف سے جو شاندار ڈنر شب کو ہوا، اور اس میں سابقہ پھر اسی تکلیف دہ کھانے سے پڑا، اس میں انھوں نے اسی طرح خدمت انجام دی اور کھانے کی پلیٹیں اس طرح بار بار میرے لئے لائے کہ جیسے میں ان کا کوئی بزرگ ہوں اور وہ میرے خرد ہیں۔ ان کے تقریباً ہم نام ڈاکٹر محمود حسن خاں صوبہ پبلک سروسز کمیشن مشرقی پاکستان سے بھی ملنا بار بار ہوا، دوسروں سے ان کی مذہبی بحثیں سنتا رہا۔ ڈھاکہ کے استاد عربی ڈاکٹر صغیر حسین المعصومی اور راجشاہی کے ڈاکٹر شہید اللہ سے بھی اکثر مذاکرے رہے۔ یہ ڈاکٹر شہید اللہ اُستاد بنگلہ و سنسکرت کے ہیں لیکن بڑے حقشف مسلمان صورت اور لمبی داڑھی ہی کے لحاظ سے نہیں، عقائد کے لحاظ سے بھی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی کے استاد تاریخ مظہر الدین صدیقی اور راجشاہی کے استاد فلسفہ ڈاکٹر جمیل سے بھی گفتگوئیں رہیں۔ اقبال اکیڈمی کراچی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رفیع الدین اپنی ڈگریوں کے باوجود دین میں بڑے راسخ ہی نہیں بلکہ بلا مبالغہ ایک نئے قسم کے علم کلام کے ماہر ہیں جو سائنس اور فلسفہ کی لائی ہوئی نئی سے نئی گمراہیوں کا مقابلہ پوری قوت سے کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین اُستاد فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی سے مدت دراز کی تحریری نیاز مندی کے بعد ملاقات پہلی بار یہیں ہوئی۔ یہ بھی اسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ ان کی گہری مذہبیت اور ان کے تصوف و سلوک سے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ کاش ان کا ظاہر بھی ان کے باطن ہی کی طرح انوار ایمان کا آئینہ دار ہو جائے...... کلوکیم کے باہر یہاں کے استاد فلسفہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (علیگ) سے سرسری ملاقاتیں رہیں، وہ بھی اپنی دینی صلابت و حرارت میں کسی سے نمبر دوم پر نہیں۔ کلوکیم کے اندر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پرنسپل اورینٹل کالج سے گو افسوس ہے کہ ملاقات نہ ہو سکی، پھر بھی ان کی اسلامیت پر ان کے مقالے اور ان کی کتابیں گواہ ہیں۔ سیلون یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد یوسف (صدر شعبۂ عربی) سے ملاقاتیں رہیں۔ پرانے علیگڑھی اور اپنے یوپی ہی کے آدمی نکلے۔ ایک پرجوش مسلمان ظفر احمد صاحب انصاری

الہ آبادی ثم پاکستانی ملے۔ ایل ایل بی اور فلسفہ میں ایم اے مگر صورۃً بالکل مولوی اور جوش و تصلب میں تو بہت سے مولویوں سے بڑھے ہوئے، پاکستان کے دستور و آئین کی اسلامیت کے لئے بڑا زور لگانے والے۔

جدید طبقہ سے ہمارے پرانے علماء کی یکسر بیزاری اور بدگمانی بجا نہیں، اسی گروہ میں بعض ایسے پختہ دین دار بھی نکل آتے ہیں جن کے رسوخ فی الدین اور صلابت پر رشک آتا ہے اور بعض جو بظاہر بہکے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے ہاں بھی ضد اور تعصب سے زیادہ دخل ناواقفیت اور بے عملی کو ہے۔ ایک صاحب کو انھیں میں سے عین اس وقت جبکہ ان کے حریف مقابل بے دین اور دین سے خارج قرار دے رہے تھے، اپنے کانوں سے کہتے سنا کہ "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اللہ اور رسول ﷺ کا نام آجائے تو میں اپنی جان تک دینے کو حاضر ہوں لیکن آپ لوگوں نے جو یہ مسئلے گڑھ رکھے ہیں یہ میری سمجھ سے باہر ہیں"۔ ضرورت ایسے تمام افراد سے میل جول بڑھانے، مل جل کر ان کے دل ٹٹولنے اور طویل صحبتوں سے رفتہ رفتہ ان کے ایک ایک شک و شبہ کو دور کرنے کی ہے نہ کہ ان کے ساتھ برتاؤ خشونت کا کیا جائے اور انھیں یکسر ملحدوں اور زندیقوں ہی کے درجہ میں رکھا جائے۔ اس طریقہ نے بہت سے قابل قدر مخلصوں کو بیگانہ بنا ڈالا ہے۔ مابہ الاشتراک پر نظر مابہ الاختلاف سے کہیں زیادہ رہنی چاہئے۔

جلسہ ہی میں ایک دن "روشن خیالوں" کے امام پرویز صاحب (طلوع اسلام والے) نظر پڑے، ایک صاحب سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہی ہیں۔ ان کی شکل پہلی بار دیکھنے میں آئی۔ لیکن ان کا نام اور ان کی تحریریں میرے لئے نئی ذرا بھی نہیں۔ مدت ہوئی جب یہ حکومت ہند کے سیکرٹریٹ میں دہلی میں تھے اور "صدق" کا نقش اوّل "سچ" نکل رہا تھا، تو یہ اس کے خاص ہمدردوں اور عملی معاونوں میں تھے۔ نگار کی ملحدانہ تحریروں اور اس وقت کے مشہور منکر حدیث ڈپٹی مقبول احمد ("حق گو") کے خلاف جب سچ کو مستقل مہم چلانا پڑی تھی تو پرویز صاحب اس مہم کے صف اوّل میں

تھے۔ ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۳ء میں ان کے مضمون کثرت سے بیچ میں نکل چکے ہیں۔ معارف وغیرہ سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی مخلصانہ تھے یہ اچھے پرجوش مجاہد تھے۔ یہ حال ایک دو دن نہیں برسوں رہا اور ان کے محبت بھرے اور کار آمد خطوط شاید سینکڑوں کی تعداد میں میرے پاس جمع ہو گئے تھے...... انسان کو بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ میں بیان فطرت بشری کا ہے۔ نفس ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور شیطانی ترغیبات نے بڑے بڑوں کو خراب کر کے رکھا ہے۔ واللہ اعلم بگاڑ کہاں سے پیدا ہوا اور اس کے اثر سے پرویز صاحب بجائے ایک مخلص و سرگرم کارکن کے اپنے کو ایک فاضل محقق خیال کر بیٹھے اور اس کے بعد معاف فرمایا جائے کام ہمارے مولوی صاحبان نے ضد دلا دلا کر اور ذاتی حملے کر کر کے خراب کیا۔

بہر حال پرویز صاحب سے ملاقات رہی اور وہ بڑی اچھی طرح ملے جس طرح ایک بھلے آدمی کو ملنا چاہئے، ان کا مقالہ انگریزی تفسیری غلطیوں سے پر تھا۔ شدید نزلہ کے باعث میں تو سہ پہر کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا، البتہ ایک تنقیدی پرچہ لکھ کر سیکرٹری صاحب مذاکرہ کو دے آیا تھا کہ اسے پڑھ کر سنا دیا جائے...... میں طلوع اسلام کے مطالعہ سے محروم رہتا ہوں ان کی اور کتابیں معارف القرآن وغیرہ بھی دیکھنے کا اتفاق برائے نام ہی ہوا البتہ اس کا اندازہ ہوا کہ پرویز صاحب صدق کو اپنے مطالعہ سے مشرف فرماتے رہتے ہیں۔ اس کا بھی اندازہ ہوا کہ پاکستان کے ایک اونچے طبقہ میں ان کا اثر اچھا خاصا ہے اور بعض "بڑے لوگ" انھیں ایک امام یا مجتہد کے درجہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کے بعد ہم لوگوں کو ضرورت اور زیادہ محتاط رہنے کی ہے۔ یعنی ان کے عقائد پر گرفتیں تو خوب کی جائیں اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی پردہ دری میں مروت سے اور چشم پوشی سے کام ذرا بھی نہ لیا جائے، لیکن ان کی ذات کو معرض بحث اور ان کی شخصیت کو ہدف تمسخر و تضحیک بنائے رکھنا ہرگز کوئی دینی خدمت نہیں۔

حجازی اور عراقی، مصری اور شامی ہی فاضلوں کے اتنے بڑے مجمع کے دیکھنے چہ جائیکہ اس میں شامل ہونے کی توقع زندگی بھر کبھی کیوں ہو سکتی تھی چہ جائیکہ فرنگی فاضلوں اور مستشرقین کے مجمع میں! ایک تو یہی یقین تھا کہ ایسا اجتماع جب کبھی بھی ہو گا یورپ یا امریکہ ہی میں ہو گا اور پھر یہ کہ جب اور جہاں کہیں بھی ہو اس میں اس گمنام گوشہ نشین کی شرکت کا بھلا کون سا محل ہو گا!...... قدرت نے اچانک اور بے شان و گمان دونوں مفروضے جھٹلا دیئے۔ جلسہ یورپ اور امریکہ کے کسی دور دراز ملک میں نہیں۔ پڑوس ہی کے ملک پاکستان میں ہوا۔ اور وہاں بھی پشاور یا کوئٹہ یا کراچی میں نہیں بلکہ یوں کہئے کہ عین ہندوستان ہی کی سرحد پر اور پھر جلسہ کے داعیوں نے انتخاب میں اہلیت پر حسن ظن کو مقدم رکھا اور اس طرح جرمنی اور فرانس، ہالینڈ اور روس، برطانیہ اور امریکہ کے فاضلوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے اور قریب سے ان کا مطالعہ کرنے کا موقع (وہ سطحی اور سرسری ہی) اس نااہل کو بھی میسر آ گیا!...... یہ لوگ کوئی ۲۰،۲۵ تعداد میں ہوں گے۔ دو خاتون باقی مرد، ان میں سے مقالے بھی ۱۴، ۱۵ نے پڑھے۔ ان میں سے بعض تو اسلام کے سیاسی پہلوؤں پر تھے مثلاً "اسلام میں ریاست کا تصور"۔ بعض معاشی پہلوؤں پر مثلاً "محنت اور مزدوری اسلامی شریعت کی روشنی میں" بعض کلامی پہلوؤں پر مثلاً "اسلام کا رویہ دوسرے ادیان و مذاہب سے متعلق" اور بعض فقہی پہلوؤں پر مثلاً "اجتہاد کی گنجائش اسلام میں" اور ایک آدھ مقالہ اسلامی "آرٹ" یعنی تعمیرات وغیرہ پر بھی تھا...... مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ ہمدردی ان سب مقالوں میں مشترک تھی۔ بعض میں نمایاں۔ اس ہمدردی کی بنیاد وقعت اور احترام پر تھی۔ مخالفانہ تنقید، تحقیر اور بے وقعتی اور اپنی سیاسی، عقلی و علمی بالا دستی کا احساس و اظہار گویا نہ تھا۔ یہ بات آج سے ۳۰، ۳۵ سال ادھر ممکن نہ تھی۔ اس خوش آئند صورت حال کے اور اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں ایک سبب بہر حال یہ بھی تھا کہ عالم اسلامی کے جو نمائندے آئے تھے وہ کمزور اور سست، پست ہمت و درماندہ، احساس کمتری کے مریض نہ تھے۔ علی العموم خوب پڑھے لکھے اور اپنی اسلامیت پر رسوخ کے ساتھ مغربی طرز

فکر و نظر میں بھی خوب برق تھے۔ بلکہ ایک اسلامی ملک کے نمائندہ نے تو صاف صاف اپنی تقریر میں ان حضرات کو مخاطب کر کے کہہ بھی دیا تھا کہ "اب ہم آپ لوگوں کے قدم قدم پر محتاج و دست نگر نہیں رہے ہیں۔ آپ ہی کی درسگاہوں میں پڑھ پڑھ کر اور آپ ہی کی شاگردی اختیار کر کر کے سیاسی آزادیوں کے ساتھ ساتھ ہم میں علمی اور ذہنی خودداری بھی آگئی ہے اور اب ہم آپ کے پس رووں میں نہیں، ساتھ کے چلنے والوں میں ہیں"۔

جس طرح اسلامی ملکوں کے نمائندوں میں شاید ممتاز ترین شخصیت مصر کے عبدالوہاب عزام پاشا کی تھی، مستشرقین کی صف میں سب سے نمایاں پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے لبنانی الاصل استاد فلپ، کے ہٹی کو حاصل تھی۔ معمر آدمی ہیں اور سن ہی کے اعتبار سے بہتوں سے سینئر نہیں بلکہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بھی ایک امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی ضخیم کتاب "ہسٹری آف دی عربس" بھی اور ان کی تازہ ترین ہسٹری آف سیریا (تاریخ شام) اور ہسٹری آف لبنان (تاریخ لبنان) ہیں۔ یہ آخری کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ جب پروفیسر موصوف سے جسٹس شریف کے ہاں لنچ پر ملاقات ہوئی تو خود ہی اس کتاب کا ذکر فرماتے رہے...... بعض معاشرتی ادائیں بھی مسلمانوں سے لے لی ہیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ لنچ کے بعد مسلمانوں ہی کی طرح ہاتھ دھورہے تھے ورنہ عام فرنگی تہذیب میں کھانے کے بعد کلی کرنا اور ہاتھ دھونا کہاں۔ میں نے اس چیز پر بڑھ کر انھیں مبارکباد بھی دی جسے ہنس کر انھوں نے قبول فرمایا...... یوں ان کی عام روش اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ خاصی ہمدردانہ ہے، لیکن اسے کیا کریں کہ بہر حال فرنگی ہیں کھل کر اعتراض تو کرتے نہیں لیکن بین السطور میں اکابر اسلام (اجل صحابہؓ و خلفائے راشدینؓ) کے سلسلہ میں کوئی بات ایسی کہہ ہی جاتے ہیں جس سے پڑھنے والے کا دل ان کی طرف سے ہٹ کر رہ جائے۔ تاریخ عرب میں تو اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ تاریخ شام میں زیادہ۔

مذاکرہ کے آخری روز ایک چھوٹی سی مجلس مشاورت وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے ہاں الگ منعقد ہوئی جس میں ہر وفد کے صرف صدر شامل تھے اور اس میں یہ طے پایا کہ مذاکرہ کے اسی ادارہ کو مستقل کر دیا جائے اور اس کے اجلاس وقتاً فوقتاً کسی اسلامی ملک کی دعوت پر وہاں ہوتے رہیں۔ اس موقع پر ہٹی صاحب نے ایک بڑی سمجھ اور معقولیت کی بات کہی جس سے دل میں ان کی قدر و وقعت زیادہ پیدا ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ دیکھئے ان جلسوں میں دینی مذہبی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں تو اس ادارہ کے دو حصے کر دیجئے ایک میں صرف تاریخی، علمی، تمدنی عنوانات پر گفتگو ہو ان میں ہم کو ضرور شامل رکھئے، ہم لوگ اسی میں بہ مسرت شریک ہوں گے۔ باقی دوسرا حصہ جس میں آزادی سے آپ دینی، مذہبی اور اعتقادی مسئلوں پر گفتگو کرنا چاہیں ہم لوگوں کو اس سے الگ ہی رکھئے...... "ڈسپلن" کے وسیع مفہوم میں نظم انقیاد، اطاعت تہذیب، خوش کلامی کے سارے پہلو آ گئے۔ یہ مغربی نمائندے مجسم "ڈسپلن" تھے اور اس کی ایک جھلک اس معقول مشورہ کے اندر بھی موجود ہے۔

معمر اور سینئر ہونے کے لحاظ سے فرانس کے ڈاکٹر لوئی مسینان (MASSIGNAN) شاید ہٹی سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ حسین بن منصور حلاج کی کتاب الطواسین انھیں نے بڑی محنت سے مرتب و مہذب کر کے شائع کی ہے اور ایک عمر سے فرنچ میں اسلامیات سے متعلق موقت رسالے شائع کر رہے ہیں۔ سن کا اثر چہرہ اور جسم پر نمایاں ہے اور ثقل سماعت کے باعث اپنے کان میں آلہ بھی لگائے رہتے ہیں۔ ان کی نشست کا نمبر میرے نمبر سے قریب ہی تھا لیکن بات چیت کا موقع نہ نکل سکا۔ ان کا مقالہ "اسلام میں کاسبوں یا پیشہ وروں کے حقوق" یا ایسے ہی کسی موضوع پر تھا...... اچھے مقالوں میں ایک مقالہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون مس لیمبٹن (LIMBTAN) کا تھا۔ لندن یونیورسٹی میں فارسی کی اُستاد (یا استانی) ہیں۔ موضوع یہ تھا میرا امام جب بجائے عدل و اقامت دین و شریعت کے، راستہ فسق و ظلم کا اختیار کرے تو اس کا علاج اسلام نے کیا

بتایا ہے؟ عزل امام یا اس سے بغاوت؟ یا کیا؟ موضوع دلچسپ تھا اور مقالہ ہمدردی اور علم و نظر کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ ان کی نشست مجھ سے فاصلہ پر تھی اور میں کہ مردوں ہی سے ملنے ملانے اور تعارف حاصل کرنے میں بدہمت واقع ہوا ہوں، ایک خاتون سے ملاقات کی ہمت کہاں سے لاتا۔ جسٹس شریف کے ہاں لنچ پر یہ بھی تھیں، اور پلاؤ کی داد دیتے ہوئے اس کے لئے ...... A PERFECT DISH کا فقرہ انھیں کی زبان سے ادا ہوا تھا...... نشست میں مجھ سے قریب ترین ہالینڈ کے ڈاکٹر (DURRAS) یہ لائیڈن یونیورسٹی میں اسلامیات کے معلم ہیں اور کرامات شیخ جیلانی" وغیرہ پر کچھ چیزیں شائع کر چکے ہیں۔ ان کے مقالہ کا موضوع کچھ اس قسم کا تھا "اسلامی قدروں اور جدید معاشرتی نظریوں میں تصادم" ان سے یکجائی کئی دن تک کئی کئی گھنٹے رہی۔ مہر خاموشی آخر پہلے انھوں نے ہی توڑی اور معمولی بات چیت ہونے لگی۔ انھیں نے پوچھا کہ آپ ہندوستان کے کس حصہ سے آئے ہیں؟ اور جواب میں جب لکھنؤ کا نام سنا تو پھر پوچھا کہ آپ کی مادری زبان کیا ہے؟ اس پر میں نے کہا "اُردو" تو بڑی حیرت سے اس لفظ کو دہرایا اور پھر کہا کہ "اب بھی اردو"! ہندوستان کے اخبار نویسوں نے ہندی کا پروپیگنڈہ ہی اس غضب کا کیا ہے۔ اور جواہر لال اور مولانا ابوالکلام تک کی تقریروں کو بجائے ہندوستانی یا اردو کے جب ہندی کا نام دے دیا ہے تو باہر والے بیچارے قدرۃً یہی سمجھنے لگے ہیں کہ اُردو تمام تر ختم ہو چکی ہے اور اب ہندی ہی ہندی باقی رہ گئی ہے!...... ایک اور قابل ذکر اور معروف ہستی کینیڈا کی میک گل یونیورسٹی کے ادارہ اسلامیات کے ڈائریکٹر ولفرڈ اسمتھ کی ہے۔ اسلام اور ہندی اسلام پر کتابیں لکھ چکے ہیں جن کے بعض حصے اچھے خاصے اور کھلے ہوئے تکلیف دہ ہیں اور شاید آپ ہی کا مبارک قلم اقبال" کو "معاشیات سے جاہل" ہونے کا سرٹیفکیٹ دے چکا ہے۔ ایک صاحب نے رات کے یونیورسٹی ڈنر میں ان سے تعارف کرا دیا دل ان سے کچھ کھلا نہیں۔ اس لئے بات چیت بھی کچھ یوں ہی سی رہی۔ ان کا مقالہ اسلام میں قانون اور اجتہاد پر تھا۔ خود تو اس کے سننے کا اتفاق نہ ہوا مگر دوسروں سے اس کی شکایت ہی سننے

میں آئی...... جرمنی کے پروفیسر اسپولر SPULAR کا مقالہ سیرۃ نبوی ﷺ کے بعض پہلوؤں سے متعلق بڑا دلچسپ اور پُر بصیرت رہا۔

ان مغربی مہمانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ و جاذب توجہ شخصیت اٹلی کے پروفیسر الیگزینڈر بوسانی BAUSANI کی نظر آئی۔ روم کی یونیورسٹی میں فارسی کے اُستاد ہیں اور اقبال کے جاوید نامہ وغیرہ کے اطالوی زبان میں مترجم۔ مقالہ "اسلامی شاعری" پر تھا اور اس سے پتا چلا کہ فارسی کے علاوہ اردو شاعری پر بھی ان کی نظر اچھی خاصی ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ وغیرہ کا تذکرہ بھی اس میں تھا اور تبصرہ بھی۔ دلی خوشی ہوئی کہ اب ہماری اردو بھی اس قابل سمجھی جانے لگی کہ فضلائے فرنگ اس پر توجہ کریں۔ مقالہ کے بعد باہر ان کے گرد ایک مجمع لگ گیا۔ لوگوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا اور ان کے تبصرے پر الٹے سیدھے سب ہی طرح کے تبصرے ہو گئے! چہرہ پر داڑھی مسلمانوں سے مشابہت پیدا کرنے والی "صاحب" کی وہ شان وہ آن بان وہ دھاک جو کچھ روز قبل تک ہر گورے چمڑے والے کا ایک پیدائشی حق سمجھی جاتی ہے، اس کا کہیں آس پاس پتا نشان نہیں۔ ہر شخص سے بے تکلف جس نے جہاں چاہا، گھیر کر باتیں شروع کر دیں!...... خدا بھلا کرے لاہور کے منچلے اور شیوا طراز ناشر طفیل صاحب ایڈیٹر "نقوش" کا کہ انھوں نے ایک شام کو اپنے ہاں کھانے پر انھیں مدعو کر دیا اور دعوت میں خالص مشرقیت کا التزام رکھا۔ کھانے سب اپنے ہی طریقے کے پنجابی، پاکستانی کہئے یا ہندوستانی اسلامی اور اس سے کہیں بڑھ کر نشست بجائے میز کرسی کے فرش پر! "کھڑے کھانے" کے اس تکلیف دہ دور میں نشست ہی کا انتظام بجائے خود قابل داد تھا، چہ جائیکہ نشست بھی چاندنی اور قالین بھی! خدا جانے کیا چوک ہو گئی ورنہ اگر کہیں ساتھ میں مشاعرہ اور قوالی کا بھی انتظام کر دیا جاتا تو معزز مہمان کو مشرقیت اور مشرقی زندگی و ماحول کا لطف پورا ہی آجاتا اور قال حال سے بدل کر رہتا!

یہ دلچسپ و پر لطف صحبت خاصی دیر تک قائم رہی، گفتگو بوسانی صاحب سے

انگریزی سے زیادہ اُردو ہی میں رہی اور جب مجلس برخاست ہوئی تو دل میزبان اور مہمان دونوں کی شکر گزاری کے جذبات سے لبریز تھا۔

پرانے قسم کے عالموں، فاضلوں اور نئی طرز کے ڈاکٹروں اور مستشرقین کے علاوہ یوں بھی عام اہل قلم کی برادری لاہور میں اچھی خاصی بڑی ہے اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سب کلوکیم میں شامل ہوں الگ فرداً فرداً بھی ان میں سے سب ملنے کے قابل تھے۔ ان میں سے ایک کی زیارت تو کلوکلیم ہی کے سلسلہ میں ہوگئی اس کے ڈائریکٹر بھی تھے...... ڈاکٹر محمد شفیع چہرہ کی قطع اور مونچھوں کی وضع اقبال سے ملتی ہوئی۔ مغربی طرز کے عالم مشرقیات، لاہور میں اب سب سے بڑے شاید یہی ہیں۔ ان کے علم کا شہرہ عرصہ سے سننے میں آرہا تھا۔ ملاقاتیں ہوئیں مگر قدرۃً بہت ہی سرسری، تشنگی باقی رہ گئی...... لاہور کے ایک بڑے زبردست صاحب قلم بلکہ لکھاڑ سارے لاہوری لکھنے والوں کی ناک مشہور ناول نگار ایم اسلم صاحب ہیں، صدق و مدیر صدق کے پرانے مخلص و کرم فرما۔ ان کی اسلام دوستی اور اسلامیت یقیناً کسی بیان و تصریح کی محتاج نہیں، بار بار ملنے آئے اور دعوت حسب معمول خوب دھوم دھام سے کی۔ اس دعوت میں ملاقات مسلم لیگ کے نامور لیڈر میاں امیر الدین سے رہی اور ایک حکیم صاحب (نام غالباً حسن عسکری صاحب تھا) سے بھی جنھوں نے مجھے نزلہ میں مبتلا دیکھا کئی کئی دوائیں اپنے پاس سے عنایت کیں۔ اسلامیت میں اسلم صاحب کے پبلشر فروغی صاحب بھی ان سے کچھ کم نہیں بلکہ ناشرین کے طبقہ میں ایسی فکر اسلامی رکھنے والے تو میرے تجربہ میں یہی ایک آئے۔ گفتگو بڑی سنجیدہ و مرتب کرتے ہیں۔ ذاتی حملوں کے حشویات و لغویات سے پاک! اور یہ صفت آج اپنے عنقا ہونے کی بنا پر معمولی نہیں (بہت بڑی صفت ہے) انھوں نے بھی خود اپنے ہاں ناشتہ پر مدعو کیا، اور اس نام کے ناشتے نے بہت سے "کھانوں" کو مات کر دیا۔ غرض مصنف اور ان کے ناشر دونوں کی صحبتیں ہر طرح خوشگوار رہیں...... شہر کے ایک دوسرے نامور ناشر محمد طفیل صاحب

(صاحب نقوش) ناموری ایک دوسرے رنگ کی اور دوسرے طبقہ میں "نقوش" کے رنگا رنگ اور حیرت انگیز حد تک ضخیم نمبروں کی بنا پر حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ملاقات پہلی بار ایک ہوئی۔ پہلے افتتاح مذاکرہ کے دن ایٹ ہوم میں اور پھر خود انھیں کے ہاں شب کی دعوت میں، آدمی کم گو، خاموش اور شرمیلے نظر آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوخی و طراری سب قلم تک محدود ہے۔ دعوت انھوں نے اطالین مستشرق اردو و فارسی کے ماہر پروفیسر بوسانی (BAUSANI) کی کی تھی اور خالص مشرقی انداز سے فرش پر بٹھا کر خوب کھلایا اور اس طرح ہم لوگوں کو بھی بوسینی صاحب کی صحبت و گفتگو سے فیض یاب ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔ بحیثیت میزبان بھی خوب نکلے۔ مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

پرانے اور بہت پرانے و بے تکلف ملنے والوں میں مولوی سید ہاشمی فرید آبادی (علیگ) ہیں۔ ایک عمر بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ حیدر آباد دکن میں گزاری، پھر کراچوی ہوئے۔ اور اب تو مدت سے لاہوری ہیں۔ اردو کے بڑے اچھے لکھنے والوں میں ہیں۔ دہلی کی زبان ہی نہیں لکھتے اس کی نوک پلک تک کا لحاظ رکھتے ہیں۔ عمر بھر ساری لکھنے لکھانے ہی میں بسر کر دی۔ پر اس قسمت کا کیا علاج کہ ناموری وہ نہ حاصل ہوئی جس کے یہ ہر طرح مستحق تھے۔ آج کل ضخیم تاریخِ لاہور مرتب کر رہے ہیں اور عموماً تاریخ ہی کے موضوع کو شروع سے اپنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ عثمانیہ یونیورسٹی کے سر رشتہ تالیف و ترجمہ میں جو منسلک رہے تو تاریخ ہی کے شعبہ میں لیکن اسے کیا کیجیے کہ فطرت نے ان میں صلاحیتیں مورخ و واقعہ نگار سے کہیں بڑھ کر ادیب وانشا پرداز کی ودیعت کر رکھی ہیں۔ لاہور میں رہتے بھی بہت دور ہیں، ماڈل ٹاؤن میں۔ وہاں تک رسائی بھی مجھ مسافر کی دشوار تھی لیکن اللہ کا کرم کہ کلوکیم کے باہر ہی ان سے ملاقات ہو گئی اور دوسرے دن انھوں نے ہوٹل تک تکلیف کی۔ اللہ انھیں مدتوں صحیح و سلامت رکھے۔ سن کے اثر کو کیا کریں۔ میری نظروں میں تو ان کی پہلی ملاقات

کی شکل پھر رہی ہے جب وہ جوان رعنا تھے اور چہرہ سے مردانہ حسن پھٹا پڑتا تھا۔ مذہب و تصوف کی طرف جوانی ہی میں مائل ہو گئے اور اب تو کہنا چاہئے کہ نقشبندی سلسلہ کے ایک صاحب ریاضت بزرگ ہیں...... ایک روز شام کو کلوکیم کے باہر فارسی اور انگریزی کے تین ماہر مل گئے۔ پروفیسر فیروز فرہنگ نامہ جدید کے مصنف، آقا عبدالحمید عرفانی ماہنامہ ہلال (کراچی) کے مرتب اور شاہ حسن عطا جو اپنے جوار لکھنؤ ہی کے رہنے والے ہیں، اور علی گڑھ یونین کی وائس پریذیڈنسی بڑی شان و شوکت سے کر کے اب غالباً ایرانی رعایا ہیں۔ تینوں بے طرح مہربان رہے اور مبالغہ آمیز حسن ظن کا اظہار طرح طرح کرتے رہے اپنی ہی موٹر پر ہوٹل پہنچا گئے...... فارسی دانوں ہی کے سلسلہ میں نام پروفیسر اکبر منیر کا یاد پڑ جاتا ہے، لاہور میں خوب ہی متعارف ہیں۔ اقبالؒ سے غالباً خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ ہوٹل میں آئے اور دیر تک تشریف رکھی...... میاں بشیر احمد صاحب (صاحب ہمایوں) کا نام سالہا سال سے سننے میں آرہا تھا۔ کلوکیم میں جو ڈنر ایک شام کو یونیورسٹی کی طرف سے ہوا اس میں مہمان کی حیثیت سے یہ بھی آئے اور اس طرح ملے کہ فرطِ تواضع سے گویا بچھے جاتے تھے...... اشرف صبوحی دہلوی ثم لاہوری کا ذکر پچھلے سفر نامہ پاکستان میں آچکا ہے۔ ایکی بھی ملاقات رہی۔ اپنی دھیمی طبیعت اور خاموش زبان کا نقاب ایسا ڈال رکھا ہے کہ پتا ہی نہیں چلنے پاتا کہ اس کے اندر چہرہ کسی ادیب و اہل زبان کا ہے...... قاضی نذر احمد نگینوی یہاں کے کسی اسلامیہ کالج میں اُستاد ہیں، ملاقات رہی، ان کے بعض مضمون اس لحاظ سے قابل قدر نکلے کہ ان میں عرب، شام، مصر وغیرہ اسلامی ملکوں کے جغرافی مقامات کے عربی اور انگریزی دونوں نام موجود ہوتے ہیں۔ دونوں زبان کے جغرافیائی ناموں کا تطابق ایک اچھا خاصا دشوار مسئلہ ہے اور کثرت سے طالب علموں کو اس وادی میں بھٹکتے ہی رہنا پڑتا ہے۔ خوب ہو جو یہ ایک لغت یا فرہنگ اس قسم کا مرتب کر دیں...... سید شاہد حسین رزاقی بانسوی ثم لاہوری اپنے جوار ہی کے نہیں اپنی برادری کے ہی ہیں۔ اودھ کی مشہور درگاہ بانسہ کے پیرزادوں میں سے۔ یہاں ادارۂ ثقافت سے منسلک ہیں، قریب

ہونے کے باوجود اب تک دور ہی رہے تھے۔ اب کی خود ہی بڑھ کر ملے۔ اور اب جو پہلی بار سابقہ ان سے براہ راست پڑا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنی بہت اصلاح کر لی ہے۔ صلاحیتیں ان میں اچھی اچھی معلوم ہوئیں اور ایک خاص قسم کا توازن اور سلجھاؤ ان میں ملا جو یہاں کی سرتاپا ہیجانی فضا میں ایک خصوصی نعمت ہے۔ دل ان سے مل کر اور بات چیت کر کے خوش ہی رہا...... منشیوں، ادیبوں، اہل قلم کا یہ سرسری تذکرہ بھی یقیناً ناقص و ناتمام رہے گا اگر اس میں نام اردو کے ممتاز شاعر احسان دانش کاندھلوی ثم لاہوری کا نہ آنے پاتا۔ ان سے ملنے کا اشتیاق مدت سے تھا، ایکی جا کر پورا ہوا۔ شورش صاحب (چٹان والے) کے ہاں کی دعوت میں یہ بھی شریک تھے صرف ایک ملاقات سے سیری تو خیر کیا ہوتی، خصوصاً جبکہ ان کا کلام بھی ان کی زبان سے سننے میں نہ آیا۔ یہی غنیمت ہے کہ ایکی ملاقات ہو گئی۔

ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم لاہوری کی شخصیت اس کی متقاضی ہے کہ ایک لمبا پیراگراف مستقل انھیں کے ذکر کے لئے وقف رہے۔ گو یہ ذکر تمام تر ذکر خیر نہ ہو گا۔

جہاں تک میری ذات سے ان کے اخلاص، محبت، نیاز مندی کا تعلق ہے مبالغہ آمیزی ہی نہیں، شاعرانہ حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ جتنا جھک کر بلکہ گر کر وہ مجھ سے ملتے ہیں اور اس سے میں کٹ کٹ جاتا ہوں، اور عملی مدد بھی ایکی ان کی ذات سے جتنی ملی خصوصاً لاہور اسٹیشن کے ورود کے وقت اتنی کسی دوسرے سے نہ مل سکی۔ خطوط جس انتہائی تکریم و عقیدت کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں ان ساری حیثیتوں سے وہ میرے لئے ایک نعمت بے بدل ہیں اور اتنا ہی نہیں دلّی سے ان کی ہجرت لاہور معتبر راویوں کے بیان کے مطابق واقعی ایک حد تک "ہجرت" ہی کے حکم میں داخل ہے اور پھر لاہور پہنچ کر انھوں نے جس ایثار و خودداری، دیانت، صبر و تحمل، بلکہ توکل کا ثبوت دیا اس نے ان کے لئے عزت و احترام کا گہرا نقش میرے دل میں بٹھا دیا ہے...... لیکن (اور

دلی تاسف و قلق کے ساتھ یہاں لیکن، لانا پڑتا ہے) دوسری طرف ان کی زندگی کا ایک پہلو بڑا ہی قابل ملامت اور ان کی ریاضتوں اور مجاہدات کے خرمن کو آگ لگا دینے والا ہے۔

اور یہ ہے ان کا مشغلۂ ہجو گوئی و ہجو نگاری جو مشغلہ اب کہاں رہا ہے اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اسے فخر و اطمینان کے ساتھ اپنا فریضۂ زندگی بنا لیا ہے! اور وہ بے محابا بے تحاشہ ہجو نگاری بھی اس غضب کی جو شاید سوداؔ و انشاءؔ کو بھی پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ ایسی بے پناہ ہجو نگاری تو کافروں کی بھی مطلق صورت میں جائز نہیں چہ جائیکہ اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہی ملک کے اونچے افسروں اور عہدیداروں کی جو سب کے سب کلمہ گو ہی ہیں۔ اور ان میں یقیناً بہت سے اچھے مسلمان بھی ہیں۔ خواجہ صاحب کے ذہن میں خدا جانے یہ کہاں سے بیٹھ گئی ہے کہ ان کی ذات پر سب و شتم ان کے نسب پر بدترین حملے ان کی صورت و شکل کی تضحیک غرض ہر قسم اور ہر درجہ کی گالی گلوچ ایک کار ثواب اور بھٹیار خانہ کو مات کرنے والی اس بولی ٹھولی کا نام ان کی زبان میں ادب و انشاء ہیں! یوں بھی اس صریح دشنامی لٹریچر کے اقتباسات دینے آسان نہیں اور پھر اس سفر نامہ میں تو اور بھی اس کا موقع نہیں ورنہ دل پر جبر کر کے دس بیس سطریں اس ادب لطیف کی نہیں ادب کثیف کی ضرور نذر ناظرین کر دی جاتیں۔ بغیر اصل نمونوں کے کوئی اندازہ کر نہیں سکتا کہ خواجہ شفیع جیسا شریف طینت و شریف النفس انسان سفلیت کے کتنے گہرے غاروں میں اتر سکتا ہے! دوبارہ عرض ہے کہ خواجہ صاحب کو مجھ سے بے پناہ اخلاص و محبت ہے لیکن عین اسی اخلاص ہی کا یہ مقتضا ہے کہ انھیں اس غلط ترین راستہ پر پڑے رہنے سے اپنے امکان بھر روکوں اور جہاں بہت سی کوششیں خانگی طور پر تحریراً اور زبانی دونوں طرح کر چکا ہوں ایک بار پبلک میں انھیں سنا دوں کہ میں ان کی اس سر تا سر غیر اسلامی روش سے تھرتھرا جاتا ہوں۔ اکابر اہل سنت نے حجاج بن یوسف اور یزید بن معاویہ جیسے کھلے مجرموں کے حق میں کس درجہ احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے چہ جائیکہ ایسے معاصرین کے حق میں جن کی زندگیاں ایک اوسط

درجہ کے معمولی مسلمان کے معیار سے ہرگز فروتر نہیں۔ بزرگوں کی زبان سے تو یہ ہدایت کان میں پڑی ہوئی گونج رہی ہے کہ غصہ، گرمی، نفرت و بیزاری کے قابل تیرا اپنا نفس ہے باقی دوسرے کلمہ گو کے لئے اُس کے اعمال کی زیادہ سے زیادہ حسن ظن سے تاویل و توجیہ کر کے اس کا اعزاز و اکرام ہی واجب ہے...... اور اپنے وطن کے حکیم و صوفی شاعر کا شعر تو ضروری ہی خواجہ صاحب کے ذہن میں محفوظ ہوگا ۔

دیوانگی بہانہ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

لاہور پہنچے دوسرا بلکہ تیسرا دن بھی گزر گیا، اور شہر کے سب سے بڑے باخبر "نوائے وقت" والے حمید نظامی کی طرف سے کوئی خیر خیریت نہیں! لاہور والے اس اجنبی اور نو وارد مسافر کے حق میں بے طرح مہربان نکلے، کیا عوام اور کیا خواص، کہنا چاہئے کہ ٹوٹ پڑے، کلوکیم پہنچ کر اندر تک جانے اور اسی طرح باہر نکل کر سواری تک پہنچنے میں لوہے لگ جاتے تھے۔ قدم قدم پر مصافحے، کہیں کہیں معانقے اور سب سے بڑھ کر "آٹوگراف" (بہ قلم خود) کی فرمائش کرنے والوں کی یلغار!...... خط خاص کی فرمائش اس سے جس کی بدخطی ضرب المثل بن چکی ہو! سبحان اللہ! سچ کہا مومنؔ دہلوی نے ۔

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا!

ایک ایک دن میں بلا مبالغہ تیس تیس، چالیس چالیس دستخطوں کے اصرار! گویا میں بھی کوئی قومی لیڈر یا ہیرو تھا! یا ایک ننھا منا ایڈیشن خود "قائداعظم" کا! یہ گھیرنے والے یقیناً زیادہ تر طالب علم ہی ہوتے تھے۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ سب طالب علم ہی نہ تھے۔ اچھے اونچے اور معمر لوگ بھی ان میں شامل، واقفیت کے لئے حوالہ سب کی زبانوں پر، کیا بڑے اور کیا چھوٹے "نوائے وقت" ہی کا کہ اس میں التزام کے ساتھ ہر

ہفتہ "سچی باتیں" اور نوٹ "صدق" کے پڑھتے رہتے ہیں! گویا چرچا گردوپیش ہر وقت نوائے وقت کا اور خود صاحب نوائے وقت ہی غائب!

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے!

آخر جب ۴، ۵ دن گزر گئے، مدت قیام نصف ہی رہ گئی اور دل میں فکر بھی تشویش کی حد تک پہنچ چکی، تو ایک روز دوپہر کو یک بیک حمید نظامی صاحب مع اپنے رفیق طریق آغا شورش کاشمیری کے ہوٹل میں وارد! معلوم ہوا شہر میں تھے ہی نہیں کراچی گئے ہوئے تھے ابھی واپس آئے ہیں اور اب ملاقاتیں بار بار رہیں۔

نوائے وقت اُردو روزناموں میں بڑی حد تک ایک معیاری پرچہ ہے۔ زبان صحیح، سلیس، شگفتہ، عوامیت، بازاریت ابتذال سے ہمیشہ بلند، نقیب شخصیتوں کا نہیں اصول کا، ناقد پارٹیوں کا نہیں مسائل کا۔ تحریریں نہ جذباتی نہ جدلیاتی بلکہ استدلالی، متانت سنجیدگی و شرافت کا ہر حال میں حامل۔ اس روش اور اس طرز کے پرچہ کا خواص ہی میں مقبول ہونا دشوار ہے چہ جائیکہ خواص کے ساتھ عوام میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ اسے پرچہ کے مالک اور ایڈیٹر کے نصیب کا اعجاز نہ کہیے تو اور کیا کہیے!

گو سیری نہ ہوئی، پھر بھی نظامی صاحب سے ملنا بار بار ہوا اور گفتگوئیں ہر بار اچھی ہی رہیں۔ اپنے اخباری مقالوں کی طرح وہ گفتگو میں بھی ماشاءاللہ وزن اور توازن دونوں پر قادر ہیں۔ نہ اتنے پر گو کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کا نقشہ کھنچ جائے اور مخاطب بیچارہ

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

کی تصویر بن جائے! نہ ایسے کم گو کہ مخاطب "بور" ہو کر رہ جائے اور اپنے کو بار خاطر سمجھنے پر مجبور ہو جائے!

اور ان سے کچھ ہی کم ملاقاتیں چٹان والے آغا شورش کشمیری سے بھی رہیں۔ "چٹان" کے لفظ سے دھوکا نہ کھائیے۔ کسی قسم کی کرختگی کا گمان بھی دِل میں نہ لائیے۔

آدمی باغ و بہار "پنجابیت" کے ثقل کا نام نہ نشان، زندہ دلی کی تصویر، بے تکلفی، بے ساختگی کے پیکر، تخلص شورش، اگر اُستاد کا عطیہ ہے تو ان کی مردم شناسی قابل صاد، اگر طبع زاد ہے تو خود شناسی قابل داد!

اے وائے بہ شہرے کہ درد فتنہ گرے نیست

پیشے کے لحاظ سے صحافی ہیں لیکن ذوق و عادت دونوں کے لحاظ سے خطیب، صحافت پر غالب خطابت اور خطابت پر غالب انسانیت۔ لکھتے ہیں تو گویا میز پر بیٹھے قلم نہیں چل رہا ہے، پلیٹ فارم پر زبان اور اعضاء جسم حرکت میں ہیں! مجھ سے ملاقات کی عمر کچھ ایسی طویل نہیں اور پھر راہیں بھی ہم دونوں کی کچھ الگ ہی الگ سی ہیں۔ اس پر بھی ملے تو یوں نہیں کہ جیسے کوئی غیر و بیگانہ ملتا ہے بلکہ جیسے اپنا اور اپنوں سے بڑھ کر اپنا، مخاطبے کی گرمجوشی نے پتہ بھی نہ چلنے دیا کہ گفتگو کسی باہر والے سے ہو رہی ہے۔ نقش یہ جما کہ سامنے کوئی مخلص قدیم ہے بلکہ شاید عزیز قریب...... تصنع و ملمع کاریوں کے اس دور میں اخلاص کا یہ جوہر ہزاروں وصفوں کا ایک وصف ہے۔

انھیں کے ہاں ملاقات وارث کامل صاحب سے بھی ہوئی۔ مدتوں مدینہ (بجنور) میں رہے۔ اب منتقل ہو کر "چٹان" میں آگئے ہیں اور ہندوستانی سے پاکستانی بن گئے ہیں۔ ان کی زیارت ہندوستان میں نہیں یہیں مقدر تھی۔ ان کی وضع قطع دیکھ کر حیرت بھی ہوئی، چہرہ مہرہ ٹھیٹھ اسلامی، لباس خاص مشرقی، داڑھی مقطع اور نورانی، اس حلیہ اور کینڈے کے ساتھ یہ آج کی صحافت کے ساتھ واللہ اعلم نباہ کیونکر کر رہے ہیں! ابھی تو وارث کامل ہیں خدا کرے کسی دن مرشد کامل کہلائیں۔

صحافت ہی کے دو چار اور نمائندوں سے بھی علیک سلیک رہی، ایک "مرشد زادے" نہ سہی "ہلالک زادے" سہی عبدالسلام خورشید ایم اے درسگاہ صحافت کے پرنسپل دوسرے اپنے ہی جوار بلکہ برادری کے جوان محمد زہیر صدیقی سندیلوی ایم اے نیوز ایڈیٹر پاکستان ٹائمز۔ تیسرے روزنامہ "ڈان" (کراچی) کے نمائندہ لاہور (نام افسوس ہے کہ ذہن میں محفوظ نہ رہا) چوتھے جماعت اسلامی کے صحافی اور اہل قلم

کوثر نیازی صاحب۔

چند منٹ کے لئے انڈین ہائی کمیشن کے دفتر کے پریس اتاشی سے بھی نیاز حاصل رہا۔ اور کلوکیم کے ایک اجلاس کے عین برخاست کے وقت ایک صاحب نے صاحب سلامت میں سبقت کی، اور اپنا نام ثاقب زیروی بتایا۔ لاہور نامے ایک ہفتہ وار کے ایڈیٹر قبل اس کے کچھ اور بات چیت ہو، ہجوم کا ریلا آیا وہ ہم دونوں کو الگ کر گیا۔

لاہور آکر اگر کوئی سالک صاحب سے نہ ملا تو گویا ہندوستان آکر وہ تاج محل آگرہ کی زیارت سے محروم رہا! بقول شخصے

"جسے تو نہ ملا اسے کچھ نہ ملا!"

اور ان سے اگر مل لیا تو سمجھئے کہ پھر کسی اور صحافی سے ملنے جلنے کی ضرورت ہی نہ رہی، اپنی ذات واحد سے صحافت لاہور کے مرکز و مرجع بنے ہوئے اور گویا اس میکدہ کے مسلّم پیر مغاں!

تیرے ابہام پر ہوتی ہے تصدق توضیح
تیرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

لاہور جو صحافیوں کا ایک مستقل اکھاڑا بھی ہے کہ آج اس پہلوان نے اسے گرایا اور کل اس پٹھے نے اسے پچھاڑا، ایسے غدار شہر میں کسی کی اُستادی پر سب کا متفق ہو جانا ہے بڑے نصیبے کی بات!

مزاج و خوش طبعی کے ڈانڈے کچھ نہ پوچھئے کہ کیسے دبے پاؤں تفضیح و تضحیک سے مل جاتے ہیں اور اچھا خاصا بھلا آدمی ادھر ذرا چوکا ادھر ظریف سے مسخرہ اور بذلہ سنج سے بھانڈ بن گیا! سالک علم مجلسی کے ماہران نزاکتوں کے مزاج شناس، صحیح معنی میں ظریف و بذلہ سنج ہیں۔ برجستگی بدیہ گوئی، ادبیت، شوخی ان میں شروع ہی سے رہی تھی، عمر و تجربہ کی پختگی اور بالغ نظری نے ان کی شخصیت میں اب اور چار چاند لگا دیئے ہیں...... اکبر کی حکیمانہ ظرافت کی جھلک کوئی آج اگر دیکھنا چاہے اور ان کی عارفانہ نکتہ

رسی اور بذلہ سنجی کا نچوڑ اگر آج آنکھوں کے سامنے لانا چاہے تو کسی حد تک ضرور سالک صاحب اس کو پورا کر سکتے ہیں...... ایک جگہ سہ پہر کے ناشتے میں جب ہوتے ہوتے مغرب کا وقت آگیا تو ان آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ اس مختصر مجمع میں سے دو تین صاحب جو نماز ہی کے لئے نہیں اٹھے بلکہ اُن کے قدم محلّہ کی مسجد کی طرف بڑھے تو ان السابقون الاوّلون میں ایک یہ موٹر نشین حضرت سالک بھی تھے۔ آج مجلس احباب کو چھوڑ کر نماز ہی کے لئے اُٹھنے کا کون روادار ہوتا ہے چہ جائیکہ رخ مسجد کا کرے!

سالک صاحب اب صحافی تو برائے نام ہی سے رہ گئے ہیں البتہ ایک رہنمائے صحافت کی حیثیت سے سرگرم کار ہیں...... پہلوان جب سن سے اُتر جاتا ہے تو خود کشتی کا زور دکھانے کے بجائے بہتوں کو داؤ پیچ سکھاتا رہتا ہے...... اور اب وہ مصنف و کتاب ساز بھی ہیں لاہور جا کر اگر کسی کو اسلامی لاہور کے ماضی و حال سے مالہٗ و ماعلیہ سے واقف ہونے کا شوق ہو اور اسے رہنما صرف ایک ہاتھ آنا ممکن ہو تو بلا تامل اسے چاہئے کہ وہ رُخ سالک ہی صاحب کی طرف کرے۔

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسمِ منزلہا

قال و حال کے درمیان ربط و توافق تو کمتر ہی ہستیوں کے حصہ میں آتا ہے۔ دنیا نام ہی اس کا ہے کہ تعلیم کچھ ہو اور عمل کچھ۔ شورش صاحب کے دستر خوان، جی نہیں دستر خوان کہاں، کھانے کی میز نے اس باب میں ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس مسافر کی وہ مسافر نوازی نہ فرماتے، پچھلے تجربہ کی بنا پر عرض کیا گیا کہ خدا کے لئے ابکی ان تکلفات سے کام نہ لیجئے گا ارشاد ہوا کہ نہیں ابکی بالکل سادگی رہے گی، صرف ایک قسم کا کھانا پیش کیا جائے گا...... دعوت ہوئی چٹان کے بھولے بھالے ناظرین اس خیال میں ہوں گے کہ بس ماحضر پیش کر دیا ہو گیا، سادگی کے لحاظ سے دعوت شیراز کا نمونہ! نفس کھانے سے قبل اس کا ایک مستقل ابتدائیہ تھا اور کھانے کے بعد اس کا ایک

طویل اختتامیہ! خشک وتر میووں کی شکل میں، لذیذ و نفیس پھلوں کی صورت میں، نمکین بھنے ہوئے مغزیات اور لطیف وشیریں لوزیات کے روپ میں!...... دعوت کے یہ تکلفات کھانوں کے یہ تنوعات ہر رئیس کے حصہ میں نہیں آتے کسی رئیسِ اعظم ہی کے حصہ کی چیز ہیں!

کھانے کی میز پر جب رسائی ہوئی تو رزّاق مطلق کی نعمتوں اور بخششوں کا ایک پورا میوزیم (ندرت خانہ) سجا سجایا نظر آیا۔ مرغ کا قورمہ اور مرغ کی بریانی، مرغ مسلّم اور طرح طرح کے کباب مچھلی اور انڈے کے طرح طرح کے سالن اور اب یاد نہیں کہ اور کیا کیا!...... آج کا دن شہر میں بکری کا گوشت نہ ملنے کا تھا اس کا کیا خوب توڑ سوشلزم کے اس ذہین مبلغ نے سوچ لیا اور سادگی اور کفایت کی کیا چور راہیں اس سرمایہ شکن وسرمایہ بیزار نے نکال لیں!

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

حکومت نے بکری کے ذبیحہ پر پابندی یقیناً اس لئے عائد کی ہے کہ شاہ خرچ میزبانوں نے بکروں کو اس طرح بے دریغ کاٹنا شروع کر دیا تھا کہ اس سے نسل کے خاتمہ کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے لیکن کہیں میرے شیر نے دس بیس دعوتیں اور اسی پیانہ پر کر ڈالیں...... تو ذرا عجب نہ ہو گا کہ حکومت کو مرغ کی نسل کے بھی تحفظ کی فکر ایسی ہی لاحق ہو جائے!

سنا ہے کہ پچھلے سفر نامہ (۱۹۵۵ء والے) میں ان اولوالعزمیوں کی روداد پڑھ کر "چٹان" کے چار خریدار ٹوٹ گئے۔ عجب نہیں کہ ابکی نوبت آٹھ کی آجائے! لیکن دیکھئے کہیں دھوکا نہ ہو جائے۔ یہ سارا ذکر مذکور صرف "کھلانے" کا ہو نہ کہ "کھانے" کا اور کھانے اور کھلانے کے درمیان جو فرق ہے ظاہر ہے بلکہ جہاں تک خود کھانے کا تعلق ہے مہمان کی شہادت عینی ہے کہ میزبان اس باب میں لاابالی بلکہ بے نیاز سا واقع ہوا ہے۔

صدق و مدیر صدق کے پرانے اور خصوصی مخلصوں میں ایک خان بہادر شیخ

عبدالرحیم ایڈوکیٹ (فیروز پور روڈ) ہیں۔ اب کی بھی حسب توقع وہ ملے تو سارے لوازم مسافر نوازی و کرم فرمائی کے ساتھ ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء میں ان کا ساتھ چند مہینے کے لئے علی گڑھ میں رہا تھا۔ "ساتھ" غلط استعمال ہوا میں خشک مزاج اور اکل کھرا زندگی کے اس دور میں ساتھی کسی کا بھی نہ تھا یہ کہئے کہ ان کا معاصر تھا۔ یہ اس وقت یونین کے وائس پریذیڈنٹ تھے اور جو جانتے ہیں، بس وہی جانتے ہیں کہ علی گڑھ میں وائس پریذیڈنسی کے کیا معنی ہوتے تھے۔ انگریزی کے اعلیٰ مقرر تھے۔ مولانا محمد علیؒ اور ان کے کامریڈ سے عشق رکھتے تھے اور اسی مناسبت سے حسن ظن مدیر صدق کے ساتھ بھی قائم رکھے ہوئے...... بیچارے اب آنکھوں سے معذور ہو گئے ہیں، اللہ ان کی بینائی اور عام توانائی دونوں میں بہت برکت عطا کرے...... مخلصوں کی قدر ہوتی تو ہر سن میں کم و بیش ہے، ادھیڑ سن کے بعد بہت بڑھ جاتی ہے...... عبدالوحید خاں ایم اے، ایل ایل بی ممبر اسمبلی میرٹھی ثم لکھنوی ثم لاہوری سے ملاقات ابکی بہت دیر میں ہوئی۔ یعنی سفر کے بالکل آخری دن روانگی سے کل دو ڈھائی گھنٹے قبل ملے تو اسی قدیم گرمجوشی بلکہ ہماہمی سے۔ سفر میں باہر گئے ہوئے تھے۔ جز بز ہو رہے تھے کہ اب حسب حوصلہ کھلانے پلانے کا کوئی موقع نہیں۔ اسٹیشن تک ساتھ آئے بلکہ اپنے ہی موٹر پر لائے۔ وہ تو پلیٹ فارم پر آتے اور جب تک گاڑی ہی نہ چھوٹ جاتی ساتھ چھوڑنے والے نہ تھے لیکن امرتسر والے پلیٹ فارم پر اب پرندہ بھی پَر کہاں مار سکتا ہے۔ بھارت سے آنے جانے والے دونوں مجرم یا قیدیوں کے شمار میں ہیں۔ کسٹم کی سخت گیریاں سلامت رہیں، مخلصوں، دوستوں، عزیزوں مہمانوں سب کے درمیان یہی دیوار آہنی حائل!...... سفر نامہ کی یہ آخری قسط ہے پڑھنے والے بھی پڑھتے پڑھتے اکتا گئے ہوں گے اور لکھنے والے کے دل میں الگ یہ چور بیٹھا ہوا، کہ کسی طرح یہ ختم ہو تو پھر دوسرے ضروری اور اہم تر مضمونوں کے لئے گنجائش نکلے!

نئے ملنے والوں میں ایک نام ڈاکٹر جہانگیر خاں کا یاد پڑ رہا ہے۔ صدر مملکت کے

استقبالیے میں گورنمنٹ ہاؤس میں غالباً ملاقات ہوئی تھی۔ گورواروی میں بالکل ہی سرسری، ڈائریکٹر تعلیمات کے عہدۂ جلیل پر فائز مگر غلبۂ تواضع نے ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ یہ بھی کوئی چیز ہیں۔ اور اسی مجمع میں نیاز، آبِ کوثر و رودِ کوثر والے شیخ محمد اکرام سے بھی حاصل ہوا۔ شوق ان کی زیارت کا بھی عرصہ سے تھا لیکن کیا کہئے کہ نوبت بس علیک سلیک سے زیادہ کی نہ آسکی۔ سابق آئی سی ایس کے ممبر اب بھی کسی بڑے عہدہ پر ہیں۔ نواب صاحب ممدوٹ (سابق گورنر سندھ اور موجودہ وزیر مغربی پاکستان) افتتاح مذاکرہ ہی کے دن شام کو ایٹ ہوم میں ملے اور اپنے معمول کریمانہ کے مطابق خود ہی صاحب سلامت میں پہل کی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں پوری طرح پہچان سکوں اور کچھ عذر معذرت پیش کر سکوں معاً صدر مملکت کی طرف سے ان کی پکار ہوئی اور وہ یہ جاوہ جا ہاتھ سے نکل جا چکے تھے ...... مذاکرہ کے آخری دن جلسہ کی صدارت، پاکستان کے وزیر تعلیمات مسٹر بی کے داس نے کی، یہ غیر مسلم بزرگ یہی نہیں کہ مرکزی وزارت پاکستان کے ایک رکن ہیں بلکہ یہ خیال کر لیا جائے کہ جلسے کی صدارت بھی آخری دن انھیں نے کی، اور ایڈریس بھی اچھا خاصا سنایا، شب میں لاہور کے سب سے بڑے اور شاندار ہوٹل فلیٹی میں دعوت بھی شاہانہ پیانہ پر انھیں کی طرف سے ہوئی۔ وہاں بھی ملنا جلنا دو ایک نئے صاحبوں سے ہوا جن کے نام بھی اب حافظہ میں نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے اور مولانا ظفر اقبال جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کھڑے کھانے کے تکلیف دہ دستور سے سابقہ یہاں بھی پڑا۔ اپنے لئے الگ ایک میز پر جگہ نکال لی، اور حسن اتفاق سے عزام پاشا مصری بھی وہیں آکر بیٹھے اور اس طرح چند منٹ کی گفتگو کا موقع ان سے پھر مل گیا۔ قیام لاہور کی آج آخری رات تھی، برابر سوچتا رہا کہ دیکھئے اب پھر بھی کبھی آنا نصیب ہوگا! ...... مولوی محمد اشرف خاں ایم اے (اُستاد پشاور یونیورسٹی) سے ناظرین صدق کچھ واقف ہو چکے ہیں۔ بیچارے غایت محبت واخلاص سے سفر کر کے پشاور سے آئے۔ دن میں ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہمارے معظم و مکرم مولانا سید سلیمان ندوی کے مرید خاص و مسترشد

بااختصاص ہیں اور ان کے صوفیانہ معارف کے شاید سب سے بڑے حامل۔ تبلیغی جماعت کے بھی سرگرم رکن ہیں۔ یورپ تک کا سفر اسی سلسلہ میں کر چکے ہیں۔ حالانکہ بیچارے پیروں سے کچھ معذور سے ہیں۔ حسب توقع تواضع و فروتنی مجسم نظر آئے۔ مزید گفتگو و ملاقات کی ان سے حسرت ہی باقی رہ گئی ...... جماعت تبلیغی والوں کی کارکردگی، سرگرمی، قوت عمل پر رشک آتا ہے، ہر جگہ اپنی دھن میں لگے ہوئے۔ کراچی کے صدق نواز حاجی محمد یوسف بٹلہ مع اپنے رفیقوں کے اس سلسلہ میں لاہور آئے ہوئے تھے اور کئی دن پہلے ملاقات کر چکے تھے۔ ان کی قوت ایمانی پر رشک آتا ہے کہ بڑی بڑی داڑھیوں اور موٹے جھوٹے کپڑوں کے ساتھ بغیر شرمائے اور جھجکے یورپ اور امریکہ جا جا کر وہاں والوں پر تبلیغ کر آئے ہیں! اور یہ تو بہت ہی اچھا کرتے ہیں کہ اپنا حلقۂ عمل محدود رکھے ہوئے، اپنی ساری سرگرمیاں اسی کے اندر رکھتے ہیں۔ یہ یکسوئی و حدود شناسی بھی اللہ کی بڑی نعمتوں ہی میں سے ہے۔ مختلف مقصد بجائے خود اعلیٰ سہی، لیکن انسان کی اپنی قوت تو بہر حال محدود ہی ہے ...... بڑی تمنا ایک مخلص قدیم و غائبانہ کرم فرما خاں صاحب چودھری نیاز علی خاں صاحب سے ملنے کی تھی پہلے دارالاسلام پٹھان کوٹ کے تھے اب جوہر آباد میں مہاجر تھے بیچارے نہ آسکے اور اپنے بجائے غازی سراج الدین کو بھیجنے پر قناعت کی۔ یہ ایک مرد مجاہد نظر آئے۔

گھوم پھر کر شہر کے مستقلاً دیکھنے بھالنے کی گنجائش ظاہر ہے کہ کہاں نکل سکتی تھی۔ تاہم دس دن کے قیام میں آمد و رفت میں بہت سے حصے تو نظر سے گزر ہی گئے اور بعض حصے بار بار، زندہ دل پر رونق، صحت مند شہر کو دیکھ کر جہاں دل خوش ہوتا تھا وہیں یہ حسرت بھی دامن گیر ہو جاتی تھی کہ اب ہم سے کیا؟ ہمارے لئے تو اب اجنبی ہے اور پردیس کے حکم میں داخل!

ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصل بہار ہے!

کاش یہ ۱۹۴۷ء تاریخ میں نہ آیا ہوتا! آیا تھا تو اپنی نوعیت بالکل دوسری ہی رکھی

ہوتی! ...... کتنے دل توڑ گیا! کتنے زخم اپنے پیچھے چھوڑ گیا!

مسجدیں اچھی خاصی آباد پائیں۔ نماز جمعہ پڑھنے کا اتفاق نیلے گنبد کی بڑی مسجد میں ہوا۔ اوپر نیچے اندر باہر مجمع سے پٹا ہوا پایا اور باہر موٹروں کی تعداد سے اندازہ ہوا کہ نمازیوں میں موٹر نشینوں کی تعداد بھی ماشاءاللہ خاصی بڑی ہے اور بے حیائی کے بھی وہ منظر دیکھنے میں نہ آئے جنھیں خود لاہور ہی کے اخبارات نے اتنا اچھال رکھا ہے۔ باقی یہ تو ظاہر ہی ہے کہ فرنگی تمدن کے اثرات سے کوئی بھی بڑا شہر ہو بچ کیونکر سکتا ہے لیکن اس میں تخصیص لاہور کی نہ رہی کراچی اور ڈھاکہ، دہلی اور لکھنؤ، بمبئی اور کلکتہ سب اپنے اپنے مرتبہ ترقی کے لحاظ سے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

ابکی قیام لاہور میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر کے ایک غیر مسلم اہلکار نے مہربان ہو کر آمد و رفت شروع کی۔ کمیشن کا ارادہ تو یہ تھا کہ ہندوستانی نمائندوں کو بعض اور نمائندوں کے ساتھ اپنے ہاں ایٹ ہوم دے اور ایک محض اتفاقی مجبوری سے یہ ارادہ عمل میں نہ آسکا...... اب کیا بتایا جائے کہ اشتراک و اتحاد کے ایسے سارے منصوبوں سے دل کو کس درجہ خوشی ہوتی ہے...... آخری دن جلسہ کے وقت کے بعد کمیشن اپنے سیکرٹری کے ہمراہ جانا ہوا۔ پریس اتاشی صاحب سواری لے کر لینے آگئے تھے۔ ڈپٹی ہائی کمشنر بھنڈاری صاحب بڑے لطف و اخلاق سے پیش آتے رہے، چائے، کافی منگائی اور بھی ہر طرح خاطر داریاں کیں...... دل یہ خیال کر کے خون کے آنسو روتا ہے کہ اگر خدانخواستہ دونوں ملکوں کے درمیان نزاع اور بڑھ گئی تو کیا انجام ہو کر رہے گا خصوصاً ہندی مسلمانوں کا! مصالحت و مفاہمت جب ادھر پنڈت جواہر لال کے اور اُدھر ملک غلام محمد مرحوم کے زمانہ میں نہ ہو سکی تو بعد کو امید ہی کیا ہو سکتی ہے۔

اپنے عزیزوں اور ہم وطنوں کی بھی ایک تعداد اب لاہوری ہو گئی ہے۔ میجر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ پرانے میزبان رہ چکے ہیں۔ ابکی میزبانی تو ان کے بس میں نہ تھی، پھر بھی کئی میل دور رہ کر (ان کی کوٹھی منٹگمری روڈ

کنٹونمنٹ کا فاصلہ ہمارے ہوٹل سے ۵، ۶ میل سے کم تو بہر حال نہ ہوگا) جتنی خاطریں ان سے ممکن تھیں کیے گئے۔ ماشاء اللہ بڑے مذہبی ہیں، چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے ہوئے کون "میجر" ہو گا؟ اور خاطر داریوں کے لحاظ سے ایسا ہی کچھ حال سید ناظم علی ایم اے دریابادی کا رہا۔ یہاں سیکرٹریٹ کے محکمہ سول سپلائی میں ہیں اور ہوٹل سے بہت دور پونچھ ہاؤس کے قریب کسی کالونی میں رہتے ہیں، چلتے وقت ان دونوں نے جو ناشتہ ساتھ کر دیا اس نے بڑا کام دیا۔ اخلاص کی آمیزش تو ہر تلخ کو شیریں بنا دیتی ہے۔

در محبت تلخ ہا شیریں شود!

چہ جائیکہ جب کھانے بھی حسن طباخی کی پوری رعایتوں کے ساتھ تیار کیے گئے ہوں گے ...... اور انھیں اپنوں میں ایک نام درگاہ بانسہ (ضلع بارہ بنکی) کے پیرزادے سعید میاں صاحب (سید سعید الحسن رزاقی) کا رہا جاتا ہے، آئے اور یگانگت کا حق ادا کر گئے۔

روداد سفر لیجیے ختم ہو رہی ہے۔ ایک دن اور وہ بھی عنقریب اسی طرح سفر حیات کا خاتمہ ہونا ہے اور اس کی روداد اس سے ہزار درجہ زیادہ تفصیل و تحقیق کے ساتھ خود مسافر کے نہیں اس کے دو ہمزاد رفیقوں کے ہاتھ سے ہر آن اور ہر لحہ قلمبند ہو رہی ہے۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۔ اس کے لئے دعا صرف یہ کرنا ہے کہ وہ داہنے ہاتھ کی طرف سے وصول ہو۔ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ الخ...... یہ روداد تمام تر نا تمام رہے گی اگر اس میں ذکر ان تین صاحبوں کا بہ صراحت نہ ہو، جو کہنا چاہیے کہ اپنا سارا وقت اس اجنبی کی مسافر نوازی کے لئے وقف کیے ہوئے تھے۔

(۱) ایک تو معلوم و معروف اہل قلم مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی خیر آبادی ثم پاکستانی۔

(۲) دوسرے پبلک کے لئے گمنام شفقت جیلانی خان جالندھری ثم لاہوری

(سندر داس روڈ پر کہیں رہتے ہیں)

تیسرے پبلک کے لئے غیر معروف حبیب الرحمٰن خاں صاحب ساکن گوجر گڑھی ضلع مردان۔

رئیس احمد جعفری تو خیر آج سے نہیں مدت دراز سے عزیزوں کے حکم میں ہیں۔اور شفقت جیلانی بھی صدق کے بڑے پرانے قدر دانوں میں ہیں بلکہ سالہا سال ہوئے اسی صدق ہی کے سلسلہ میں پنجاب سے لکھنؤ تک کا سفر اختیار کر کے مجھ سے مل بھی چکے ہیں۔ تیسرے صاحب ذاتی طور پر اجنبی محض تھے۔ صدق ہی البتہ پڑھتے رہے ہیں۔ بظاہر ان کو سرحدی اُجڈ قسم کا انسان ہونا چاہئے تھا مگر یہ "خشک" محض ہونے کے بجائے بڑے "تر" نکلے اور کرخت ہونے کے بجائے سرتاسر ملائم! عجیب عجیب طرح یہ خدمتوں میں لگے رہے اور بڑی بات یہ کہ بڑی خوش فہمی اور مجھ بدمزاج کے مذاق کی پوری رعایتوں کے ساتھ !..... اخلاق و قدریت کے ساتھ خوش فہمی اور عقل سلیم بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے یہ تینوں اگر اپنا کام کاج چھوڑے گھنٹوں میرے ساتھ نہ لگے رہتے تو خدا جانے چھوٹی بڑی کتنی دقتوں کا سامنا رہتا۔اور میرے رفیق عزیزی محمد ہاشم قدوائی سلمۂ ایم اے (لیکچرر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی) جنھیں بطور سیکرٹری ساتھ رکھا تھا کی ساری کوششیں ادھوری اور ناکام رہ جاتیں۔ سیکرٹری کا کام علاوہ اور بہت سے کاموں کے ایک یہ بھی تھا کہ جو عنایت فرما صبح تڑکے منہ اندھیرے نماز فجر کے معاً بعد ہی ہوٹل میں آکر گھیر لیتے تھے انھیں کسی طرح معذرت کرکرا رخصت کریں!

خیر اتنے صاحبوں کا شکریہ تو نام بنام ادا ہو چکا، بیسیوں نہیں پچاسوں بلکہ سینکڑوں چھوٹے بڑے اللہ کے بندے (اور ان میں زیادہ تر طلبہ ہی تھے) ابھی اور باقی رہ گئے ہیں جو اپنی محبت اور حسن ظن کا مظاہرہ کلوکیم کے اندر اور باہر مسجدوں میں قیام گاہ پر اور مختلف مقامات پر برابر کرتے رہے،ان میں سے بہتوں کے نام اوّل تو دریافت ہی نہ ہوئے اور جو ہوئے بھی تو ان کا یاد رکھنا بس کی بات نہ تھی...... اجران شاء اللہ ان

سب کو مل کر رہے گا اور وہ ہر انسانی اور اخباری شکریہ سے بڑھ کر ہے۔

دیکھتے دیکھتے واپسی کی تاریخ ۹ر جنوری آ گئی اور لاہور چھوڑنا پڑا۔ ہوٹل چھوڑتے وقت یاد ہوٹل کے ان ویٹروں (بیروں) کی بھی آتی رہی جو یوپی کے باشندے ہیں کوئی ضلع بریلی کے، کوئی ضلع میرٹھ کے۔ ۱۹۴۷ء کی مسلم گردی میں وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور ہوئے اور اب ہوٹل میں بیراگیری کر کے اپنی زندگی کے دن یا اپنی قسمت کا نوشتہ پورا کر رہے ہیں!...... گاڑی کا وقت دوپہر کے بعد کا تھا لیکن وہی کسٹم کے مرحلہ سے گزرنے کے لئے کم سے کم دو گھنٹہ قبل پہنچ جانا ضروری تھا۔دونوں مملکتوں کے حکام والا مقام جب تک عام لوگوں کی طرح ریل پر سفر کر کے ذاتی تجربہ نہ حاصل کریں سمجھ ہی نہیں سکتے کہ معمولی مسافروں پر کیا گزر رہتی ہے۔

کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

مخلصوں کی بڑی تعداد اسی لئے اسٹیشن آنے سے باز رہی کہ بہر حال امرتسر والے پلیٹ فارم تک پہنچنا تو نصیب ہی نہ ہو گا صرف دو چار لوگ آئے اور ان بیچاروں کو بھی مجرموں اور قیدیوں کے خاردار جنگلے کے ادھر ہی رک جانا پڑا۔ صرف ایک دو سخت جان ایسے نکلے جو اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر پھاند پھوند کر اندر آ گئے۔ دل ڈر رہا تھا کہ دیکھئے تلاشی میں کیا کیا نوبتیں آتی ہیں لیکن میجر ڈاکٹر خلیل کا ذاتی اثر کام آ گیا۔اور اس مرحلہ سے دم بھر میں نجات مل گئی...... دل کو بے اختیار یاد آ گیا کہ آخرت کی "چیکنگ" کا پتھر بھی اگر رحمت و فضل شامل حال رہا اسی طرح دم بھر میں پانی بن سکتا ہے اور آخر وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کی وعید کے ساتھ ہی وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کی بشارت بھی تو موعود ہی ہے...... خواجہ محمد شفیع کا ذکر شروع میں آ چکا ہے کہ ورود لاہور کے وقت وہ کیسے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے آج بھی ان کی آمد کا پختہ وعدہ تھا اور اس کا بڑا اسہارا تھا لیکن ایک اتفاقی معذوری سے انھیں آنے میں دیر ہو گئی اور اللہ میاں نے کام ڈاکٹر خلیل کے ذریعہ سے نکال دیا۔ پھر بھی وہ گاڑی کی روانگی سے خاصا قبل مع انھیں عزیز کے

آگئے جو محکمہ کسٹم سے متعلق ہیں اور ان کا آجانا تقویت مزید کا باعث تھا۔ گاڑی چلی، لاہور نگاہوں سے دور ہوا، اور امرتسر کا پلیٹ فارم آگیا اور جاتے ہوئے جن مصیبتوں کا سامنا ہوا تھا ان سے ہو کر ایک بار پھر گزرنا پڑا!...... اور آخر وہ وقت بھی کٹ گیا جس طرح اللہ ہر وقت کو کاٹ دیتا ہے۔ دوسرا دن ہوا اور ۱۰ر جنوری کی دوپہر کو اپنے قدم پھر لکھنؤ کے پلیٹ فارم پر تھے۔

جی میں تھا کہ روداد سفر کا خاتمہ شکر کے ترانوں اور مسرت کے زمزموں پر کیجئے۔ اور لاہور والوں کے لطف و محبت سے متاثر ہو کر قدر ارادہ و حوصلہ پھر ایک بار سفر کا کیجئے لیکن کیا کیا جائے کہ اور سارے لطف اور مسرتیں ایک طرف اور پھر پاسپورٹ اور ویزا اور دہرے بلکہ چوہرے کسٹم کی لعنتیں دوسری طرف! یہ تلخیاں اُن شیرینیوں پر کہیں بھاری! اور مسافر بجائے مسرت کے زمزمے شکر کے ترانے گنگنانے کے بے مزہ ہو کر آئندہ ایسے سفر سے پناہ مانگنے کی دعا میں مصروف! بقول شخصے

ہم پھرے کعبے سے اے قبلہ تو ہندو ہو کر!

(صدق جدید ۱۴ر فروری ۱۹۵۸ء)



مذاکرہ عالمی اسلامی

اپنا بچپن تھا کہ مولانا شبلیؒ کے سفر نامہ مصر و روم و شام کے شروع میں "اورنٹیلسٹس کانفرنس" کا نام پہلی بار نظر سے گزرا، اورنٹیلسٹ کا ترجمہ مستشرق رائج تھا۔ اور مراد ایسے شخص سے ہوتی تھی جو گو ہو مغربی یا فرنگی لیکن مطالعہ مشرقی (خصوصاً اسلامی) علوم و فنون کا خوب کر چکا ہو، اور اس حیثیت سے شہرت حاصل کیے اور نام پائے ہوئے ہو۔ شرقیات یا اسلامیات کے ان مغربی ماہرین کے جلسے ہر تھوڑی مدت کے بعد یورپ کے کسی شہر میں ہوتے رہتے تھے۔ کیا خبر تھی کہ کبھی یہ خواب حقیقت بن کر سامنے آئے گا اور عمر کے کسی دور میں بھی اس قسم کے کسی جلسہ میں بھی شرکت اپنے حصہ میں آئے گی!

پچھلے مہینے پاکستان نے لاہور میں جو عظیم الشان عالمی جلسہ پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر منعقد کیا وہ کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ سوا اس فرق کے کہ اس میں اسلامیت مستشرقین کی عام کانفرنسوں سے کہیں زائد تھی اور اسلامی رنگ اس میں ہر اعتبار سے نمایاں تھا...... جن لوگوں نے اسے ایک قسم کی جمعیۃ العلماء یا علمائے دین کا مجمع سمجھ رکھا تھا انھیں اپنی توقعات میں سخت مایوسی ہوئی ہوگی لیکن اس میں غلطی خود ان توقع قائم کرنے والوں کی تھی، کانفرنس کے بانیوں، داعیوں اور شرکاء مجلس کی نہیں۔

دعوت نامے پاکستان کے اندر اور باہر صدہا اہل علم کے نام جاری کیے گئے اور ان میں عموماً اور بیشتر اہل فضل و کمال کے ساتھ کچھ نااہل بھی مجھ جیسے شامل ہو گئے۔ باہر سے آنے والوں میں جہاں تقریباً ہر مسلم مملکت مثلاً مصر، شام، عراق، ترکی، حجاز، ایران، افغانستان، تیونس، انڈونیشیا وغیرہ کے دو دو چار چار نمائندے تھے، وہیں امریکہ، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، کینیڈا، جرمنی، اٹلی وغیرہ کی نمائندگی وہاں کے اکابر فضلا کر رہے تھے۔ ہندوستان سے ۶، ۷ اشخاص مدعو تھے ان میں سے کئی نہ پہنچ سکے اور ان میں

سب سے زیادہ افسوسناک غیر حاضری مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھنوی کی تھی۔ مدعوئین میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (حیدر آبادی ثم فرنساوی) بھی تھے۔ مگر سنا ہے کہ دعوت نامہ ان کے پاس اس قدر تاخیر سے روانہ ہوا کہ وہ کوئی صورت قبول دعوت کی نہ نکال سکے۔ اور آنکھیں ڈاکٹر عبدالحق افضل العلماء (مدراس) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی (صاحب برہان) کو تلاش ہی کرتی رہ گئیں۔ حاضرین میں بڑی تعداد قدرۃً خود پاکستان کے اہل فکر و اہل قلم کی تھی۔ بیرونی مہمانوں کی تعداد سوا سو سے کم کسی حال میں نہ ہوگی۔ ان کے مصارف سفر کے انتظام اور ان کے ایک پورے عشرہ تک قیام و مہمانداری میں مجموعی مصارف کئی لاکھ سے کیا کم ہوئے ہوں گے اور پھر مقالات کے ترجمے اور طباعت وغیرہ میں پنجاب یونیورسٹی نے دل کھول کر جو خرچ کیا اس کی میزان الگ!

مجلس کا باضابطہ نام الندوة العالمية للاسلاميات یا انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم COLLOQUIUM تھا۔ افتتاح صدر جمہوریہ پاکستان کے ہاتھ سے ۲۹/ دسمبر کے سہ پہر ہی کو ہو گیا تھا۔ ۳۰/ دسمبر سے ۸/ جنوری تک پورے دس دن، اجلاس دو دو ہوتے رہے۔ صبح کے اجلاس (ساڑھے ۹ تا ساڑھے ۱۲) میں مقالات عربی یا انگریزی یا "نادراً" اردو میں پڑھے جاتے تھے اور سہ پہر کے اجلاس (۳ تا ۵) میں ان پر نقد و نظر ہوتی تھی۔ گو یہ آخری اجلاس کبھی وقت پر ختم نہ ہو سکا اور ہمیشہ وقت سے زائد ہی طول پکڑتا رہا، ایک دن صبح کے اجلاس کا ناغہ بھی ہو گیا۔ مصر کے ایک ممتاز نمائندے ڈاکٹر عبداللہ دراز بیچارے چند گھنٹوں کی بیماری کے بعد ۶/ جنوری کو واصل بحق ہو گئے اور ۷/ جنوری کا پہلا اجلاس ان کی تعزیت میں ملتوی رہا۔ مقالے کوئی ۷۰، ۷۵ کی تعداد میں پڑھے گئے ہوں گے۔ عربی مقالوں کے ترجمے انگریزی اور انگریزی مقالوں کے عربی میں ملتے تھے اور زبانی بھی ہر مقالہ کا خلاصہ عربی یا انگریزی میں بیان کر دیا جاتا تھا۔ کم و بیش یہ انتظام اردو کے لئے بھی تھا۔ پھر بھی اردو کو وہ جگہ نہ ملی جس کی وہ مستحق تھی۔ حد یہ ہے کہ خود پاکستانیوں نے بھی (بجز ایک مولانا مودودی کے) اس کے حق کا

خیال نہ کیا۔

مقالات و مباحث کے عنوانات اس قسم کے تھے:

(۱) ثقافت اسلامی۔

(۲) اسلام کا رویہ دوسرے مذاہب و ادیان کے ساتھ۔

(۳) موجودہ سائنس اور اسلامی مسائل۔

(۴) اسلام کا زرعی و معاشی نظام۔

(۵) امن عامہ اور اسلام۔

پانچ عنوانات اسی طرح کے اور تھے۔

پاکستان کے علماء کی نمائندگی مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم کراچوی، مولانا مودودی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا نور الحق ندوی پشاوری، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولوی ظفر احمد انصاری ایم اے کر رہے تھے۔ جدید طبقہ کی ترجمانی ان حضرات کے حصہ میں آئی جسٹس محمد شریف (سپریم کورٹ) چیف جسٹس ایس اے رحمٰن (ہائیکورٹ) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور پرویز صاحب کراچی کے ڈاکٹر رفیع الدین اپنی ڈگریوں کے لحاظ سے تو "جدید" ہیں لیکن اپنے عقائد و خیالات کے اعتبار سے "قدیم"۔ سندھ کے ڈاکٹر داؤد پوتا (سابق ڈائریکٹر تعلیمات) اور ڈاکٹر محمود حسین خان کا شمار بھی انھیں میں کرنا چاہئے اور مشرقی پاکستان سے ڈاکٹر محمود حسین (صدر پبلک سروس کمیشن) کی سرکردگی میں ڈھاکہ اور راج شاہی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور "دکاترہ" کی ایک پوری "ٹیم" ان کے علاوہ تھی۔

یورپ اور امریکہ کے اکابر فضلاء کی خاصی تعداد موجود تھی۔ امریکہ کے مشہور و معروف پروفیسر ہٹی، فرانس کے بوڑھے پروفیسر مسینان (MASSIGNAN)، ہالینڈ کے پروفیسر ڈریوز (DURRAS)، کینیڈا کے پروفیسر اسمتھ، برطانیہ کی مس لیمبٹن (LAMBTAN) اٹلی کے ڈاکٹر بوسانی (BUSSANI) وغیرہم۔ مسلم ممالک کے نمائندے بھی عموماً بہت اچھے تھے۔ مصر و شام، حجاز و مراکش و ایران کے وفدوں میں

شاید وہاں کے بہترین نمائندے شامل تھے۔ شیخ ابوزہرہ، بہجت البیطار اور شیخ جمال اور فیروزان فراور سب سے بڑھ کر عبدالوہاب عزام کی تقریریں اور شخصیت بھولنے والی نہیں ہیں۔ یہ لوگ علوم جدیدہ سے خوب واقفیت کے باوجود ان سے ذرا بھی مرعوب نہ تھے اور جہاں اپنے یا پرایوں کسی کی بھی زبان سے کوئی زد اسلام پر پڑتے دیکھتے پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے اور برجستہ جوابی تقریر میں اس مغالطہ کی پردہ دری کر دیتے۔ مثلاً ایک مستشرق نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ عصر حاضر میں اسلامی تعزیرات پر شاید نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہو گئی ہے۔ اس کے جواب میں معاً ایک اسلامی ملک کے نمائندے نے کھڑے ہو کر کہا کہ مشاہدہ و تجربہ سے جواب لیجئے کہ اسلامی تعزیرات آج بھی جہاں کہیں باقی ہیں وہاں جرائم کی شرح رفتار کیا ہے اور اس کا مقابلہ بڑے سے بڑے ترقی یافتہ ملک سے کر دیکھئے۔ اس طرح ایک اور افسوسناک تقریر خود ایک پاکستانی جوان (مقیم انقرہ) کی تھی، اس پر اتنی لے دے ہوئی کہ مقرر کو اس پر آمادہ ہونا پڑا کہ روداد میں یہ تقریر بجنسہٖ نہیں بلکہ نظر ثانی اور دو ممبروں کی مقرر شدہ کمیٹی کی منظوری کے بعد ہی درج ہو سکے گی۔

یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ کارروائیاں ساری ہی شروع سے آخر تک اسلامی نقطہ نظر کے مطابق تھیں۔ قابل اعتراض متعدد چیزیں تھیں پھر بھی بحیثیت مجموعی غلبہ خیر کا شر پر رہا۔ لڑکیوں اور عورتوں کی خاصی تعداد تماشائیوں میں تھی اور پھر جو برقع پوش نہ تھیں، ان میں کوئی نمایاں بے حیائی پائی نہیں گئی۔ البتہ یہ حال صرف کانفرنس کے اجلاسوں بھر رہا۔ ایک روز جب شب میں ڈنر ہوا تو وہاں خواتین ٹھیٹھ مغربی انداز پوشش و تزئین کے ساتھ جلوہ نما تھیں۔ اسی شب میں ڈنر کے بعد جو دستاویزی فلم ترقی پاکستان سے متعلق دکھائی گئی (اور اس کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا) اس میں ملک کے قدرتی منظروں، دریا، پہاڑ وغیرہ اور عمارتوں اور فوجی ترقیوں کے ساتھ ترقی یافتہ پاکستانی خاتون کے بھی نظارے، بہت سے کرائے گئے اور فرنگی مہمانوں کے سامنے خواہ مخواہ اور تکلیف دہ حد تک اسلامی ننگ و ناموس کی نمائش کرائی گئی۔

صبح کے اجلاس کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہوتا تھا۔ مصر، شام، پاکستان وغیرہ بلکہ روس (تاشقند) کے بھی ایک خوش الحان قاری نے تلاوت کی اور مستشرقین بھی ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کی سماعت کرتے رہے۔ سہ پہر کے وقت اجلاس میں جو وقفہ ۱۵، ۲۰ منٹ کا ہوتا تھا، وہ چائے کے نام سے ہوتا تھا کاش بجائے اس کے نماز عصر کے نام سے ہوتا! افتتاح کے دن صدر جمہوریہ کی آمد کی گھما گھمی اور سرکار و دربار کے لوازم متعلقہ میں ہر وقفہ اتنی دیر کر کے ہوا کہ نماز عصر کا وقت بھی گویا نہیں باقی رہ گیا تھا...... اُردو پاکستان کی تو ملکی و سرکاری زبان ہی ہے اور یوں بھی عالم اسلامی کے لئے بعد عربی کے درجہ اسی کو مل سکتا ہے لیکن مذاکرات کے سلسلہ میں عربی کے ساتھ دوسری زبان جو حکمراں نظر آتی تھی وہ انگریزی تھی۔ اُردو کا درجہ بہت ہی گھٹا ہوا نظر آیا۔ گو ضروری نہیں کہ اُردو کی یہ ناقدری دانستہ اور ارادی ہی ہو۔

جلسوں میں ایک افسوسناک کمی جو مسلم ملکوں کے نمائندوں میں خاص طور پر محسوس ہوئی وہ انضباط (ڈسپلن) کی کمی تھی۔ لیکچروں یا مقالوں کے لئے وقت کی تعین ناگزیر تھی، لیکن ایک بار نہیں، بار بار یہ ہوا کہ مقررہ ۱۵ منٹ ختم ہو گئے اور صدر جلسہ گھنٹی پر گھنٹی بجائے جاتے ہیں لیکن شامی، مصری، ایرانی مقرر صاحب اپنی ہی سنائے چلے جا رہے ہیں۔ یورپ و امریکہ والے اس سے کیا تاثر لے کر گئے ہوں گے؟...... تصویر کشی کی بلا بس اس طرح نازل ہوئی کہ معاذ اللہ۔ ہر ہر رُخ سے کہنا چاہئے ہر ہر منٹ پر کیمرہ اپنا کام کرنے کو تیار تھا۔ تصویر کشی اگر جائز ہو بھی تو کم سے کم اس کی کثرت و افراط تو ضرور دل کو اکتا دینے والی اور طبیعت پر بار بن جانے والی تھی...... اور فوٹوگراف سے بس کچھ ہی کم حملہ "آٹوگراف" والوں کا تھا! ہر ہر لڑکا اور ہر ہر لڑکی نوٹ بک لئے موجود کہ اس پر کچھ لکھ ضرور دیجئے اور اگر کچھ نہیں تو کم سے کم اپنا اسم شریف ہی! اس ہجوم و ہنگامہ میں یہ بے محل فرمائش جتنی تکلیف دہ تھی، اس کا اندازہ بھی باہر والوں کو نہیں ہو سکتا۔

سوا سو ڈیڑھ سو مہمانوں اور وہ بھی ملک ملک سے آنے والوں کے آرام و

آسائش کا پورا انتظام بہت آسان نہ تھا۔ خامیاں اور فروگزاشتیں اس باب میں بہت سی رہیں اور مہمانوں کو شکایت پیدا ہو جانی کچھ بیجا نہ تھی۔ پھر بھی انتظام بحیثیت مجموعی غنیمت ہی کہا جائے گا۔ گو کھلا ہوا گوشۂ چشم مغربی مہمانوں ہی کی طرف زیادہ تھا۔ ان کے لئے ہوٹل اور قیام گاہیں اعلیٰ سے اعلیٰ تھیں اور ہم مشرقی طرز والے مہمانوں کا شمار درجہ دوم میں تھا۔ داعی جلسہ میاں افضل حسین صاحب (وائس چانسلر) کو اخباری روایتوں کے مطابق بالکل "صاحب" "قسم کا اور "متکبر" انسان ہونا چاہئے تھا، تجربہ سے یہ شکایت بہت مبالغہ آمیز معلوم ہوئی۔ ان کے مددگار محمد افضل ایم اے اور عزیز بٹ صاحب اور مولانا علاء الدین اور پروفیسر امتیاز علی صاحب مستعدی سے دوڑ دوڑ کر کام کر رہے تھے اور ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد شفیع صاحب عالمانہ وقار اور سنجیدگی کی تصویر تھے۔



مدراس

سفر مدراس (۱۹۵۸ء)

سیر و سفر کے شوق کا بھی ایک سن ہوتا ہے جس طرح کھیل کود کا شوق بچپن کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ جوانی ختم ہونے پر سفر ایک "بار" معلوم ہونے لگتا ہے اور ہر قسم کے سامان راحت وانتظام آسائش کے باوجود بھی طبیعت سفر کے لئے آمادہ نہیں ہوتی سوا اس کے کہ کوئی ضرورت ہی اس کی آپڑے اور کوئی بہانہ سفر کے ٹالنے کا چل نہ سکے۔ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر فانی بدایونی کے اس شعر کے معنی روشن ہوئے ہیں۔

مئے گلگوں تھا سادہ پانی بھی
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی!

عمر کے اس پچھلے نہیں اس سے پہلے حصہ میں وطن سے نکل کر جنوب ہند میں بڑے سے بڑا بھی سفر جو کیا اس کی آخری منزل حیدر آباد رہی۔ اس سے آگے جانے کا اتفاق جب اس زمانے میں نہ ہوا تو اب اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی؟...... سن اور اس کے مقتضیات سے بھی کہیں بڑھ کر موثر امتناع سفر میں اب اپنے پڑھنے لکھنے کے مشغلے ہو رہے ہیں۔ تحریر کا کام کھانے پینے کی طرح گویا جزو زندگی بن چکا ہے اور وہ ہے اس نوعیت کا کہ اس کے لئے ہر وقت ایک طرف ایک مستقل کتب خانہ کی محتاجی اور دوسری طرف یکسوئی کے لئے مجمع سے علیحدگی اور ایک حد تک گوشہ گیری ناگزیر۔ سفر سے مانع ہونے کے لئے عذر طبعی تو موجود تھا ہی، اب اس سے کہیں زیادہ قوت و شدت کے ساتھ اس پر یہ عذر عقلی مستزاد...... رہے پبلک لیکچرز، تقریر و وعظ کی غرض سے سفر، تو تجربہ نے خوب بتادیا کہ دوسروں کے لئے جو کچھ بھی ہو، بہر حال اپنے لئے یہ دونوں زندگیاں نبھ نہیں سکتیں، یا تو شہروں شہروں پھر کر دھوم تقریروں کی مچائی جائے اور کاغذ و قلم کے مشغلے کو تہ کر کے رکھ دیا جائے اور یا پھر سکون، یکسوئی کے ساتھ جلسوں اور جلوسوں کے شور وشغب سے الگ قلمی ہی خدمت کر لی جائے۔

ایک بڑی ہی دردانگیز وحسرتناک مثال مولانا محمد علیؒ کی پیش نظر رہی۔ ان کی سی بے مثل صلاحیتوں کا شخص پبلک جلسوں میں پڑ کر کسی ٹھوس کام کا باقی نہ رہا اور اپنے قلب ودماغ کی مستقل یادگار گویا کوئی ایک ہی، ملک وملت کے لئے نہ چھوڑ گیا۔

تحریر و تقریر دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں۔ اپنے لئے خوب سوچا کہ کون سی راہ اختیار کی جائے۔ شروع ہی سے اپنے کو مناسبت تحریر ہی کے رنگ سے تھی۔ مضمون نگاری کہنا چاہئے کہ بچپن ہی سے شروع کر دی تھی۔ فیض صحبت بھی ایسے ہی لوگوں سے زیادہ اٹھایا جو اصلاً اہل قلم تھے۔ مولانا شبلیؒ، حضرت اکبر وغیرہ، عمر کا صرف ایک دور ایسا آیا جب مولانا محمد علیؒ کے ذاتی اثر واصرار سے تحریک خلافت کے جلسوں میں نمایاں حصہ لیا لیکن یہ دو چار ہی پانچ سال بعد ان کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ عہد کر لیا کہ صدارت وغیرہ الگ رہی پبلک جلسوں میں (خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی) نفس شرکت سے احتراز رہے گا اور شدید اصرار، تقاضے اور دباؤ کے بعد بھی بحمد اللہ اسی عہد کو نباہنے کی توفیق رہی۔ استثناء کی مثالیں بس خال ہی خال ملیں گی ورنہ ڈر یہ لگا ہوا تھا کہ اگر ایک بار بھی کسی کی مروّت میں یا اثر سے اس عہد کو توڑا تو دوسرے اسی کو سند پکڑ لیں گے اور پھر جان بچانے کا کوئی حیلہ حوالہ کارگر نہیں ہو گا۔ عادت رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بن جاتی ہے۔ ایک عمر کی ارادی مشق کے بعد اب یہ حال ہو گیا کہ جلسہ، جلوس، استقبال، گل پوشی، زندہ باد کے نعروں کے نام تک سے وحشت ہونے لگی ہے، ان کی دہشت دل میں سما گئی ہے، ان کے تصوّر ہی سے ہول ہونے لگتا ہے۔

اس صورت حال کے بعد احتمال بھی اس کا کسی کو ہو سکتا تھا کہ عمر کے پینسٹھویں یا چھیاسٹھویں سال میں ایک سفر حیدر آباد سے بھی آگے اور بہت آگے کا اختیار کرنا ہو گا، لیکن ارادۃُ اللّٰہِ غالِبَۃٌ۔ وہ لطیف وخبیر جب کوئی کام بندوں سے کرانا چاہتا ہے تو اس کے سامان بھی غیب سے عجیب عجیب پیدا کر دیتا ہے۔

مدت ہوئی سن گن ملی تھی کہ مدراس کے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق اپنے حسن

ظن سے کام لے کر کسی مذہبی موضوع پر علمی لیکچر اس نااہل سے شہر مدراس میں دلوانا چاہتے ہیں۔ جیسے علمی لیکچر ایک زمانے میں سَر اقبالؒ اور پھر مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ایک ایک ہفتہ کے فصل سے کئی ہفتوں تک دیئے تھے، بعد کو پھر کچھ خبر نہ ملی۔ البتہ یہ سننے میں آیا کہ جس فنڈ سے یہ لیکچرار باہر سے بلائے جاتے تھے وہ فنڈ مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ اور اب باہر سے کسی کے بلائے جانے کا احتمال نہیں۔ پھر دل نے یہ بھی کہا کہ ان عالی مقام لیکچراروں سے اس ہیچ مداں کو نسبت ہی کیا، اچھا ہی ہے جو اسے بلا کر اس کی ہنسی نہ کرائی جائے۔ غرض بات آئی گئی ہو گئی۔

شاید جنوری ۱۹۵۷ء کی کوئی تاریخ تھی کہ مدراس یونیورسٹی کے رجسٹرار کا مراسلہ موصول ہوا کہ فلاں فنڈ سے فلاں مذہبی عنوان پر انگریزی میں لیکچر دلانے مقصود ہیں۔ معاوضہ کی رقم اتنی ہو گی، کرایہ وغیرہ الگ سے کچھ نہ ملے گا۔ لیکچر فلاں زمانے میں ہوں گے ...... سوچا تو انگریزی زبان کی شرط کڑی معلوم ہوئی۔ اردو میں جو مشق چڑھی ہوئی ہے انگریزی میں کہیں اس کی آدھی تہائی بھی نہیں۔ جتنا وقت اردو کام میں لگتا اس سے کئی گنا انگریزی میں تیار کرنے میں لگ جاتا محنت کہیں زیادہ کرنی پڑتی پھر مہلت بھی کام کے لئے کچھ ناکافی سی معلوم ہوئی۔ عنوان بھی اپنی مرضی کا سو فیصد نظر نہ آیا اور یہ بھی خیال آیا کہ لیکچر اگر ہفتہ یا نصف ہفتہ کے فصل سے ہوئے جب بھی بہت روز ٹھہرنا پڑ جائے گا۔ رہا مالی معاوضہ سو یوں تو کم نہ تھا لیکن ایک ملازم اور ایک سیکرٹری ساتھ لے کر اتنے لمبے سفر پر جو خرچ آتا اس کے لحاظ سے زیادہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا ...... یہ سب سوچ ساچ رجسٹرار کو معذرت لکھ بھیجی اور بات اپنے نزدیک ختم کر دی۔

۸، ۱۰ ہفتے اس مراسلت کو گزرے ہوں گے کہ مدراس سے انھیں افضل العلماء کا خط موصول ہوا کہ آپ سے ملنے دریاباد آنا چاہتا ہوں اپریل میں دہلی آؤں گا، وہیں سے دریاباد آنے کی اجازت چاہتا ہوں، تاریخ تقریباً فلاں ہو گی ...... اس وقت تک موصوف سے شخصاً کوئی شناسائی نہ تھی اور خط بھی ان کا غالباً یہ پہلا ہی تھا۔ واقفیت

صرف ان کے نام سے تھی اور شہرت ان کے کام کی تھی۔ علی گڑھ وہ کچھ روز کے لئے پرووائس چانسلر ہو کر آئے تھے اور عارضی طور پر وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے، یہاں سنا تھا کہ وہ اتنے ہی دنوں میں اپنی دینداری اور اپنے فہم و تدبر دونوں کا نقش دلوں پر بٹھا گئے ہیں اور ایک حیدر آبادی عزیز سے ان کا یہ قابل رشک اور ناقابل یقین حد تک عجیب کارنامہ سننے میں آچکا تھا کہ جس دن اپنی صاحبزادی کا عقد انھوں نے کیا، اسی دن سات یتیم لڑکیوں کا بھی عقد انھوں نے کرایا! ایسے قصے تو صرف اولیاء اللہ ہی کے ہو سکتے تھے ورنہ اپنے ظرف پر قیاس کیا جائے تو عین اپنے ہاں کی تقریب کے وقت کوئی دوسرا اپنے ہاں کی تقریب میں اعانت کی بھی درخواست اگر کرتا ہے تو الٹا اور غصہ ہی آجاتا ہے کہ اگر اپنے پاس کچھ اور ہوتا تو اپنے ہی ہاں اسے بھی نہ لگا دیا جاتا، دوسروں کے دینے دلانے کا یہ کون سا موقع ہے؟...... بہرحال عقیدت ان کے اخلاقی اور دینی کردار سے متعلق اچھی خاصی قائم ہو چکی تھی، ملنے کو دل ان سے بے اختیار چاہا لیکن ساتھ ہی یہ یاد آیا کہ دنیوی اعتبار سے وہ ایک اونچے مرتبہ پر فائز ہیں اور شہر کے اعلیٰ معیار زندگی کے عادی مدراس پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ اپریل کی گرمی میں یہاں اس دیہات کے لئے زحمت سفر کیسے گوارا کر سکیں گے، جواب لکھا کہ دیدار سے مشرف یقیناً کیجئے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ملاقات اسی دیہات میں ہو۔

آئے وہاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں!

لکھنؤ آخر آنا جانا ہوتا ہی رہتا ہے آپ لکھنؤ جب آسکتے ہوں چند روز قبل اپنی تاریخ آمد اور اپنے ہوٹل سے اطلاع دے دیں، لکھنؤ آنے کا وقت نکالوں گا اور وہیں آپ سے مل لوں گا۔

جواب آیا کہ یہ نہیں ہونے کا۔ حاضری دریاباد ہی میں دوں گا، اجازت وہیں کے لئے طلب کر رہا ہوں۔

مجبوراً آخری جواب یہ عرض کیا گیا کہ بہتر ہے اگر آپ اس گرمی اور رمضان کے مہینے میں سفر دریاباد کا مجاہدہ اختیار کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو آپ کا ارشاد منظور، لیکن

ایک شرط ادھر سے بھی ہے، خدا کے لئے روزہ رکھ کر نہ آیئے گا۔ مسافر کے لئے افطار میں فقہاء نے تو خیر پھر بھی قیل و قال کی ہے لیکن حدیث سے صاف مرضی مبارک یہی معلوم ہو رہی ہے اور ظاہر قرآن بھی اسی کی تائید میں ہے۔

ادھر تو یہ ہوا۔ ادھر تکوینی طور پر اسی درخواست کی تائید یوں ہوئی کہ دہلی سے لکھنؤ آتے عین اسی شب میں ڈاکٹر صاحب علیل بھی ہو گئے اور اب وہ مسافر ہی نہ تھے بلکہ ساتھ ہی مریض بھی۔ رخصت افطار صوم سے فائدہ اٹھانے کے داعی قوی ایک چھوڑ دو موجود!

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے!

لکھنؤ سے دریاباد ٹرینوں کی آمد و رفت کثرت سے رہتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب لکھنؤ سے اپنے معزز میزبان کے ذاتی موٹر پر آرہے تھے تاکہ آمد و رفت دونوں کا وقت اپنے اختیار میں رہے۔ وسط رمضان کی کوئی تاریخ تھی اور کوئی دس بجے دن کا وقت، کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر صاحب وارد ہوئے...... دیکھا تو بغیر کسی خادم ملازم کے تنہا ہیں۔ اور وضع اتنی سادہ کہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہوں گے! رنگ صاف نہ ہونے کے باوجود چہرہ پر وہ نورانیت، جو صرف ریاضتوں اور تعلق باللہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اہلاً و سہلاً مرحبا۔ شربت وغیرہ پیش کیا گیا اور ملاقات کئی گھنٹے کی رہی، وقت اس کے لئے پہلے سے نکال رکھا گیا تھا۔ واپسی سہ پہر کو ہوئی۔

ملاقات پہلی تھی۔ لیکن دل ایسا کھلا کہ جیسے مخاطبہ کسی پرانے مخلص سے ہو رہا ہے۔ موصوف کی اعلیٰ علمی قابلیت، علوم مشرقی و مغربی دونوں کی جامعیت، گہری فکر و نظر، صحیح دینداری، لیکن ہر تعصب اور گروہ بندی سے برتری، اخلاص و عالی ظرفی، سب کے اندازے اور بڑے خوشگوار اندازے اس ایک ملاقات میں ہو گئے۔ بیعت اگر حضرت تھانویؒ سے تھی تو مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ عقیدت میں کمی نہ تھی۔

مرکز عقیدت اگر دیوبند تھا، تو گوشۂ چشم ندوہ کی جانب سے ہٹا ہوا نہیں! دینداری میں شغف کے ساتھ دل میں جگہ سر سیدؒ، بلکہ بابائے اردو مولوی عبدالحق

کے لئے بھی پوری طرح موجود! دوبار اگر آکسفورڈ میں جاجا کر قیام رکھا، تو دو ہی بار حج بیت اللہ کو بھی گئے...... جمود ذرا سا بھی نہیں۔ بڑی فکر اس کی کہ جدید مسائل و حالات کے پیش نظر علماء راسخین (مثلاً فاضل گیلانی مرحوم) کی ایک کمیٹی قائم کی جائے اور اس سے جدید سوالات کے مستند جوابات حاصل کئے جائیں...... ایک بڑی غلط فہمی بھی دور ہوئی۔ اب تک یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اصلاً یہ انگریزی خواں ہیں اور اس کے بعد دینی ڈگریاں بھی حاصل کرلی ہیں۔ آج تحقیق ہوا کہ اس کے برعکس اصلاً عالم دین ہی ہیں (اور کرنول کے ایک بڑے فاضل اور شیخ وقت کے فرزند) اور ایم اے ڈی فل وغیرہ سب اس کے بعد کیا ہے۔ علوم دین کے ساتھ عربی ادب، انگریزی ادب، اردو ادب سب پر گہری نظر اور توازن اعتدال و شرافت کے ایک معجون مرکب، جی مل کر خوش ہو گیا، مدت دراز کے بعد ایسی متوازن شخصیت ہاتھ آئی (اصل قحط، ملّت میں متوازن شخصیتوں ہی کا تو ہے) اور اپنے اوپر افسوس ہوا کہ اس سے قبل ہی کیوں نہ ان کی زیارت کرلی تھی۔

مدراس کے لیکچروں کا ذکر خود ہی ایک مناسب تمہید کے ساتھ چھیڑا اور فرمایا کہ اقبال و سلیمان والا فنڈ تو مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے، اب حال ہی میں ایک دوسرا فنڈ (گو اس سے چھوٹا) ایک مخیّر خاتون کو ترغیب دے کر قائم کرلیا ہے اس کے بعد اپنی خداداد فراست سے میری رکاوٹوں کو میری زبان سے سنے بغیر سمجھ گئے اور بڑے میٹھے انداز سے ایک ایک دشواری کا حل بتاتے چلے گئے:

(۱) اہم ترین دشواری زبان کی تھی۔ اس کے لئے اطمینان کامل کے ساتھ فرمایا انگریزی کی قید ہرگز نہیں۔ بہ مسرت تمام لیکچر اردو میں ہو سکتے ہیں۔ آدھی دشواریاں تو اسی ایک مسئلہ کے حل ہو جانے سے ختم ہو گئیں۔

(۲) عنوان کے لئے کہا کہ تمام تر آپ کی رائے و صوابدید پر ہے، مذہب کے دائرہ کے اندر آپ جو چاہیں رکھ سکتے ہیں۔

(۳) مدراس میں لمبے قیام کی ضرورت نہ ہو گی ہر روز بلاناغہ ایک لیکچر ہو سکتا

ہے۔ چھ دن میں بہ آسانی فراغت ہو سکتی اور پہنچنے کے آٹھویں دن رخصتی ہو سکتی ہے۔ ایک دن سفر کرنول کے لئے نکال کے۔

(۴) سامعین کا حلقہ بہت بڑا نہ ہو گا اور پبلک جلسہ کی صورت نہ پیدا ہونے پائے گی، صرف پڑھے لکھے تھوڑے سے لوگ سننے آئیں گے۔

(۵) جلوس، استقبال وغیرہ کا شائبہ بھی نہ پیدا ہونے پائے گا اور ملاقاتیں بھی ہر طرح محدود رکھی جائیں گی۔

(۶) مدراس یونیورسٹی میں اردو کا ایگزامنر ہی نہیں، بورڈ آف اگزامنر (ماڈریٹرز) کا ممبر بھی منتخب کرا دیا گیا ہے...... اور ان مجلسوں کی تاریخیں عین اسی زمانہ میں رکھ دی گئی ہیں۔ آمد و رفت کا کرایہ یونیورسٹی دے گی اس لئے اس فنڈ والی رقم سے ملازم یا سیکرٹری بلکہ دونوں کا کرایہ بہ آسانی نکل سکے گا۔

یہ ساری باتیں اس تصریح کے ساتھ اسی ایک نشست میں نہیں ہوئیں۔ کچھ باتیں اشارہ کنایہ میں اس وقت کہہ دیں کچھ بعد کو خط میں لکھ بھیجیں۔

ایک خیال آج سے نہیں، سالہا سال سے یعنی کوئی ۳۰، ۳۲ سال قبل سے دل کے ایک گوشے میں نشوونما پا رہا تھا کہ سیرۃ النبی ﷺ پر ایک کتاب خود قرآن مجید ہی سے اخذ کر کے مرتب ہونا چاہئے۔ سیرت نبوی ﷺ پر کتابیں ماشاء اللہ متعدد زبانوں میں اچھی سے اچھی موجود ہیں۔ خود اردو ہی میں مولانا شبلی و مولانا سلیمان کی سیرۃ النبی ﷺ اور مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی اصح السیر کس سے کم ہیں، لیکن ان سب کے بڑے اور اصل ماخذ وہی حدیث و سیر کی روایتیں ہیں۔

فرصت میسر آسکے تو ایک کتاب اس موضوع پر خاص قرآن مجید ہی کی بار بار تلاوت سے مرتب کیجئے۔ یہ بالکل درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شخصی زندگی کی بعض اہم جزئیات (مثلاً تاریخ ولادت، تاریخ وفات، عمر، تعداد ازدواج و اولاد وغیرہ) کے ذکر سے قرآن مجید خاموش ہے تاہم حضور ﷺ کی پبلک زندگی کے

اکثر اور شخصی زندگی کے بھی بعض اہم جزئیات پر قرآن مجید سے روشنی اچھی خاصی پڑ سکتی ہے اور صراحۃ النص کے ساتھ اگر دلالۃ النص، اشارۃ النص، اور اقتضاء النص کے قاعدوں سے کام لیا جائے تو سیرۃ نبوی ﷺ کے اکثر مباحث، قرآن مجید سے براہ راست اخذ واستنباط کئے جا سکتے ہیں البتہ ضرورت اس کے لئے پورا وقت دینے اور قرآن مجید کو شروع سے آخر تک اس نقطہ نظر سے بار بار پڑھنے کی ہے۔ سال کے بعد سال آیا، اور گزرتا گیا اپنی عمر جوانی سے ڈھل کر ضعیفی کی آگئی، اور اس ناکامی و محرومی کا یہ داغ سینہ چاک کر کے کس کو دکھلایئے، کہ اس خاص کام کے لئے فرصت کبھی نہ نصیب میں آسکی!

اب جو ڈاکٹر عبدالحق سے گفتگو ایک علمی دینی موضوع کے لئے آئی تو دل نے کہا کہ اب اس سے بہتر موقع اور کون ہاتھ آسکے گا، اور گو فرصت اب بھی بہت کم اور ہجوم مشاغل بدستور ہے، پھر بھی اللہ کا نام لے کر اب یہی موضوع اختیار کیجئے اور جن محترمہ مرحومہ نے اپنے عطیہ سے یہ لیکچر شپ قائم کرائی ہے اس نئی سیرت نبوی ﷺ کا اجر انھیں کے نام لکھوایئے۔ نقش مکمل نہ سہی محض خاکہ سہی، پھر بھی اب اس سے بہتر موقع زندگی میں (جواب باقی ہی کتنی رہ گئی ہے) نہیں ملے گا۔

لکھا پڑھی ہوئی اور چند روز میں بات طے پا گئی، رجسٹرار مدراس یونیورسٹی کا خط از سر نو آیا، ایکی اس کا جواب بجائے انکار کے منظوری میں گیا۔ اور اب قرآن مجید کا مطالعہ اس سیرتی نقطۂ نظر سے شروع ہوا، ساری متعلقہ آیتوں کو پہلے نشان لگا کر یکجا کرنا پھر نقل کے بعد انھیں مختلف بابوں کے اندر اور مختلف عنوانوں کے ماتحت سمیٹ کر ان سے نتیجہ نکالنا اور دوبارہ سب کو نقل کرنا، اس سارے کام کے لئے دو ایک سال کے وقت کی ضرورت تھی جو تنہا اسی کام کے لئے مخصوص ہو۔

اتنی فرصت ممکن کیونکر تھی؟ کل چند مہینے ہی کا تو اب وقت باقی رہ گیا تھا پھر اس میں بھی علاوہ صدق کی ادارت کے "چھوٹے بڑے" بیس کام اور! بہر حال جوں توں ورق گردانی تو کلام پاک کی کر ہی لی۔ اور مسودہ صاف ہونے کو دیا، فرمائش چھ لیکچروں

کی تھی، اتنے کی تو کوئی صورت نہ نکل سکی، کل پانچ لیکچر تیار ہوئے، اوسطاً ہر لیکچر ایک گھنٹہ میں پڑھنے کا۔ اکثر لیکچروں کے اندر دو دو تین تین باب۔

ادھر مدراس یونیورسٹی کے اردو بورڈ آف ماڈریٹرز کے صدر پونا کے کوئی ڈاکٹر ورما تھے، ان سے جو مراسلت شروع ہوئی تو وہ بھی اپنی شائستگی، پاکیزگی، مروت، شرافت کے لحاظ سے ایک ہلکے قسم کے ڈاکٹر عبدالحق ہی نکلے۔ قاعدہ سے میٹنگ اخیر دسمبر میں ہونی تھی لیکن مجھے عین اسی وقت لاہور جانا تھا بین الاقوامی مذاکرہ اسلامی (کلوکیم) میں شرکت کے لئے۔ بیچارہ ڈاکٹر ورما نے میری خاطر سے تاریخ ہفتہ عشرہ آگے بڑھائی، جب بھی ممکن نہ تھا کہ لاہور سے وطن آکر اور دوسرا سفر مدراس کا اختیار کر کے وہاں پہنچ سکوں۔ دلی شرمندگی و تاسف کے ساتھ انھیں معذرت لکھی اور لکھا کہ میٹنگ بغیر میرے کر لیجئے۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

جواب آیا کہ یہ ممکن نہیں۔ آخر تار پر یہ طے پایا کہ میٹنگ ۲۱/ ۲۲ جنوری کو ہو۔ اس کے لئے ۱۸/ کو صبح سویرے لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۲۰/ جنوری کی شام تک مدراس پہنچ جاؤں۔ سیرۃ والے لیکچروں کی تاریخیں بھی ۲۱/ تا ۲۵/ جنوری قرار پا گئیں۔ ۲۵/ کی شب میں مدراس سے روانگی براہ کرنول وحیدر آباد کہ ۲۹/ جنوری کو لکھنؤ واپس پہنچ جاؤں۔

۱۸/ جنوری۔ آج صبح سویرے روانگی لکھنؤ سے ہوئی۔ جھانسی میل پر سواری کا اتفاق اب کی برسوں کے بعد ہوا، ورنہ ایک زمانہ میں حیدر آباد کے سفر عموماً اسی سے ہوتے ہی رہتے تھے۔ قدرۃً آج یہ گاڑی کچھ عجیب اور نامانوس سی محسوس ہوئی۔ بعد دوپہر جھانسی پہنچے اور نماز ظہر اتر کر پلیٹ فارم پر اطمینان سے پڑھی۔ دہلی بمبئی میل کے آنے میں ابھی عرصہ ہے، پلیٹ فارم پر چہل قدمی دیر تک رہے گی...... جھانسی جنکشن سے سابقہ کوئی نیا نہیں، بمبئی حیدر آباد اور (اپنی سسرال) باندے جاتے اور آتے خدا معلوم کتنی بار اسی جنکشن سے گزرنا اور کتنی بار یہاں اترنا بھی ہو چکا ہے۔

نوجوانی، جوانی، ادھیڑ سن کے کتنے دَور یہ پلیٹ فارم دیکھ چکا ہے، گھنٹوں اسی ویٹنگ روم میں قیام رہا ہے۔ روزہ یہاں افطار کیا ہے، تراویح یہاں پڑھی ہے۔ تحریکِ خلافت کے اخیر زمانہ میں مولانا شوکت علی سے یہیں ملاقات ہوئی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں حج کو جاتے ہوئے اپنی چھوٹی بچیوں کو یہیں سے رخصت کیا تھا۔ باندے آتے جاتے کتنی خوشگوار قسم کی خانگی یادیں اسی پلیٹ فارم کے ساتھ وابستہ ہیں!...... اللہ نے حافظہ کی بھی کیا نعمت دی ہے جب چاہئے بغیر کچھ خرچ کئے اس قدرتی بائسکوپ کو کھول لیجئے اور بڑے سے بڑے خوشگوار و پر تکلف خیالی منظروں سے گھنٹوں دل بہلاتے رہئے!...... پر تکلف ہی نہیں، بڑے سے بڑے پر درد اور حسرتناک منظروں سے بھی!

دہلی بمبئی میل آیا اور ہماری لکھنؤ جھانسی میل کی بوگی کٹ کر اسی میں لگی۔ کوئی ساڑھے ۸ بجے شب کا وقت ہوگا کہ بھوپال اسٹیشن آگیا۔ بھوپال سے بھی بڑی خوشگوار یادیں خانگی اور دینی دونوں قسم کی وابستہ رہ چکی ہیں، تفصیل کس کس چیز اور کہاں تک بیان ہو! رات کو یہیں ٹھہر کر بقیہ سفر صبح تڑکے دہلی، مدراس (گرینڈ ٹرنک) ایکسپریس سے طے کرنا تھا۔ مولانا محمد عمران خاں ازہری ندوی (سابق مہتمم ندوہ) مستعدی، کارگزاری، اخلاص کے پتلے ہیں، مع اپنے صاحبزادے مولوی حبیب ریحان خاں ندوی (نشان منزل والے) کے موجود تھے۔ دو ایک اجنبی صاحبان بھی ان کے ہمراہ تھے مگر ہر طرح مہذب، شائستہ، خوش تمیز جو بار خاطر کسی طرح نہ ہوئے، ایک صاحب غالباً وجدی صاحب نامی تھے، اور ایک بڑی پرانی مخلص شاہجہاں پوری خاتون بھی۔ جنھیں بیعت اب مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ہے۔ کوئی ساڑھے ۱۰ بجے یہ محفل برخاست ہوئی اور رات ویٹنگ روم میں آرام سے گزری (جیسا آرام کہ مسافرت میں ملنا ممکن ہے)۔

فجر ابھی نہیں ہونے پائی تھی (اور موسم یاد کر لیجئے کہ شدید سردی کا تھا) کہ مولانا عمران کئی میل کا فاصلہ طے کر کے مع چائے کے سامان اور برقی چولہے کے پھر آموجود! نماز فجر جماعت کے ساتھ ویٹنگ روم میں ادا ہوئی اور ابھی سلام پھیرا ہی تھا

کہ جی ٹی ایکسپریس آگیا۔ خاصا اندھیرا تھا لیکن جگہ بحمد اللہ محفوظ و مخصوص مل گئی۔ انتظام کئی روز قبل سے کر دیا گیا تھا پھر بھی آج کل کے اندھیر کے لحاظ سے اطمینان نہ تھا، چائے اور ناشتہ انھیں عمران خاں اور ان کی اولاد ("آل عمران") کی عنایت سے عین BED-TEA کے وقت خوب مل گیا...... درجہ میں نگاہ کی تو رفیق سفر تین نظر آئے۔ تینوں ہندو، لیکن تینوں شریف و مہذب و شائستہ تھے مدراس کے اور دہلی سے آ رہے تھے۔ اردو سے معمولی بول چال کی حد تک تینوں واقف، اور مسلم کلچر سے تینوں کم و بیش متاثر، ایک صاحب کے جسم پر بجائے دھوتی کے تہمد، جو خاص مسلمانوں کا لباس سمجھا جاتا ہے...... مدراسی ہندوؤں کی بے تعصبی، رواداری اور مسلم آمیزی کا نقش جو بعد کو اور قوی اور گہرا پڑا، اس کی شروعات یہیں سے ہوئی۔

جی ٹی ایکسپریس کی تیز رفتاری کا کیا کہنا لیکن گاڑی ہل بہت رہی ہے اس لئے نظر جما کر پڑھنے میں آنکھ پر زور قدرۃً بہت زیادہ پڑنے لگتا ہے۔ کتابیں جو ساتھ تھیں بند کر کے رکھ دیں، طویل سفریوں بھی بڑا کھلنے والا ہوتا ہے، چہ جائیکہ جب پڑھنا پڑھانا دشوار ہو! صبح ہوئی دوپہر ہوئی اور گاڑی ہے کہ یکلخت چلے جا رہی ہے!...... گویا سفر زندگی ہے کہ مسلسل اور غیر منقطع بس طے ہوتا چلا جا رہا ہو!...... ہوشنگ آباد گزرا، اٹارسی نکلا اور پورا وہ علاقہ گزر گیا جو ایک زمانہ میں سنٹرل انڈیا کہلاتا تھا، مالوہ بھی اسی علاقہ میں ہے، وہی مالوہ جس کی شہرت بعض حلقوں میں افیون کے دم سے قائم ہے۔ فسانۂ آزاد کی زبان میں ع

پلا ساقیا مالوے کی افیم

یہ سارا راستہ ۱۹۱۷ء سے لے کر اب تک بیسیوں مرتبہ طے کیا ہوا ہے۔ سن کے فرق کے ساتھ اور مقصد سفر و نوعیت سفر کے فرق کے ساتھ گویا راستہ کا نقشہ بھی ہر دفعہ بدلتا ہی رہا ہے۔ ہوشنگ آباد کے جنگلوں سے گزرتے ہوئے خوف کی خیالی کیفیت ہر مرتبہ طاری ہوتی رہی ہے، کتنے ڈاکے، کتنے خون، کتنے قتل ان گھنی جھاڑیوں میں

ہوئے ہوں گے، کتنے قافلے ان اندھیریوں میں لٹے ہوں گے، کتنے ٹھگوں نے بیدردی سے بے گناہوں کے گلے میں پھندے مار کر انھیں یہیں گڑھوں میں دفن کر دیا ہوگا! پنڈاریوں کے دور میں یہاں کا سماں کیا رہا ہوگا! کتنے شہیدوں کے لاشے اس ویرانے میں تڑپے ہوں گے! کتنے یتیموں، بیواؤں، مظلوموں کی چیخیں آج بھی اس فضا میں خاموشی کے ساتھ گونج رہی ہوں گی!...... دوپہر کے بعد کا وقت تھا کہ ناگپور نظر پڑا، یہاں بھی اپنے کئی عزیز رہ چکے ہیں۔ تصور کی آنکھ کے سامنے ایک ایک کر کے گزرتے رہے۔ گاڑی رکی اور ۱۰، ۱۲ "صدق" نواز بھلے آدمیوں کا گروہ کھڑا ہوا نظر آیا۔ یہاں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر مولوی رفیع الدین صاحب (علیگ) ہیں۔ انھیں خط لکھ دیا تھا اور کرم فرماؤں کے نام اب کہاں یاد۔ یہاں ایک صاحب نہ بھولنے والے اردو کے کہنہ مشق سخن گو ناطق گلاٹھوی تھے۔ نام مدت دراز سے سننے میں آ رہا تھا۔ نیاز آج پہلی بار حاصل ہوا۔ اترنے کے لئے اصرار شروع ہوا جواب بجز معذرت کے اور ممکن کیا تھا۔ شاداب و شیریں سنتروں کی بھری ٹوکری رفیع الدین صاحب نے ساتھ کر دی...... گاڑی پھر چلی اور چلتی رہی، یہاں تک کہ واردھا اسٹیشن آگیا، اس نے بھی کتنی پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ گاندھی جی کی زندگی میں اسے کس درجہ اہمیت و مرکزیت حاصل تھی! ہندوستان بھر کا گویا غیر سرکاری دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ لوگ نعرہ لگاتے ہیں انقلاب زندہ باد۔ پائیداری انقلاب کو بھی کہاں نصیب۔ پلک جھپکاتے تو بڑے سے بڑا انقلاب خود ہی مردہ ہو جاتا ہے۔ زندگی تو بس جس کی ہے اسی کی ہے!

عشق با مردہ نہ باشد پائدار
عشق را با حیؑ و با قیوم دار

۱۳۰۰ میل سے اوپر کا سفر کچھ دل لگی نہیں۔ گاڑی لاکھ تیز رفتار ہو، آخر فاصلہ کو کیا کرے۔ لکھنؤ چھوڑے ہوئے آج دوسری شام ہو رہی ہے اور منزل ابھی ایک ثلث سے زیادہ باقی ہے۔ کھانے کی گاڑی ساتھ ہے کھانا تو کچھ مدراسی مذاق کا سا ہے

البتہ اس گاڑی کے خادم اور بیرے بڑے تمیز دار خوش سلیقہ کارگزار ہیں۔

رات بڑھی، بلہارشاہ گزرا اور قاضی پیٹ کا قرب محسوس ہوا۔ قاضی پیٹ جنکشن وہی ہے جہاں سے راستہ حیدر آباد کا کٹتا ہے اور یہیں سے آدھی رات کے وقت دو بوگیاں کاٹ کر حیدر آباد کے لئے لگا دی جاتی ہیں اور باقی ایکسپریس اپنی راہ چلا جاتا ہے...... حیدر آباد مرحوم، حیدر آباد کا نام زبان پر آگیا! غالبؔ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وطن کے بعد پھر اگر کہیں مخلصوں کی تعداد بڑی سے بڑی تھی تو اسی شہر اور اس کے اطراف میں! زندگی کا ایک سال بحیثیت مجموعی خوشگوار ترین یہیں کاٹا۔ عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم ہو چکی کہاں تھی ہاں قائم ہو رہی تھی اور صرف اس کا مقدمۃ الجیش سررشتہ تالیف و ترجمہ اس وقت تک قائم ہو پایا تھا اور پھر اس کے بعد سالہا سال کی آمد و رفت دنوں نہیں ہفتوں مسلسل قیام! ہر روز دعوتیں ہر شام جلسے اور پارٹیاں! نواب عماد الملک بلگرامی، سر امین جنگ بہادر، سر اکبر حیدری، سید عبدالمجید دہلوی (اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری) مولوی سید عبدالغنی بہاری وارثی (اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل) مسز سروجنی نائیڈو، مہاراجہ سر کشن پرشاد، بابائے اردو عبدالحق، سر مسعود جنگ کی بزرگانہ شفقتیں اور عنایتیں، حکیم امتیاز الدین و حکیم امروہوی کی مسیحا نفسیاں، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی وحید الدین سلیم، جلیل القدر فصاحت جنگ، سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی تلمذ حسین، جناب الیاس برنی، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا علی حیدر طباطبائی کی کرم فرمائیاں، ہوش بلگرامی، اکبر یار جنگ، مولانا گیلانی، مولانا عبدالباری ندوی، بہادر یار جنگ، احمد محی الدین (رہبر دکن) اور سید امین الحسن بسمل موہانی کا بے پناہ اخلاص، اور ناظر یار جنگ، اختر یار جنگ مینائی اور سید ناظم علی بانسوی کے عزیزانہ تعلقات یگانگت وغیرہا، ان میں سے کس کس چیز کو بھلایا جائے، کس کس کو یاد رکھا جائے۔ وطن کے بعد کوئی دوسرا مقام وطن ثانی اگر بن سکتا

تھا تو یہی حیدر آباد تھا۔ سب سے پہلے یہاں آنا ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا اور اس وقت یہ لائن تھی بھی نہیں۔ لکھنؤ سے آنا منماڑ اور اورنگ آباد ہو کر ہوتا تھا، جو کوئی ۴۰ گھنٹے کے مزید سفر کے بعد حیدر آباد پہنچاتی تھی۔ اسی ۴۰، ۴۱ سال کے اندر دنیا کیا سے کیا ہو گئی اور حیدر آباد تو اسی انقلاب کا شکار خصوصی ہو کر رہا۔ مسلم دور اقتدار کا جو آخری نشان ہندوستان میں باقی تھا اپنے ہاتھوں نادان دوستوں کے ہاتھوں سب خواب وخیال بن کر رہ گیا اور باہر کو چھوڑ خود اپنے اندر جو انقلابات ہوئے ان کا پوچھنا ہی کیا! یہی کچھ سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی اور قاضی پیٹ بے خبری میں گزر گیا۔

لیکن شوق واشتیاق جب اتنا تھا تو آخر حیدر آباد اتر کیوں نہ لیا؟ آخری مرتبہ اس سرزمین پر آنا اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ایک عزیزہ کی شادی کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ ۲۰ سال کی اس حسرت کو ابکی بہ آسانی مٹایا جا سکتا تھا لکھنؤ سے سفر دو چار روز قبل شروع کر دینا تھا۔ مدراس میں کام کی تاریخیں تو ۲۱ سے شروع ہوتی تھیں یہ قبل کے دو چار دن یہیں گزار لینے تھے۔ مالی سوال پھر کوئی بڑا نہ تھا۔ مدراس تک کے مصارف سفر کا تو سرکاری بل پیش ہونا ہی تھا صرف اتنے سے سفر قاضی پیٹ تا حیدر آباد کی آمد ورفت کا خرچ ذمہ پڑ رہا تھا، اور یہ کوئی ایسی بڑی رقم نہ تھی، تو پھر اسے کیوں نہ پورا کر لیا؟ اور کیوں اپنے ہاتھوں یہ موقع کھویا۔ جو قسمت سے ہی ہاتھ آرہا تھا؟...... سوال معقول ہے لیکن جواب ذرا تفصیل بلکہ تطویل چاہتا ہے۔

ارادہ خود ہی حیدر آباد اترنے کا تھا۔ بہت سے عزیز اگرچہ دکن سے پاکستان جا چکے ہیں پھر بھی جو باقی ہیں وہ بھی کچھ اہم نہیں۔ بہت سے مخلص مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھنے کے لئے دل بے اختیار ہو رہا تھا جو مخلصین ماشاء اللہ زندہ ہیں ان کی بھی خاطر عزیز تھی۔ پروگرام یہ بنایا کہ ادھر سے جانے میں چار دن کا وقت نکالئے۔ پہلا دن تو صرف مرحومین کی نذر ہو گا۔ بہادر یار جنگ مرحوم اور احمد محی الدین مرحوم (رہبر دکن والے) کے مزارات پر جانا تو واجبات میں سے تھا۔ پھر اختریار جنگ مرحوم، حاجی شاہ محمد یوسف دریابادی وغیرہ کا نمبر تھا، اور مخلصین میں سیّد

امین الحسن بسمل موہانی مرحوم کا نمبر اوّل تھا اور پھر ہوش یار جنگ مرحوم تھے۔ اور بھی کئی ایک، دو دن ملنے ملانے کے لئے مخصوص تھے اور ایک پورا دن گلکنڈہ کی آمد ورفت کے لئے۔ یہ اسکیم ایک مخلص کو لکھ بھیجی اور ان سے رازداری کی تاکید کر دی اور صاحب "رہنمائے دکن" کو بھی ان کی قدیم خاندانی خصوصیت کی بنا پر لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھ دیا کہ یہ معلومات بالکل نج کے ہیں، اشاعت ہرگز مقصود نہیں، ورنہ نادیدہ محبین و مخلصین کی فوج ٹوٹ پڑے گی۔ اسٹیشن ہی سے استقبال وجلوس وغیرہ کے قصے شروع ہو جائیں گے اور ہجوم سے بچنے اور اپنے سکونِ خاطر قائم رکھنے کی ساکھ جو برسوں کے بعد اب خدا خدا کر کے قائم ہوئی ہے وہ سب دم کے دم میں برباد ہو جائے گی اور پھر وہی مصیبت پیش آجائے گی کہ پبلک جلسوں میں کہاں جایا جائے اور کس سے انکار کیا جائے خیر انھیں یہ ساری تفصیل تو کیا لکھتا لیکن اجمال کے باوجود خط کو خانگی حدود کے اندر رکھنے کی تاکید خاص کر دی تھی...... مشیت کو منظور کچھ اور ہی تھا۔ یہ خط انھیں دیر کو ملا اور اس سے قبل ہی انھیں کسی اور ذریعہ سے اس کی سن گن مل چکی تھی۔ ان غریب نے اپنی سادگی سے اسے ایک "نیوز" (خبر) خیال کر کے اپنے روزنامہ میں چھاپ دیا اور ادھر "تعمیر ملت" کے بھی کوئی کارکن صاحب اس خبر کو لے اُڑے! اب کیا تھا۔ شہر بھر واقف ہو گیا اور عین وہ شے سامنے آگئی جس سے بچنے کا اتنا اہتمام کیا گیا تھا۔ پبلک یا "قوم" کے اشتیاق نامے دریاباد انھیں حوالوں سے پہنچنے لگے۔ اناللہ

طبیعت قدرۃً سخت جز بز ہوئی اور حیص بیص کے بعد بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ سرے سے یہ ارادہ ہی فسخ کیا جائے اور حیدر آباد کو پروگرام سے خارج ہی کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ آسان نہ تھا۔ طبیعت پر سخت گراں تھا۔ کچھ وعدہ خلافی بھی اس سے لازم آرہی تھی لیکن یہ فیصلہ نہ کرنے سے جو صورتحال پیدا ہو رہی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ گراں تھی اور وعدہ خلافی کے لئے یہ مجبوری کا عذر بالکل کافی تھا۔ آخر دل پر صبر کا پتھر رکھ کر یہی رائے قائم کرنا پڑی اور چٹ پٹ نئے خط اس فیصلہ کے ماتحت لکھ کر روانہ کر دیئے۔

۳۰ر کو عین فجر کے وقت گاڑی بجواڑہ جنکشن پہنچی اور دیر تک کھڑی رہی۔ یہاں بھی کچھ مخلصین تھے، لیکن انھیں خط دیر میں ملا، اس لئے کوئی صاحب اسٹیشن نہ آسکے اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا، نماز فجر اور اس کے بعد معمولات میں خواہ مخواہ فرق پڑتا۔ معمولات کے لفظ سے اوراد و تلاوت و نوافل کی طرف نہ جایئے۔ جی نہیں مراد محض مادی و جسمانی معمولات سے ہے جن کا تجربہ قبض کے ہر مریض کو رہتا ہے ......اب راستہ تمام تر نامانوس تھا۔ انسانی شکلیں، بولیاں، عمارتیں سب اجنبی سی دکھائی دے رہی تھیں اور دل میں بے اختیار وطن کی یاد آنے لگی تھی۔ رفیقۂ زندگی کی طبیعت عرصہ سے خراب چلی آرہی ہے اور کبھی کبھی بہت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ خیال بار بار انھیں کی طرف جارہا تھا اور دل کچھ مضطرب سا ہو رہا تھا، جوں جوں مدراس قریب آتا گیا، واہمے بھی بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ دوپہر ڈھل گئی اور سہ پہر شروع ہو گیا۔ نماز ظہر سے فراغت اوّل ہی وقت کرلی تھی کہ لیجئے وہ مدراس اسٹیشن آخر آہی گیا۔ گاڑی رکی اور منٹ دو منٹ کے بعد میزبان ڈاکٹر عبدالحق اپنے سادہ لباس میں مع اپنے صاحبزادہ کے نظر آگئے۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے نے اطمینان دلا دیا کہ وطن سے کوئی تار وار نہیں موصول ہوا ہے گویا گھر پر خیریت ہی ہے۔

اسٹیشن سے میزبان کا مکان چند منٹ کا معاملہ تھا۔ کوئی چار سوا چار بجے سہ پہر کا وقت تھا کہ موٹر رکا اور میزبان کے ہمراہ مہمان ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، اپنے کمرے میں جانے اور سفر کے میلے کپڑے اتارنے کا کیا ذکر، ابھی ہم لوگ بس بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ تار گھر کے چپراسی نے تار لا کر دیا۔ اور میزبان نے پتے پر میرا نام پڑھ کر تار میری طرف بڑھا دیا! کچھ نہ پوچھئے کہ ان چند سیکنڈوں میں دل پر کیا گزر گئی۔ اب بھی یقین کہ تار وطن سے آیا ہے اور ہو نہ ہو سانحہ کی خبر دینے والا ہے۔ تار کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ انسان کتنا تھڑدلا اور دل کا کچا واقع ہوا ہے! زبان سے دعوے اپنی بہادری کے جتنے بھی کرلے!...... خیر اللہ کا نام لیتے ہوئے دعائیں پڑھتے ہوئے جوں توں تار کو کھولا، خبر بیوی کے بھائی خاں بہادر حاجی شیخ مسعود الزماں

رئیس اور بیرسٹر باندا کے دفعتہً انتقال کی درج تھی۔ روانگی کے وقت لکھنؤ میں انھیں اچھا خاصا تندرست اور بشاش چھوڑے ہوئے چلا آرہا تھا...... راستے کے وہم آخر بالکل بے بنیاد نہ نکلے۔

زبان سے بے اختیاری میں اناللہ تو نکلا، اور باقی بس سناٹے میں آگیا! مرحوم سے اس خاص رشتہ کے علاوہ اور بھی قریب کی عزیزداریاں تھیں، سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے، کالج میں دو سال ساتھ پڑھے ہوئے تھے اور ہر طرح کی بے تکلفی رکھتے تھے۔ آخری شکل تین ہی دن قبل کی لکھنؤ میں نظر کے سامنے پھر رہی تھی اور وفات کا یقین ہی نہیں آرہا تھا...... انسان روز ہی ایسے واقعے اور حادثے دیکھتا رہتا ہے لیکن غفلت کے قربان جایئے کہ اپنی ذات اور اپنے عزیزوں کی طرف سے ایسی ہی بھول میں پڑا رہتا ہے گویا موت نہ اپنے کو کبھی آنا ہے اور نہ اپنے کسی عزیز قریب کو!

عالی ظرف میزبان نے تار ہاتھ سے لے لیا۔ اور تعزیت و تسلیہ اپنی والی کرنے لگے۔ یہ بھی کہا کہ "اگر چاہیں تو ہوائی جہاز کا انتظام ابھی کرادیا جائے"۔ عقل نے سوچ کر بتایا کہ اتنی طوالت اور بار مصارف کے بعد بھی حاصل کچھ نہیں جو ہونا تھا وہ ہو ہی چکا، نماز جنازہ یا تدفین میں شرکت تو بہر حال ہو ہی نہیں سکتی۔ اب اگر دو ایک گھنٹے کے اندر انتظام ہوائی جہاز کا ہو بھی گیا تو جہاز بہر حال کانپور ہی تک تو پہنچائے گا۔ رات کے کسی وقت وہاں سے پھر ٹرین ہی کا سابقہ ہو گا جو کل دوپہر تک کہیں باندے پہنچائے گی۔ رہی مرحوم کی والدہ (جو ۸۲، ۸۳ سال کی عمر میں ماشاءاللہ ابھی بقید حیات ہیں) اور بیوہ اور لڑکوں سے زبانی تعزیت تو وہ جس طرح دو دن کے بعد ہوتی آٹھ دن کے بعد بھی یہاں سے واپسی پر ہو سکتی ہے اس کے لئے یہاں کے فرائض کو چھوڑ کر چل کھڑے ہونا شرافت و احساس ذمہ داری سے بعید ہے۔ باقی تحریری تعزیت تو فی الفور بھی ممکن ہے...... بہر حال صبر تو اس سے کہیں بڑے حادثے پر بھی انسان کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس پر بھی اگر کر لیا تو کوئی بڑی بات نہ ہوئی۔ مغفرت کی دعائیں دل سے نکلیں، تعزیت کے تار اور خط لکھے۔

میزبانی بجائے خود ایک فن ہے، اور ہر ایک کا کام نہیں۔ اپنی ایک عمر مہمانیوں میں گزری۔ بحمد اللہ ناخواندہ نہیں خواندہ مہمانوں میں اور میزبان بڑے اور امیر غریب ہر درجہ کے تھے، مخلص اولوالعزم، سیر چشم سبھی نکلے۔ خاطر داریوں کے تجربے خوب خوب ہوتے رہے لیکن صاحب فہم یعنی اپنی مرضی نہیں بلکہ مہمان کی مرضی کو بالا رکھنے والے بس گنتی کے چند ہی نکلے۔ ایک مثالی میزبان حکیم الامت مولانا تھانویؒ تھے، بات بات میں مہمان کے ذوق اور اس کی سہولتوں کی رعایت کرنے والے لیکن خیر وہ تو حکیم الامت ہی تھے، دوسری کرامتوں کی طرح اس کرامت کے بھی مخصوص و منفرد مالک۔ باقی عام دنیادار میزبانوں میں جتنوں سے سابقہ پڑا ان میں کہنا چاہئے کہ نمبر اوّل پر یہ ڈاکٹر عبدالحق ہی رہے اور کمال یہ کہ مجھ سے اتنی کم ذاتی واقفیت اور اتنے قلیل کسی سابقہ کے بل پر! اللہ جانے کیسی خداداد فراست تھی، جس سے انھوں نے میرے رجحان طبیعت، مذاق و مزاج وعادات کا اندازہ کرلیا تھا!

ٹھہرنے کا کمرہ مختصر اور ضروری فرنیچر سے آراستہ و مع ملحق غسل خانے کے بالائی منزل پر رکھا، تاکہ کوئی بھی بغیر اجازت خصوصی کے وہاں تک نہ پہنچ سکے، یہ شرط تو سب سے مقدم اور ضروری تھی۔ ہجوم سے بچنے کا اہتمام میزبان نے اسٹیشن ہی سے شروع کردیا تھا، بجز دو ایک صاحبوں کے جن میں سے ایک صاحب قاضیوں کے مشہور خاندان کے تھے (وہی خاندان جس کے ارکان قاضی حبیب اللہ، ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہما ہیں) وہ کسی کے اسٹیشن پر ملانے کے روادار نہ ہوئے۔ اپنے گھر ٹھہرا کر تو اس کی ہر تدبیر بھی انھوں نے اختیار کرلی تھی۔ حد یہ ہے کہ صبح کے اوقات میں مجھے بالکل تنہا اور آزاد چھوڑ دیا تھا اور جب تک نو بجے کا وقت نہ ہو جاتا، خود بھی میرے کمرے میں نہ جھانکتے اور اس وقت جب آتے جب بھی اجازت لینے کے بعد! باقی چائے اور ناشتہ نماز فجر کے آدھ گھنٹے کے اندر ہی کمرہ پر پہنچ جاتا، وقت کی پابندی تک تو ٹھیک تھا لیکن ناشتہ بہت بڑی مقدار میں ہوتا اور بڑا پر تکلف اور یہی ایک شکایت تھی جو مہمان کو میزبان سے پیدا ہوئی۔

دن اور رات کے کھانے کے، لیکچر میں جانے آنے کے، مخصوصین سے ملنے ملانے کے سب اوقات پوری طرح بندھے ہوئے تھے۔ نظام اوقات میں امکان بھر کوئی گڑبڑ نہ ہونے پاتا۔ نماز فجر کے لئے پہلے دن تو مسجد لے گئے لیکن مسجد کا فاصلہ کوٹھی سے اچھا خاصی تھا۔ اس کا اندازہ کر کے دوسرے دن سے یہ قید بھی اُڑ گئی اور شریعت نے مسافر کو جو سہولتیں اور رخصتیں دی ہیں ان سے استفادہ پوری طرح ہونے لگا، مدراس کے موسم کو یوپی والے اپنے ہاں پر قیاس نہ کریں، فرق تو بھوپال ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ مدراس پہنچتے پہنچتے سردی کا موسم گرمی میں پوری طرح تبدیل ہو چکا تھا اور مدراس کی ۲۰ر جنوری لکھنؤ کے شروع اپریل کی کوئی تاریخ نظر آرہی تھی، پنکھے کی ضرورت، غسل کا بار بار تقاضا اور ہلکے کپڑے، یہ سب اسی موسم کے کھلے ہوئے نتیجے تھے۔ کراچی، بمبئی وغیرہ کی طرح مدراس بھی ایک سمندری مقام ہے اس لئے قدرۃً سابقہ بجائے یوپی کی لو کے، تیز و تند سمندری ہوا سے رہا کرتا ہے۔

بچپن سے نام مدراس کا کچھ اس طرح سننے میں آتا رہا کہ جیسے وہ راون کے دیس کا ہمسایہ دور افتادہ ہونے کے ساتھ کچھ ہونق و ویرانہ سا ہے، گویا یوپی کے گل و گلزار شہروں کے مقابلہ میں کور دیہہ! اور مسلمان تو جیسے وہاں بالکل ہُوش، گنوار بلکہ نیم جنگلی قسم کے بستے ہیں، انگریزی لفظ (BENIGHTED) ظلمت زدہ، اخباروں میں بار بار پڑھا ہوا، گویا اس کے تصوّر کے ساتھ چپکا ہوا! اور اتفاق سے جب کسی مدراسی مسلمان کی بڑائی علمی، مالی، دینی، ملی کسی حیثیت سے بھی سننے میں آجاتی تھی تو ایسی مستثنیٰ مثالوں پر خوشگوار حیرت ہی ہو کر رہتی تھی۔ سیٹھ یعقوب حسن مرحوم کی کتاب الہدیٰ اور دکن ٹائمز کے مطالعہ سے سید مرتضیٰ بہادر مرحوم کی ملاقات سے نیز ڈاکٹر عبدالحق کے حالات وصفات سن کر اس تخیل میں ترمیم خاصی حد تک اب ہو چکی تھی پھر بھی خیال سرے سے دور نہیں ہوا تھا اور اس میں خاصا دخل یوپی کے پندار تفوق کو بھی تھا۔ آج مدراس اسٹیشن ہی سے اس قسم کے اوہام و خرافات کی تردید شروع ہو گئی تھی، لوگ

جو دیکھنے میں آئے اچھی خاصی صورت شکل، وضع قطع کے۔ عمارتیں خوب صورت و عالی شان، سڑک صاف ستھری، دکانیں خوب پر رونق و شاندار، بازار میں پوری چہل پہل...... اور دل کو مانوس کرنے اور رجھانے والی بڑی بات یہ کہ اسٹیشن پر اترتے ہی بلند آوازیں اسٹیشن کے میگافون سے کانوں میں آنے لگیں، وہ علاوہ انگریزی اور مقامی زبان کے اُردو میں بھی۔

اور آگے بڑھے، تو نظر ترکی ٹوپیوں پر پڑنے لگی، خود ہمارے میزبان بڑے سرکاری عہدہ پر ہو کر وہی ٹوپی دیئے ہوئے تھے۔ یوپی میں بھلا ان کی معقول تعداد اب کہاں! بس خال ہی خال کسی کے سر پر نظر آجاتی ہے حد یہ ہے کہ علی گڑھ سے مفقود ہو گئی ہے حالانکہ وہیں کی یہ خاص الخاص علامت تھی اور کانووکیشن کے موقع پر وائس چانسلر کے لباس کا جزو اب بھی ہے۔ اور ترکی ٹوپی تو خیر، طبیعت دنگ رہ گئی یہ دیکھ کر جناح کیپ کا پہننا بھارت ہی کے اس علاقہ میں کوئی جرم نہیں! اچھے اچھے سرکاری عہدیدار تک بے تکلف جناح کیپ پہنے چلتے پھرتے نظر آئے!...... کیا یہ دلیل مدراسی مسلمانوں کی غیر معمولی ہمت و جرأت یا مسلم لیگیت کی ہے؟ جی نہیں۔ ان میں سے کوئی بات نہیں بلکہ اس آزادی کی لم صرف یہ ہے کہ یہاں کی اکثریت تعصب و تنگ نظری کی شکار، اور مسلم کش و مسلم بیزار نہیں۔ مسلمانوں کو اپنے ہی جیسا بھارتی یا ہندوستانی خیال کرتی ہے۔ انھیں ہندوستان کا غدار یا پانچواں کالم نہیں سمجھتی! یہاں کی وزارت شریف، رواداار، وسیع الخیال، فراخ دل قسم کے ہندوؤں کی ہے، سمپورنانندوں اور ترپاٹھیوں کی نہیں...... اور آگے چلیے، سائن بورڈ علانیہ اور بے محابا جناح ریستوران، جناح روڈ، جناح اسٹور قسم کے نظر آنے لگے! یوپی کا مسلمان قدرۃً دنگ و ششدر کہ ان منظروں کو عالم خواب میں سمجھے یا بیداری میں!

یوپی کے مسافر مدراس پر یہ حقیقت پہلی بار مشاہدہ سے کھلی کہ اس بھارت کی کم سے کم ایک اسٹیٹ تو ایسی ہے جس کے طول عرض میں اس گیارہ سالہ آزادی کے دور دورہ میں نہ کوئی مسجد شہید ہوئی، نہ کسی مسجد میں مورتیاں لا کر رکھ دی گئیں، نہ کسی مسجد

کو غیر مسلموں کا مسافر خانہ بنا لیا گیا، نہ کسی تختی سے اردو کے حروف چھیل چھیل کر اور کھرچ کھرچ کر مٹائے گئے، نہ کوئی مہم اردو کشی یا اردو بیزاری کی شروع ہوئی، نہ مسلم اداروں یا اسلامی درسگاہوں کے نام بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے گئے، نہ مسلمانوں کے خلاف دل آزار نعرے کبھی لگے، نہ مسلم آزار جلوس نکالے گئے، نہ اسی لمبی مدت میں مسلمانوں کے خلاف کوئی بلوہ و ہنگامہ یا فساد ہوا، نہ مسلمان عورتوں کی کبھی بے حرمتی ہوئی، نہ مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند ہوئے، نہ ان کی وفاداری و وطن دوستی کو کبھی شک کی نظر سے دیکھا گیا!...... اور نہ مسلم لیگ بلکہ خود پاکستان کا نام لینا کبھی جرم سمجھا گیا!

اللہ اللہ اس بھارت کے اندر علاقے ایسے بھی موجود ہیں! اور نتیجہ قدرۃً یہ ہے کہ یہاں کی اقلیت، اکثریت سے بدگمان و ہراساں نہیں بلکہ اس پر اعتماد کیے ہوئے اور اس کے تمام وطنی معاملوں میں ہم دوش کام کرتی ہوئی تعلیم، تجارت وغیرہ کے اپنے عام مشغلوں میں حسب معمول لگی ہوئی ہے۔

مسجدیں ماشاء اللہ آباد ہیں۔ نمازیوں کی تعداد کے لحاظ سے، اور پر رونق ہیں اپنے ظاہر کے اعتبار سے اور جامع مسجد کا تو خیر کہنا ہی کیا!...... اڈیار کا نام بارہا سنتا تھا۔ ہندوستان ہی کے نہیں، ساری دنیا کے تھیاسوفسٹ گروہ ("ہندو صوفیہ") کا مرکز ہے خیال تھا کہ مضافات مدراس میں کوئی الگ مقام ہوگا۔ آکر معلوم ہوا کہ نہیں عین شہر ہی کے ایک گوشہ میں لب سمندر واقع ہے، جا کر دیکھا کئی میل مربع کا احاطہ ہے عمارتیں سکون خاطر و یکسوئی کی تمام تر مظہر۔ اندر ایک قدیم برگد کا درخت اتنا عظیم الشان کہ اپنی نظیر آپ اور مشہور یہ ہے کہ بیک وقت ۱۰ ہزار آدمی اس کے نیچے بیٹھ کر درس لے سکتے ہیں، گرجا مندر، جین مندر وغیرہ دوسرے مذہبوں کے معبدوں کے علاوہ ایک خوشنما چھوٹی سی مسجد بھی اسی احاطہ کے اندر موجود، مغرب کے وقت میزبان و مہمان اور ایک اور رفیق نے مل کر نماز جماعت یہاں ادا کی، اذان دینے کے بعد ادارے کے بانیوں کی روحوں کو اس سے یقیناً خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔

کام یہاں کرنے کے دو تھے۔ ایک چھوٹا کام، ایک بڑا کام۔ چھوٹا کام یہ تھا کہ یونیورسٹی امتحان کے اردو تین پرچے جو میں نے بنائے تھے انھیں یہاں بورڈ آف ماڈریٹرز کے سامنے پیش کر کے خود بھی اس مجلس میں شرکت کی جائے۔ اس قسم کی مجلسوں کی کارروائیاں ایک دستور سا یہ پڑ گیا ہے کہ پبلک میں نہیں لائی جاتیں، حالانکہ درحقیقت کوئی بات ان میں راز کی یا قابل اخفا نہیں ہوتی، اسی مختصر سی مجلس کے صدر پونا کے پروفیسر بھگوت دیال ورما تھے اور یہ شخصیت خود اس قابل ہے کہ کچھ سطریں تو ضرور اس کے تعارف کی نذر کر دی جائیں...... یہ ان چند ہندوؤں میں ہیں جنھوں نے معلوم ہوتا ہے اپنی زندگی مسلمانوں ہی کے علوم و فنون و ادبیات کے لئے وقف کر دی ہے۔ معمر آدمی ہیں، فرگیوسن کالج پونا میں فارسی اور اُردو کے اُستاد تھے اور اب پنشن کے بعد بھی بدستور اسی کوچہ کی سیاحی میں مصروف ہیں۔ خود فارسی کے ایم اے ہیں الہ آباد یونیورسٹی کے اور ایک عمر اسی وادی کی سیر میں بسر کئے ہوئے ہیں۔ دیوانِ حافظ کے ایک بڑے جزو کو ایڈٹ کر چکے ہیں مع اس کے انگریزی ترجمہ کے اور اسی طرح امام غزالی کے نصیحت نامہ کو بھی۔ حافظ کے کلام کو تو ایک محض ادبی و شعری مشغلہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن غزالی والا کام تو ایک محض دینی و روحانی قسم کی خدمت ہے۔ مجھ سے مراسلت کئی مہینے قبل سے شروع کر چکے تھے اور ان کا ہر خط نہ صرف ان کے علم و نظر کا بلکہ ان کی اخلاقی بلندی اور ان کی سیرت درویشانہ کا نقش دل پر بٹھاتا رہا...... اور مجھ پر کرم اس درجہ کہ میری ہی خاطر سے مجلس کی تاریخیں اتنی موخر کرتے چلے گئے، اور اب جو یہاں ملاقات ہوئی تو سادگی و تواضع میں وہ اندازے سے بھی بڑھ کر نکلے! بس ایک مجسمۂ انکسار و نیاز تھے اور بات کہتے بچھے جاتے تھے۔ مجلس کے تو خیر صدر ہی تھے، اور سن میں مجھ سے کچھ بڑے لیکن ہر معاملہ میں اپنے کو چھوٹوں سے بھی چھوٹا کر کے رکھا اور ان کے اس کمال پر مجھے تو رشک سا آ گیا۔

مجلس کی تاریخیں ۲۱/ اور ۲۲/ کی صبحیں تھیں اور مجلس منعقد یونیورسٹی ہی کے کسی ہال میں ہوئی۔ یہیں ملاقات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے ڈاکٹر عبدالمعید خاں

ایڈیٹر اسلامک کلچر سے ہوئی۔ یہ مصر کے سند یافتہ ہیں اور ادبیات عربی کے ماہر، انگریزی سہ ماہی اسلامک کلچر اپنے رنگ میں منفرد ہے اور حیدر آباد کے موجودہ ہمت شکن ماحول میں اسے نکالے جانا بس انھیں کا دل و جگر ہے...... دوسرے صاحب جن کا ساتھ رہا وہ پروفیسر عبدالوہاب بخاری ایم اے ہیں جو اس وقت پریسڈنسی کالج میں تاریخ کے اُستاد تھے اور اب ان سطور کی تحریر کے وقت مسلمانوں کے نیو کالج کے پرنسپل ہیں۔ یہ اپنے علمی کمالات اور اخلاقی فضائل کے لحاظ سے اس کے مستحق ہیں کہ اگر مستقل مقالہ نہیں تو ایک چھوٹا سا مقالہ تو ضرور ان کی نذر کر دیا جائے۔ چہرہ پر داڑھی اور سر پر ترکی ٹوپی بھی نہیں، جناح ٹوپی، یہ ان کی ملی غیرت و خودداری کے دو نمایاں سائن بورڈ! لیکن ان کی سخت مذہبیت سے مراد ہرگز تعصب یا تنگ نظری نہیں بلکہ دین میں، صلابت ایمانی میں رسوخ اور اسلامی غیرت و حمیت ہے۔ کام میں عزم، سرگرمی اور حسن تدبیر کا جہاں تک تعلق ہے یہ بزرگوار تمام تر ڈاکٹر صاحب ہی کے نقش قدم پر ہیں اور ان کے بہترین و مخلص ترین، رفیق طریق، افضل العلماء بھی شاید انھیں کی طرح علاوہ اپنے فن کے انگریزی تحریر میں بھی برق، حمایت اسلام و شارع اسلام میں ایک موثر انگریزی رسالہ A GLANCE OF THE PROPHET انھیں کے قلم سے شائع ہو چکا ہے۔ بولنے میں بھی لکھنے سے کم نہیں۔ ذی مروّت اتنے کہ جو چاہے پکڑ لے جائے اور تقریر کرا دے، سادگی بے ساختگی اور افراط مروّت کی اداؤں کے لحاظ سے بالکل دوسرے علّامہ گیلانی"...... امتحان گاہ کے علاوہ یوں بھی ان کا ساتھ ایک ہفتہ کے قیام میں بار بار رہا۔ ہر بار ان کی طرف کشش بڑھتی ہی گئی اور دل میں اس کی آرزو کرتا رہا کہ ان کی جگہ تو علی گڑھ تھی۔ اس مرکزی ادارہ میں یہ اگر زیادہ عرصہ تک نہیں دو ہی چار برس بطور وائس چانسلر رہ آئیں تو ان شاء اللہ وہاں کی بگڑی ہوئی فضا بن جائے اور علمی، دینی و اخلاقی علی گڑھ ہر پہلو سے ایک اصلاحی انقلاب سے روشناس ہو جائے...... ڈاکٹر عبدالحق کو لوگ جنوبی ہند کا سر سیّد کہتے ہیں۔ لیکن سر سیّد کا ضمیمہ ایک محسن الملک بھی ہوتے ہیں۔ سر سیّد وقت کو یہ محسن الملک عصر خوب ہاتھ

آگیا۔ ایثار، پختہ ایمانی فہم و فراست سب میں اپنے بلند پایہ رفیق کے قدم بہ قدم۔

دوسرا اور اہم تر کام "سیرۃ النبی ﷺ قرآن مجید کی روشنی میں" کے عنوان پر لیکچر دینے کا تھا۔ فرمائش ۶ لیکچروں کی تھی وقت کی تنگی کے باعث لیکچر پورے چھ تو نہیں، پانچ ہی تیار ہو پائے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے انھیں کو کافی خیال کیا۔ پہلا لیکچر ۲۱ جنوری سہ پہر کو بعد عصر رکھا گیا۔ یہ تین بابوں میں تقسیم تھا۔ عنوانات تھے:

(۱) ظہور کی پیش خبریاں

(۲) نام، نسب، وطن، زمانہ

(۳) ہجرت

وقت سہ پہر کا رکھا گیا تھا، بعد عصر شروع ہوا اور مغرب کے وقت ختم ہو گیا۔

لیکچروں کا مقام نیو کالج کا بالائی ہال رکھا گیا تھا اور پردہ نشینوں کے لئے انتظام الگ تھا۔

خیال یہ تھا کہ ایسے خشک لیکچر کو سننے آئے گا کون شاید دس بیس لوگ اکٹھے ہو جائیں لیکن سامعین کی تعداد توقع و اندازہ کے خلاف اچھی خاصی نکلی۔ دہائیوں کی نہیں ابتدائی سینکڑوں کی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ سننے والوں نے سنا بڑی توجہ و دلچسپی سے...... معلوم یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے خود یہاں تقریریں کر کر کے مذہبی جلسوں میں آنے والی پبلک کے مذاق کو بھی بلند اور علمی بنا دیا ہے اور لوگ بجائے جذباتی اور محض لطیفوں اور چٹکلوں والے بیان کے علمی، واقعاتی اور کام کی تقریروں کو زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔

بعد کے لیکچر، بجائے بعد عصر کے بعد مغرب ہوتے اور کوئی گھنٹے گھنٹے بھر میں ختم ہوتے رہے۔ پہلا لیکچر تو میں نے خود پڑھا، باقی چار لیکچر میری محنت اور زحمت بچانے کے لئے جناب صدر، یعنی خود ڈاکٹر صاحب بڑے شستہ طریقہ سے پڑھ کر سنا دیا کرتے، یہ چار لیکچر مختلف بابوں میں تقسیم تھے اور عنوانات تھے:

......بشریت و رسالت۔

......غزوات و محاربات۔

......معاصرین = (۱) مشرکین (۲) اہل کتاب (۳) منافقین (۴) مومنین

معجزات و دلائل۔

فضائل و خصائل۔

......ازدواجی و خانگی زندگی۔

......اختتامیہ۔

سامعین میں قدیم و جدید دونوں گروہ ہوتے تھے اور اہل سنت کے علاوہ کچھ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی پابندی سے آنے والے اور بھی متعدد حضرات تھے۔ نام صرف ایک صاحب کا یاد رہ گیا، حاجی نذیر حسین صاحب صدر نیو کالج کمیٹی و صدر ساؤتھ انڈین ایجوکیشنل ایسوسی ایشن۔

آخری دن اختتامیہ کے بعد کا منظر بڑا موثر تھا، محبت کرنے والے سادہ دل مسلمانوں نے چاروں طرف سے مقرر کو گھیر لیا اور فرط عقیدت سے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگانے لگے۔ مقرر خود بھی اس مظاہرہ محبت و حسن ظن سے مغلوب و متاثر ہو کر بے اختیار آنسو بہانے لگا...... محبت فی اللہ اور الحب للہ ہوتی ہی ایسی موثر ہے!

بال بال اپنے میزبان کا ممنون کرم ہوں۔ سو خاطروں کی ایک خاطر ان کی طرف سے یہ تھی کہ میرے جذبات کی رعایت اور میرے حفظ اوقات کا پاس انھوں نے اتنا کیا کہ بایدوشاید۔ کچھ یہ نہ تھا کہ ملنے والے نہ آئے ہوں، محبوں اور قدر افزوں کی کمی کی شکایت مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ شکایت ان کی کثرت کی ہے، کم و بیش وہی صورت یہاں بھی رہی۔ خدا معلوم کتنوں نے ملنا یہاں بھی چاہا۔ ڈاکٹر صاحب سب کو خوش اسلوبی سے ٹال لے گئے صرف گنتی کے چند صاحبوں کو مجھ تک پہنچنے دیا۔ وہ بھی میرا رخ پا کر اور مدت ملاقات کی پابندیوں کے ساتھ۔ کئی صاحب تاجر تھے۔ دو ایک مولوی

صاحبان تھے۔ اہل حدیث واہل بدعت دونوں قسم کے۔ ایک صاحب دکن ٹائمز کے سابق ایڈیٹر اور مالک عبدالمجید حسن صاحب تھے جن سے ملنے کا میں خود مشتاق تھا۔ قاضی حبیب اللہ صاحب بیچارے علیل وصاحب فراش تھے کوئی آپریشن ہوا تھا۔ ان کی عیادت کے لئے لے گئے۔ ایک اہل حدیث مولوی عبدالباری نامی تھے۔ ان سے ملاقاتیں برابر ہوتی رہیں۔ اعظم گڑھ کے مولانا ابوالجلال ندوی مدت دراز کے بعد یہاں ملے، مدرسہ جمالیہ میں مدرس ہیں اور اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ بلاوے بنگلور اور میسور سے بھی اصرار کے ساتھ پہنچتے رہے، زبانی بھی اور تحریری بھی بلکہ ایک صاحب نے تو آمدورفت کے لئے ہوائی جہاز بھی پیش کر دیا۔ بنگلور سے اردو کے مشہور کارکن و صحافی اور شاعر امامی صاحب نے خوش وقت کیا۔ کلام اور گفتگو دونوں سے اپنے وقت کے مولانا ظفر علی خاں نظر آئے۔

منظر یہاں کے قابل دید ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سب کہیں گھومنے پھرنے کی فرصت کسے تھی۔ صرف ساحل سمندر دیکھنے کا اتفاق ہوا بڑا دلکش نظارہ ہے۔ قدرت خداوندی کا لاثانی نمونہ بمبئی اور کراچی کے سمندر اس سے قبل دیکھنے میں آچکے تھے اپنے کو یہاں کا منظر بہت زیادہ پرہیبت معلوم ہوا۔ مسجد والا جاہی بھی دیکھنے کے قابل تھی جس کے متصل ایک مستقل خطۂ صالحین ہے، ابرار و شیوخ کا مدفن۔ اور یہیں ایک قطعۂ خاک میں حضرت بحرالعلوم ملا عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی اور ملا عبدالرب کے جسم آسودہ ہیں۔ عالی مرتبت میزبان ایک سہ پہر کو اس چمن بے خزاں کی سیر کرانے لے گئے۔ دل بحرالعلوم کی دینی عظمت اور علمی خدمات کا خیال کر کے خاص طور پر اثر لیتا رہا۔ وقت بہت اچھا کٹا...... کسے خبر تھی کہ پورے دو مہینے بھی نہ گزرنے پائیں گے کہ یہی آج کا تندرست، ہشاش بشاش میزبان اسی خطۂ صالحین میں آکر زیر زمین مقیم ہو جائے گا اور اُمت کی صف میں ایسا خلا پیدا کر جائے گا جس کا پُر کرنا آسان ہرگز نہ ہو گا۔

جس خانگی حادثہ کی اطلاع مدراس میں قدم رکھتے ہی ملی تھی، اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ دل تمام تر ادھر لگا ہوا تھا، یہ فکر بھی برابر سوار تھی کہ اپنے حقیقی اکلوتے بھائی کی

بالکل اچانک خبر وفات پا کر خدا معلوم بیوی پر کیا گزری جو شروع ہی سے اختلاج زدہ بھی ہیں، مگر جلد دریافت حال کی شکل کیا تھی سوا اس کے ٹیلیفون سے لکھنؤ ٹرنک کال کیا جائے، دوسرے دن شام کو میزبان سے ذکر کیا اور ہر مشکل کی طرح یہ مشکل بھی اسی وقت حل تھی۔ رات کو دس بجے کے قریب اپنے ساتھ مدراس ریڈیو اسٹیشن لے گئے وہاں سے فوراً ایکسچینج کو ٹرنک کال کے لئے فون کیا۔ مدراس سے لکھنؤ براہ راست کوئی سلسلہ نہیں، دہلی ہو کر رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ غرض یہ مرحلے طے ہوئے اور کوئی آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد لکھنؤ سے رابطہ قائم ہوا۔ خود اگر ساتھ نہ ہوتے تو بجائے آدھے گھنٹے کے دو گھنٹے تو ضرور ہی لگ جاتے۔ ممبر پبلک سروس کمیشن کی آواز کا اثر ہی کچھ اور تھا، لیکن اثر محض عہدہ ہی کا نہ تھا، عہدہ سے زیادہ شخصیت کا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ریلوے اسٹیشن وغیرہ ہر جگہ یہی اندازہ ہوا کہ میزبان کے عہدہ سے زیادہ ان کی شخصیت کام کر رہی ہے۔ عجب محبوب وجاذب شخصیت پائی تھی اور یہ محبوبیت یوں ہی اور خواہ مخواہ نہیں حاصل ہو گئی تھی، یہ نتیجہ تھا بے لوث خدمت خلق کا! ایک صرف طالب علموں ہی کو لے لیجئے کسی کی فیس معاف کرا دی کسی کو اپنے پاس سے پڑھوا دیا، کسی کا سفارش کر کے داخلہ کرا دیا اب وہ طالب علم عمر بھر کے لئے ممنون احسان ہو گئے اور ان میں سے کوئی ریلوے میں ہے کوئی ریڈیو میں، کوئی وکیل، کوئی تاجر، غرض ہر محکمہ، ہر شعبہ زندگی، ان کے شاگردوں یا ان کے احسان مندوں سے بھرا ہوا۔ "ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شد" کی زندہ تفسیر!...... اور یہی بات اس سے قبل حکیم اجمل خاں مرحوم دہلوی اور مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ میں ملی تھی۔

فون پر لکھنؤ میں لڑکی ملی۔ وہ بے وقت اور بالکل اچانک مدراس کے ٹرنک کال کا نام سن کر خود گھبرائی ہوئی تھی۔ بہر حال دو تین منٹ گفتگو رہی اور حالات سن کر تسلی حاصل ہوئی۔ لکھنؤ اور مدراس کے درمیان آواز دہلی ہو کر بہت صاف نہ تھی۔ مشکل ہی سے اور بہت کان لگانے کے بعد ہی سنائی دیتی تھی تاہم ادائے مطلب کی حد تک کام نکل گیا اور فریقین فی الجملہ مفہوم ایک دوسرے کا سمجھ گئے...... یہ ٹیلیفون تو بہر حال

ایک مادی ایجاد ہے اور ٹرنک کال کے لئے بڑی پیچیدہ مشینری اور چھوٹے بڑے کتنے مادی آلات اور میکانکی وسائل کی محتاجی رہتی ہے جن کا انتظام صرف سلطنتیں ہی کر سکتی ہیں اور پھر کوہ کندن کے بعد کاہ بر آوردن ہی، یعنی دائرہ عمل میں محدود در محدود لیکن خود قلب میں اگر مناسبت علوم انبیاء کے ساتھ پیدا ہو جائے تو اس سے ہزار درجہ عجیب تر، عمیق تر، وسیع تر، معلومات و مکشوفات حجرہ کے اندر بیٹھے ہوئے کسی مادی واسطے کے بغیر حاصل ہونے لگیں۔

بنی اندر خود علوم انبیاء

بے کتاب و بے معید و اوستا!

یہ مکاشفے اگر علوم الٰہیہ و شرعیہ سے متعلق ہوں جب تو کیا کہنا مناسبت نفوس قدسیہ انبیاء سے پیدا ہو جائے لیکن اگر رسائی یہاں تک نہ ہو صرف علوم تکوینیہ تک محدود رہے جب بھی ایک نعمت ہی ہے۔

ذاتی صدمہ کا اثر قلب پر بہر حال تھا ہی، گو اس کا خاصہ اہتمام تھا کہ اس کا اظہار و اعلان نہ ہونے پائے۔ میزبان نے اس کو بھی تاڑ لیا تھا، چائے وغیرہ کے لئے جب بھی پاس آکر بیٹھتے تو اس سے ملتے جلتے خانگی حادثے اپنے اور دوسروں کے سناتے رہتے...... تعزیت کا یہ بالواسطہ طریقہ براہ راست سے زیادہ حکیمانہ تھا۔

مدراس والے کھلانے پلانے دعوت اور میزبانی کرنے میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں، لیکچروں کے اشتہار، پوسٹر، شائع ہوتے رہتے تھے۔ شام کو لیکچروں کے وقت پڑھے لکھوں کا مجمع بھی اچھا ہو جاتا تھا۔ اگر ادھر سے ذرا ڈھیل مل جاتی تو دعوتوں، ضیافتوں کا سلسلہ صبح و شام شروع ہو جاتا اور یوں چل پڑتا کہ گھر پر کھانے کی نوبت ہی شاید نہ آتی۔ میزبان نے میرا رخ دیکھ کر کسی کو اس کا منہ ہی نہ دیا۔ جب چوتھا لیکچر ہو گیا اور قیام کا پانچواں دن ختم تھا تو شب میں ایک دعوت نیو کالج اور جنوبی ہند تعلیمی انجمن کے دونوں کے صدر حاجی نذیر حسین صاحب کے ہاں منظور کر لی گئی۔ یہ حاجی صورۃً "صاحب" ہیں ماشاء اللہ دیندار مسلمان ہیں، چمڑے کی تجارت کرتے ہیں

اور شہر کے ایک تاجر اعظم ہیں۔ ہر لیکچر میں پابندی کے ساتھ شروع سے آخر تک موجود رہتے اور توجہ و دلچسپی کے ساتھ سنتے۔ رہنے والے قصور (علاقہ پنجاب) کے ہیں اور مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے عزیز قریب۔ ایسے مخلص کی دعوت قبول کرنے میں تامل ہی کیا ہو سکتا تھا تامل کیا معنی یہ موقع تو بسر و چشم قبول کرنے کا ہوتا ہے...... لیکچر کے بعد سیدھے وہیں گئے۔ رہتے ذرا فاصلہ پر ہیں۔ نمبر ۵ وِپری ہائی روڈ، کوٹھی دیکھی تو ماشاء اللہ دلہن بنی ہوئی۔ خوب آراستہ و لق ودق (جب کسی بڑے اور کامیاب مسلمان تاجر سے ملاقات ہوتی ہے تو طبیعت اندر سے کھل اٹھتی ہے اور مدراس میں بحمد اللہ ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں) دعوت میں صرف چند لوگ تھے اور یہ میرے مذاق کی رعایت سے بہت بڑی اور اہم چیز تھی۔ میزبان اور مہمان خصوصی ملا کر کل بارہ آدمی تھے۔ ملاقات اور بے تکلف گفتگو کا لطف صرف ایسی ہی مختصر تعداد میں رہ سکتا ہے ورنہ پھر تو مجمع ہو جاتا ہے اور تکلفات پبلک تقریب کے شروع ہو جاتے ہیں۔

حاضرین میں سے دو چار نام خصوصیت سے یاد رہ گئے۔ ایک آنریل بشیر احمد سعید صاحب ایم اے، ایل ایل بی جج ہائی کورٹ مدراس، ان سے نیاز پہلے لیکچر میں حاصل ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے خاص رفیقوں میں ہیں، اور یہاں کے سارے اسلامی اور ملی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسرے جناب محی الدین صاحب ایم ایل اے متولی مدرسہ جمالیہ مدراس و صدر جمال محمد کالج کمیٹی ترچناپلی۔ تیسرے عبدالمجید صاحب بی اے سیکرٹری جنوبی ہند تعلیمی انجمن۔ ان کے علاوہ دو ایک اور پنشنر عہدیدار تھے اور ایک تاجر اور ایک ڈاکٹر اور ان سب کے علاوہ پروفیسر عبدالوہاب بخاری، ہمارے ڈاکٹر صاحب کے رفیق خاص الخاص۔ بے تکلف صحبت تھی سب سے کھل کر باتیں رہیں ...... اور کھانے کے نفیس و اعلیٰ ہونے کا کہنا ہی کیا۔ حاجی صاحب کی مشرقیت و مغربیت کے امتزاج کا رنگ کھانے میں بھی نمایاں تھا۔ واپسی قدرۃً ذرا دیر کر کے ہوئی۔ اور جسٹس سعید صاحب اپنی گاڑی پر ہم لوگوں کو اُتار گئے، دوسرے موقعوں کی طرح یہاں بھی گفتگوؤں سے اندازہ ہوا کہ وہ ہندو مسلم کشمکش جو شمالی ہند

میں برپا ہے اور جس جارحانہ و متعصب ہندویت کا شکار ہم لوگوں کو یوپی میں بنا رہنا پڑتا ہے اس کا یہاں جنوبی ہند میں کہیں پتا بھی نہیں۔ یہیں ملاقات جماعت تبلیغی کے ایک گشتی دستے سے ہو گئی جو اتفاق سے وارد ہو گیا تھا۔ ۸، ۱۰ آدمی تھے۔ سب اپنے اسی رنگ میں مست، دور دور سے آئے ہوئے بعض تو بڑے صاحب فہم و تدبیر نظر آئے۔

پانچواں اور آخری لیکچر ۲۵ر جنوری کو اوّل شب میں ختم ہوا اور آج ہی یہاں سے روانہ ہو جانا تھا، سرکاری رقمیں وصول بڑی دیر میں ہوتی ہیں اور درمیانی مرحلے بل بنا کر بھیجنے ان کے پاس کرانے وغیرہ کے دشواریوں سے طے پاتے ہیں۔ برسوں کے تجربے کے خلاف یہاں کوئی دقت نہیں ہوئی اور جو رقم بھی واجب تھی بلا کھٹکے دن ہی میں وصول ہو گئی۔ یہ سب انھیں ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفیق خصوصی پروفیسر بخاری کے حسن کارکردگی سے۔ آخری لیکچر کے بعد کالج ہال۔ سے رخصتی کا سماں بڑا موثر تھا۔ خوش عقیدہ مسلمان لیکچرار پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ جیسے کسی بزرگ کو اس کے معتقدین دست بوسی کے لئے گھیر لیتے ہیں! اخلاص و اخوت کے اس بے پناہ مشاہرہ پر دل بھر آنا قدرتی تھا، خیر خوب رُو رلا کر یہاں سے نکلنا ہوا۔

اس ۵، ۶ دن کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ ان کے گھر والوں نے، لڑکوں اور بچیوں نے سب نے اپنی محبت و افراط خدمت سے دل موہ لیا تھا۔ انھیں خدا حافظ کہتے وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واپسی پردیس سے نہیں بلکہ جدائی وطن سے ہو رہی ہے! ایک دن کے لئے ٹھہرنے کا وعدہ ڈاکٹر صاحب کے وطن کرنول (آندھرا) کے لئے ہو چکا تھا رخ اس وقت اپنے وطن نہیں ڈاکٹر صاحب کے وطن کی طرف تھا۔

صورت حال کا تقاضا طبعی طور پر اس وقت یہ تھا کہ وطن جلد سے جلد پہنچا جائے اور اپنی بیوی، ان کی والدہ اور مرحوم کی بیوی بچوں سے تعزیت کی جائے۔ ایک دن کیا معنی ایک ایک گھنٹہ بھاری ہو رہا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے وطن کی کشش بھی کچھ کم نہ نکلی۔ ڈاکٹر صاحب مع اپنے بڑے صاحبزادہ میاں انوار الحق ایم-اے کے (جو کسی کالج

میں لیکچرر ہیں) خود بھی ساتھ چل رہے تھے۔ بلکہ وہی تو مجھے لئے چل رہے تھے۔ اس لئے ٹکٹ کا سارا انتظام انھیں کے سر رہا۔ اور دل ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب کے بار کرم سے ممنون اور مجوب ہوا۔ اسٹیشن خدا حافظ کہنے صرف دو تین مخلصین خصوصی آئے۔

نو بجے کے بعد ہم لوگ اسٹیشن آئے اور ساڑھے ۹ بجے بمبئی میل واڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت دل نے خوشی سے نوٹ کیا کہ اسٹیشن کے اناؤنسر (اعلانچی) کی آواز علاوہ انگریزی، تامل وغیرہ کے اُردو میں بھی آئی!

مدراس تک پھر غنیمت تھا، سفر کرنول کا تو خیال تک کبھی نہیں آیا تھا۔ آخر کیا صورت اس کی ہو گی کہ کرنول جیسے دور افتادہ اور غیر مرکزی مقام کا سفر وہ بھی اس سن میں پہنچ کر کرنا ہو گا؟ لیکن وہ حکیم مطلق جس نیست کو چاہے آن کی آن میں ہست کر دکھائے اور جس مستبعد کو چاہے ناگزیر بنا دے! یہاں اسباب و حالات ہی ایسے اکٹھے ہو گئے...... نماز فجر ریل ہی میں ہوئی۔ اور ۲۶ر جنوری کا سورج طلوع ہو رہا تھا کہ ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور ہم لوگ کرنول کے لئے اُترے، ناشتے کا انتظام بھلا ڈاکٹر صاحب جیسے خوش انتظام کیسے نہ رکھتے، کچھ دیر بعد ناشتہ کر کرا یہاں سے روانہ ہوئے۔

کرنول شاید ۷۰، ۸۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔ لاری آتی جاتی ہے، ملازم کو سامان سمیت اس پر جگہ ملی، ہم لوگوں کے لئے خصوصی انتظام کار کا تھا، ڈاکٹر صاحب میرے پہلو میں اور صاحبزادے کار چلانے والے، طبیہ کالج کرنول کے ایک طالب علم بطور رہنما۔ ہمراہ چلتے چلتے کچھ پہاڑی اور کچھ میدانی علاقے کے ہر پیچ و خم سے گزرتے اور قدم قدم پر اس طرح کے زندگی کے نشیب و فراز کو یاد کرتے کراتے، کوئی ۱۰، ساڑھے ۱۰ پر کرنول پہنچ گئے۔ کرنول کچھ دن کے لئے آندھرا صوبہ کا دارالحکومت بھی رہا تھا۔ اس لئے علاوہ پرانی آبادی کے نئی سرکاری عمارتوں کا ایک پورا شہر کا شہر آباد! حد نظر تک یہی سلسلہ اور اس کے بعد پھر ایک خاصا شہر خود ڈاکٹر عبدالحق کا آباد کیا ہوا!...... عثمانیہ ڈگری کالج، دارالعلوم عربی، یونانی طبی کالج، یہ بورڈنگ وہ بورڈنگ، ادھر لائبریری، اُدھر دواخانہ، اِدھر میوزیم اُدھر مسجد، درسگاہوں اور ان کے متعلقات کا ایک پورا جال

بچھا ہوا، اجنبی نووارد تو انھیں دیکھ کر ہی چکرا جائے۔ سرسری نظر میں تفصیل و تعداد یاد رکھنا کس کے بس کی بات ہے! ظاہری آب و تاب میں اگر اس سرکاری شہر کے ٹکر کا نہیں تو اللہ کے ایک مخلص و خاکسار بندے کا بسایا ہوا شہر گرمیٔ اخلاص و رونق حیات میں کچھ اس سے کم بھی نہیں! بقول حضرت جوہرؒ ؎

میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد!

حق تو یہ تھا کہ اس کا نام "عبدالحق نگر" رکھ دیا جاتا۔

کالج کا نام "عثمانیہ کالج"! ۱۹۴۸ء کی تسخیر حیدر آباد کے بعد یہ نام رکھنے کی جرأت ڈاکٹر عبدالحق ہی کا حصہ تھا! پرنسپل صاحب بڑھ کر ملے۔ ۴۵ سال قبل کا تعارف یاد دلایا۔ معلوم ہوا کہ ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ میں اسی ہوسٹل میں یہ بھی تھے! آدمی بات چیت سے اچھے معلوم ہوئے، ڈاکٹر صاحب دیانت، کام کی اہلیت اور فرض شناسی کی تعریف پہلے کر چکے تھے۔ گشت کر کے دیکھا جن مقامات کو دیکھا جا سکا۔ "لائبریری" دواخانہ وغیرہ...... اور ہر چیز خوب اُجلی ستھری، باقاعدہ پائی۔ ڈسپنسری کے انچارج ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سادگی میں افضل العلماء ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے، مسجد کو جا کر دیکھا جہاں محترم میزبان کے والد ماجد اور وقت کے مشہور فاضل و مجاہد مولانا محمد عمرؒ آسودہ خاک ہیں (وفات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا دس ہی بارہ برس ہوئے ہوں گے) اس معمولی سے غریبانہ مکان کو جا کر دیکھا جہاں ڈاکٹر عبدالحق کی پیدائش ہوئی تھی اور پھر اس سادہ کمرہ کو بھی آ کر دیکھا جہاں یہ اونچا سرکاری افسر مدراس کی پر تکلف کوٹھی میں رہنے سہنے کا عادی، اب بھی کبھی کبھی آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ اس کمرہ کا سادہ قصباتی قسم کا فرنیچر، اچھا خاصا دعوت فکر و بصیرت دیتا معلوم ہوا...... دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے، لڑکوں کی آمد و رفت، استادوں کی ملاقات ہر شے سادگی، بے تکلفی کے معیار کے مطابق رہی۔ بار خاطر کہیں سے بھی نہ ہونے پائی اور نہ کوئی ہجوم و مجمع ہونے پایا۔ لوگ آتے لڑکے اور بڑے دونوں اکٹھے ہونے لگتے۔ ڈاکٹر صاحب ہر

مرتبہ کسی حکمت عملی سے سب کو ٹال دیتے۔

مطالبہ اور اصرار شروع ہوا کہ یہاں بھی کوئی لیکچر دیا جائے (ایڈرس کے پیش ہونے کی تو قطعی ممانعت پہلے سے کی جا چکی تھی) اس کا حل فہیم و فریس میزبان نے یہ نکالا کہ انھیں تازہ مدراسی لیکچروں کا مجموعہ جو ہمراہ ہے ان میں سے ایک لیکچر یہاں بھی پڑھ کر سنا دیا جائے، بلکہ خود ہی میری طرف سے عثمانیہ کالج ہال میں پڑھ کر سنا بھی دیا۔ مجھے کرنا جو کچھ پڑا وہ صرف یہ کہ اس ہال تک جانا اور وہاں ڈائس پر خاموش بیٹھا رہنا پڑا!...... میزبان کی انھیں اداؤں نے تو شروع سے آخر تک ان کا گرویدہ مجھے بنائے رکھا، مخلصین تو پھر بھی اچھی تعداد میں مل جاتے ہیں لیکن ایسے صاحب فہم، مزاج شناس مخلص جو مہمان کے مذاق کی رعایت قدم قدم پر رکھیں اور اپنی مرضی پر اس کی خوشی کو غالب رہنے دیں، بس شاذ و نادر ہی کہیں نصیب ہوتے ہیں، ورنہ عموماً تو اس کی حسرت ہی رہ جاتی ہے!

مردم اندر حسرت فہم درست

اتفاق سے آج شب میں کالج کے طلبہ کا سالانہ ڈنر تھا۔ رات کو کھانا وہیں کھایا اور ہر طرح خوش واپس ہوا۔ گیا تھا ڈرتے ڈرتے لیکن ایک چیز بھی خلاف مذاق پیش نہ آئی، نہ شور و شغب، نہ کسی قسم کی کشمکش اور چپقلش، سینکڑوں مہمانوں اور پھر طالب علموں کے ہجوم میں اتنا نظم و سلیقہ قائم رکھنا آسان نہ تھا، اور کھانوں کی لذت کو تو بس پوچھئے ہی نہیں خیال ہی نہ تھا کہ ایسا لذیذ و نفیس کھانا بجز لکھنؤ کے اور بھی کہیں کھایا جا سکتا ہے! خصوصاً جنوبی ہند کی طرف سے خاصی بدظنی جمی ہوئی تھی وہ سب ایک ڈنر نے کافور کر دی۔ ڈنر ہی پر ملاقات شہر کے حاکموں افسروں سے رہی، غیر مسلم بھی تھے مگر سب مہذب و شائستہ۔

رات کے دس بجے تھے کہ اسٹیشن آ گئے۔ کرنول اسٹیشن چھوٹی لائن پر واقع ہے اور یہ گاڑی حیدر آباد پر ختم ہوتی ہے۔ کرنول سے لکھنؤ آنے کے لئے اس کے سوا کوئی

اور راستہ ہی نہ تھا اور اسی لئے حیدر آباد ہو کر گزرنا پڑا، ورنہ حیدر آباد تو ایک منزل مقصود کا درجہ رکھتا تھا اسے خواہ مخواہ محض رہ گزر کی حیثیت دینے پر طبیعت آمادہ کیونکر ہو سکتی تھی!...... آج کے بھی ریل کے سارے انتظامات ڈاکٹر صاحب ہی کے سر تھے اور سب بحسن و خوبی انجام پاگئے۔ گاڑی جب چھوٹنے پر ہوئی اور دس بیس انسانوں کے مختصر سے مجمع کے ساتھ ڈاکٹر صاحب خود بھی رخصت ہونے لگے تو ان کی مسلسل عنایتوں اور پیہم نوازشوں سے متشکر و متاثر قلب نے رخصتی مصافحہ کے ساتھ اجازت صرف اس دعا کی زبان کو دی کہ

"اللہ آپ کے اخلاص کو قائم و برقرار رکھے!"

...... دعا سرسری اور بے معنی نہ تھی۔ چند روز کی یکجائی سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی مرجعیت کی کوئی حد نہیں اور ان کی محبوبیت قابل رشک حد تک ہے، حاضر و غائب ہر شخص ان کا شکر گزار اور ان کا مدح گو۔ یہ مدح خلق کا فتنہ دنیا کے سخت ترین فتنوں میں سے ہے۔ اچھا ہے کہ ہر نیک نفس انسان کے پیچھے کچھ لوگ پڑے رہیں اور کچھ معاند اس پر مسلط رہیں، نفس اسی سے اصلاح پاتا رہتا ہے ورنہ یکسر مدح و تحسین تو نفس کو غفلت میں غرق کر دینے اور غارت کر ڈالنے کے لئے بالکل کافی ہے، انسان کی اپنی طرف سے غفلت بھی شیطان کی سب سے بڑی شکار گاہ ہے!

وہ رخصتی ملاقات اور الوداعی مصافحہ کون جان سکتا تھا کہ اس فرشتہ صفت انسان سے اس عالم ناسوت میں آخری مصافحہ ہے! یہ قلم مبالغہ کا عادی نہیں اور فرشتہ صفت کا لفظ یونہی بے خیالی میں نہیں نکل گیا۔ اتنے صفات اور اتنے کمالات کا جامع میں نے اپنے تجربہ میں بہت کم کسی کو پایا ہے۔ بعض میں خوبیاں بیشک بہت پائی گئیں لیکن ساتھ ہی بشریت کی شدید نمایاں کمزوریاں بھی شامل رہیں۔ ان مرحوم میں چند روز کے سابقہ کے اندر کوئی چیز ایسی نہ ملی جسے ان کے اخلاقی بہی کھاتے میں بجائے نفع کے خانے کے خسارہ کے خانے میں ڈالوں! عجیب و غریب شخصیت تھی۔ ہر طرح متوازن، اس وقت ملت مرحوم کے اندھیرے گھر کا چراغ! افسوس ہے کہ ملت اپنے اس محسن کی

پوری قدر نہ پہچان سکی اور قبل اس کے کہ وہ عمر طبعی کو پہنچ کر زیادہ سے زیادہ خدمات کا خزانہ اُگل سکیں خود انھیں کو واپس بلالیا!

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

دینی معاملات میں لوگ یا تو اتنے کٹر ملتے ہیں کہ ہر قدامت کو حقیقت کا مرادف سمجھتے ہیں، اور حال کی اعلیٰ سے اعلیٰ تحقیقات کی طرف توجہ کرنا معصیت سمجھ بیٹھتے ہیں، اور یا پھر ایسے کہ روشن خیالی پر آئے تو رطب و یابس ہر جدید شے کو نگلتے ہی چلے گئے، یہ بات صرف نادر شاہ افغانی شہید (ظاہر شاہ موجودہ فرمانروائے افغانستان کے والد مرحوم) کے بارے میں سننے میں آئی تھی کہ ایک طرف وہ بڑے راسخ دیندار تھے اور دوسری طرف ہر جدید اصلاح کے لئے انؔ کا دل کشادہ تھا۔ اپنے جاننے والوں میں یہ وصف صرف انھیں مرحوم میں پایا تھا، بہرحال کوئی مانے یا نہ مانے اپنی شہادت تو اِس عالم سے لے کر اُس عالم تک بس وہی رہے گی جو کچھ اپنی آنکھوں کو نظر آچکی ہے۔

مدح تو حیف ست باز ندانیاں   گو ئم اندر مجمع روحانیاں!

چھوٹے ڈبے (کوپے) میں کوئی اور مسافر نہ تھا، صبح کے قریب ایک ہندو صاحب انگریزی سوٹ میں ملبوس آئے۔ بعد نماز فجر ان سے گفتگو شروع ہوئی۔ قدرۃً انگریزی میں معلوم ہوا کہ ریلوے ہی کے کوئی عہدیدار ہیں، تلنگانہ کے رہنے والے اور کرکٹ کے مشہور کھلاڑی نائیڈو کے ہم خاندان۔ اس کے بعد ان سے جو سوال و جواب ہوئے وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

آپ کی مادری زبان تو تلنگی ہو گی؟

جی ہاں تلنگی اور اُردو۔

اچھا؟ اردو بھی؟ نہ کہ ہندی؟

جی نہیں، ہندی تو میں لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا، سارا کام اُردو میں بے تکلف کرتا ہوں۔ اس کے بعد گفتگو اُردو میں ہونے لگی اور واقعی وہ خوب شستہ اُردو بول رہے

تھے، ہندی سے سخت بیزار تھے۔ بولے کہ ہم سب لوگ اردو پر جان دیتے ہیں اور ہندی کو اپنے حق میں ایک مصیبت سمجھتے ہیں...... جی بے اختیار چاہا کیا کہ کاش ہمارے یوپی کے وزیرِاعلیٰ بہادر ہم سفر ہوتے اور اپنے کانوں سے ایک غیر مسلم دکھنی کے یہ بیانات سن لیتے! کرنل نائیڈو کے نام سے ذہن قدرۃً اس قبیلہ کی ایک دوسرے شاخ کی مشہور و معروف مسز سروجنی نائیڈو کی طرف منتقل ہوا۔ بیچاری کا وقت موعود اگر نہ آگیا ہوتا اور لکھنؤ کی خاک میں ۱۹۴۹ء میں نہ مل چکی ہوتیں تو اُردو کی جان پر خاص لکھنؤ ہی کی سرزمین پر یہ ستم ٹوٹتے دیکھ کر عجب نہیں کہ خود ان کا جگر بھی شق ہو گیا ہوتا! "تسخیر حیدر آباد" سے ان کے شریف قلب نے جو اثر لیا تھا وہی کیا کم تھا۔

۲۷ر کی بعد نماز فجر صبح قریب تھی کہ بلدہ حیدر آباد کا سواد شروع ہو گیا اور تصور کے سامنے ۴۱ سال قبل کی یادداشتیں ہجوم کرنے لگیں۔ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کی صبح تھی کہ اسی طرح چھوٹی لائن سے براہ راست اورنگ آباد آتے پہلے پہل حیدر آباد کا سواد شروع ہوا تھا۔ مگر جب کیا تھا اور اب کیا ہے! اس وقت اپنی صبح زندگی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، آج اپنی شام زندگی کی شفق پھول رہی ہے۔ ہر سانس میں ایک تازگی تھی۔ ہر جنبش میں ایک امنگ تھی، کن کن آرزوؤں کیسی کیسی تمناؤں کے ساتھ حیدر آباد کا نام زبان پر آتا تھا۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

وہ دن سارے کے سارے خواب و خیال ہو گئے اور اپنے پیچھے حسرتوں کا ایک انبار دل کے داغوں کا ایک طومار چھوڑ گئے! کتنی آرزوؤں کا مرجع تو ایک اپنا ہی جیسا انسان تھا۔ "اعلیٰ حضرت" "قدر بندگان عالی، مظفر الملک والممالک" "ہز اگزالٹیڈ ہائینس" جی سی ایس آئی، وفادار سلطنت برطانیہ اور خدا معلوم اور کیا کیا! کتنے القاب، کتنے خطابات انسان ہی نے ایک انسان کے لئے گڑھ لئے تھے! ہزارہا میل مربع علاقہ کا مالک و مختار لاکھوں نہیں کروڑوں "رعایا" کا "خدائے مجازی" زندہ وہ آج ہے لیکن ہر خلعت شاہی و سرداری سے معرا۔ حاکم بڑا کیا معنی، اب چھوٹا بھی نہیں! گورنر اور راج پرمکھ

بھی نہیں، محض ہماری اور آپ کی طرح کا ایک عام شہری! عبرت کی تصویر، تُؤتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ کی جیتی جاگتی تفسیر!...... ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۸ء تک اور بھی بار بار حیدر آباد آنا جانا لگا رہا، یکلخت ناغہ حاضری کا ۱۹۳۸ء سے ہے۔ اللہ اکبر اس ۲۰ برس میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی! "انقلاب" تو ساری دنیا ہی میں آکر رہا، لیکن حیدر آباد کی قیامت خیزیوں کے لئے خود یہ لفظ بھی ہلکا اور ناکافی نظر آتا ہے۔ کاش کوئی لفظ لغت میں اس سے زیادہ واضح، جاندار و زوردار موجود ہوتا!

صبح ہوئی سورج کی شعاعیں پھوٹیں اور حیدر آباد کا چھوٹا اسٹیشن کاچی گوڑہ آگیا! کیسے کیسے دوست عزیز و محب، دن کا وقت ہو کہ رات کا اسی پلیٹ فارم پر لینے اور پیشوائی کرنے آچکے تھے! آج سناٹا تھا۔ محبوں مخلصوں کی بحمد اللہ آج بھی کمی نہیں۔ ذرا تاخیر ہو گئی ہوتی تو آج ہجوم شاید پہلے سے زیادہ لگ گیا ہوتا! لیکن اسی ہجوم ہی سے تو بچنا مقصود تھا جس نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور خصوصی عزیزوں، مخلصوں کو بھی مسرت دید سے محروم رکھا! اور یوں اترنا ہوا کہ جیسے یہ شہر بالکل اجنبیوں کا ہو۔ طبیعت نادان دوستوں پر کیسی کیسی جھنجھلائی جنھوں نے بالکل خلاف مصلحت اعلان عام کر کے مخصوصین کی بھی حق تلفی کرادی اور خود اپنی بھی!...... ویٹنگ روم بالکل سامنے تھا، خاموشی سے اتر کر کچھ وقت گزاری وہیں کی۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا ساتھ کیا ہوا ناشتہ کام آیا۔ کرنول کی مٹھائی یوں بھی مشہور ہے اور پھر اس ساتھ والی مٹھائی میں تو خدا معلوم اخلاص کی کتنی شیرینیاں اور حلاوتیں شامل تھیں...... آزاد ہو کر بھی کتنی قید میں تھا۔ جی بے اختیار تڑپ رہا تھا کہ کھا کر چلئے پھریئے اور زندہ و مرحوم جن جن مخلصین کے آستانوں پر چاہئے حاضری دیجئے! بہادر یار جنگ مرحوم، امین الحسن بسمل مرحوم، اختریار جنگ مرحوم، ہوش یار جنگ مرحوم، فصاحت جنگ جلیل مرحوم، احمد محی الدین مرحوم خدا معلوم کتنے مرحوموں کے مزارات پر حاضری کی تمنا دل کی دل ہی میں گھٹ کر رہی!

ناظر یار جنگ بہادر خود اسی خانگی صدمہ کے سلسلہ میں اس وقت حیدر آباد چھوڑ چکے تھے، تاہم ان کی کوٹھی (منزل عدل حیدر گوڑہ) تک جانا ضروری تھا، وہیں ایک اور عزیز مل گئے۔ اصرار بلیغ کر کے کئی گھنٹے روکے رکھا۔ ناظر یار جنگ کا کتب خانہ اچھا خاصا ہے وہ کھلا ہوا تھا اور مشغول رکھنے کے لئے بالکل کافی تھا۔ یہیں کسی طرح سراغ رسی کر کے ایک مخلص قدیم نظام کالج کے لیکچرر غلام دستگیر رشید ایم-اے پہنچ گئے اور ان کے ہمراہ عربی کے استاد احمد حسین خاں صاحب تھے۔ لکھنؤ کی گاڑی شب کو ملنا تھا اتنے گھنٹے گزارنے ناگزیر تھے۔ سہ پہر کو بڑے اسٹیشن پر آگیا، باغ عامہ اور عماد الملک مرحوم کی کوٹھی (راک لینڈز) وغیرہ کی دور سے زیارت کرتا ہوا۔ راستے واستے بھی کتنے بدل چکے تھے پھر بھی پرانے نقوش کچھ دھندلے سے باقی تھے۔ نلگنڈہ کے ایک مخلص کو مدراس سے اطلاع دے دی تھی اور اسی ویٹنگ روم کا پتا دے دیا تھا، وہ اطلاع انھیں بعد از وقت پہنچی ورنہ وہ جس طرح بھی ممکن ہوتا اپنے کو پہنچا کر رہتے۔

گاڑی میں اب بھی دو ڈھائی گھنٹے کی دیر تھی۔ جی میں آئی کہ اسٹیشن سے ڈاکخانہ (پرانے امپیریل پوسٹ آفس) تک کی سیر پاپیادہ کرلی جائے، یہ اسٹیشن روڈ وہ تھی کہ مدتوں اسی پر رہنا ہوا تھا اور اس کا چپہ چپہ آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ عصر کا وقت آخر ہو رہا تھا، سڑک پر وہ ہجوم، سواریوں کی وہ ریل پیل کہ ۱۵، ۲۰ منٹ والی مسافت ۴۰ منٹ میں طے ہوئی! اپنے کو دوسروں کی نگاہوں سے بچائے رکھنا بھی مقصود تھا کہ شاید کہیں کوئی پہچان نہ لے۔ رائے مرلی دھر کا مکان مال گزاری کی کچہری، کئی پرانی عمارتیں ۴۰ برس قبل کی، شناخت میں آگئیں اپنے مکان کے دروازہ پر جا کر کھڑا رہا جو سڑک سے اندر چند قدم گلی میں جسٹس خلیل الزماں کی کوٹھی کے بغل میں واقع ہے۔ اس وقت کی حسرتوں کا کیا بیان ہو! کل جو اس کا مکین تھا آج اجنبی محض کی حیثیت سے اتنی بھی ہمت نہیں رکھتا کہ پھاٹک ہی میں داخل ہو جائے! کچھ چھوٹے بچے بچیاں اس کی چھت پر کھیلتے دکھائی دیئے!...... دنیا اور اس کے سارے مالوفات بے وفائی اور بے ثباتی میں اس کی ٹکر کے ہیں!...... ہاں مسز نائیڈو کی کوٹھی "گولڈ تھر شولڈ" جس کا ترجمہ مولوی

ظفر علی خاں مرحوم نے "زر فشاں" کیا تھا، نظر نہ آئی۔ ضرور ہے کہ کسی اور کوٹھی میں مدغم ہو گئی ہو!

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے!

ایسے ہی موقع کے لئے ہے۔

حیدر آباد کا یہ سرسری در سرسری (یا باد صرصر کی سرعت کی مناسبت سے "صرصری") مشاہدہ الحمد للہ کہ اتنا مایوس کن و غم انگیز نہ نکلا جتنا ڈر رہا تھا۔ ترکی ٹوپیاں اچھی خاصی دکھائی دیں اور سڑکوں پر اُردو کی پرانی تختیوں پر بار بار نظر پڑی، یوپی کی طرح اُردو دشمنی کا جنون بہر حال اس حد تک نہیں پہنچا کہ اُردو حروف کھرچ کھرچ کر مٹائے جائیں! مغرب کی نماز کا سلام اپنی گاڑی میں پھیرا ہی تھا کہ رشید صاحب مع مولانا احمد حسین خاں کے اسٹیشن ہی آگئے اور گاڑی گھنٹہ بھر بعد روانہ ہو گئی! ناگپور پر کوئی صاحب اسٹیشن پر نہ ملے۔ خط دیر میں پہنچا، بھوپال جنکشن پر البتہ پھر وہاں کے مخلصوں، محبوں نے مسافر نوازی کا حق ادا کر دیا۔ جھانسی میں گاڑی رات کو بہت ناوقت تبدیل کرنا پڑی، جی ٹی ایکسپریس سیدھی دہلی چلی گئی، جھانسی سے کانپور کے لئے ایک پسنجر ملتی ہے۔ ۲۹ر کو دوپہر کا وقت تھا کہ لکھنؤ کا پلیٹ فارم آگیا اور ۱۲ دن قبل کا نکلا ہوا مسافر لکھنؤ زندہ سلامت واپس پہنچ گیا اور اب صرف ایک منزل دریاباد تک پہنچنے کی باقی رہ گئی۔

یہ معاملہ تو گنتی کے چند دنوں کے سفر کا تھا، زندگی بھر کا سفر ۶۰ اور ۷۰ اور ۸۰ اور اس سے بھی بڑی بڑی عمروں کا سفر اسی طرح آناً فاناً ختم ہو جاتا ہے اور غافل و عاجز بندہ بس دیکھتے کا دیکھتے ہی رہ جاتا ہے!

بدنامی حیات دو روزے نبود بیش
آں ہم کلیم باتوچہ گویم چاں گزشت
یک روز صرف بستن دل شد بہ این و آں
روزے دگر بہ کندن دل زین و آں گزشت

سفر مدراس- ۱۲ سال بعد (۲۸ر اگست ۱۹۷۰ء)

جنوری ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا کہ ایک مخلص بے بدل اور فاضل گرامی افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی کی قدر افزائی صدق کے گوشہ نشین محرر کو گھسیٹ کر مدراس لے گئی تھی اور اس سے چھ خطبے ایک ایک دن کے وقفہ سے "سیرت نبوی ﷺ قرآن سے" کے موضوع پر دلوائے۔ وہی توفیق ربانی ابکی پھر شامل حال رہی اور مہینوں پیشتر سے سرزمین مدراس سے دعوت کے پیام بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں آنے شروع ہو گئے۔ سال کے ابتدائی مہینے تھے کہ مدراس یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی وفارسی افضل العلماء ڈاکٹر محمد یوسف کوکن (شاگرد خاص مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم) دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے تو یہ پیام زبانی ساتھ لائے۔ سفر کا چور تو پہلے ہی سے تھا اب ۱۲ سال کی مدت گزر جانے کے بعد کہیں زیادہ سفر چور ہو گیا، خصوصاً آنکھوں کی معذوری بہت زیادہ ہو جانے کے باعث۔ پہلے ارادہ تو انکار و معذرت ہی کا ہوا پھر رفتہ رفتہ نرمی پیدا ہوتی گئی، لیکچروں کی تعداد اب کی بجائے چھ کے کل پانچ رہی، شرط ایک ایک دن کے وقفہ کی باقی نہ رہی اس لئے مدت قیام دو ہفتہ سے گھٹ کر کل ایک ہفتہ کی رہ گئی اور سب سے بڑی بات یہ کہ موضوع خطبات قرآنی بھی میری ہی رائے پر چھوڑ دیا گیا اور میں نے انتخاب کیا "مشکلات القرآن یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں" یہ سوچ کر کیا کہ اس کے لئے کوئی خصوصی مشقت نہ کرنا پڑے گی۔ اپنی تفسیر میں تو ایسی تمام آیتوں پر گزر ہی چکا ہوں انھیں میں سے سو پچاس آیتیں انتخاب کر کے ان کی ترتیب میں ادل بدل کر کے انھیں کو خطبہ کی صورت میں پیش کر دوں گا...... مہمان کی بات تسلیم کر لئے جانے کا فن کوئی مدراس والوں سے سیکھ لے۔ مدراس والوں کے بارے میں پہلے سمجھ رہا تھا کہ عبدالحق مرحوم ہی ذاتی طور پر اس فن کے اُستاد فن تھے، اب معلوم ہوا کہ وہ مرحوم منفرد نہ تھے، مدراس ہی میں ان کے ثانی اور بھی متعدد موجود ہیں۔

مسودہ کو گھسیٹ ڈالنے اور پھر اسے خوشخط صاف کرانے میں وقت خاصا لگا، ادھر سے تقاضے یہ شروع ہوئے کہ مبیضہ جلد سے جلد پہنچ جائے اور اگر ممکن ہو تو انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی ساتھ جلسہ میں پیش کر دیا جائے۔ بہر حال جوں توں وسط جولائی تک خطبے دو قسطوں میں ڈاک سے روانہ کر دیئے گئے اور خود ۲۵ر جولائی سہ پہر کو مع عزیزی حکیم عبدالقوی منیجر صدق کے لکھنؤ سے مدراس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب دو چار سال سے لکھنؤ سے مدراس کے لئے ہفتہ میں تین دن ایک سیدھی بوگی لگ جاتی ہے جو کوئی ۵۲ گھنٹوں میں لکھنؤ کے مسافر کو مدراس اسٹیشن پر اتار دیتی ہے، یہ بڑی سہولت ہو گئی ہے، ورنہ پیشتر کم سے کم ایک بار گاڑی ضرور بدلنا ہوتی تھی، اتنا طویل سفر کھل جانے والا اور طبیعت کو اکتا ڈالنے والا بہر حال ہوتا ہی ہے۔ راستہ میں بھوپال، ناگپور اور بجواڑہ پر صدق نوازوں کا ہجوم ہوتا رہا اور ان کے تحفہ تحائف، ناشتہ اور پھلوں کی ٹوکریاں بھی...... اور قاضی پیٹ جنکشن پر تو حیدر آباد مرحوم کے دو مخلصوں نے کمال ہی کر دیا۔ رات کے ڈھائی بجے جگا کر ملے، بجواڑہ اسٹیشن پر اخلاص مجسم حاجی بہاء الدین حیدر آبادی کا ساتھ ہو گیا، سفر بھر وہ خدمت کرتے رہے، جو کسی مزاج شناس، ٹرینڈ خدمت گار سے بھی شاید نہ بن پڑتی...... گاڑی لیٹ تو کجا، وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئی، یہ اپنے تجربہ میں ایک نئی سی بات تھی۔ ہم لوگ شمالی ریلوے کے عادی، بھلا گاڑی کا قبل از وقت پہنچنا تو کیا جانیں اب سالہا سال ٹھیک وقت پر بھی کسی گاڑی کا پہنچنا بھول چکے ہیں۔ یہ پہلے بھی سننے میں آیا تھا کہ کلکتہ سے مغل سرائے تک گاڑیاں ٹھیک وقت سے آتی ہیں اور یہیں سے لیٹ ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اور لیٹ بھی منٹوں کی حد تک نہیں گھنٹوں کی؟ چار چار پانچ پانچ گھنٹوں کی! بحمد اللہ وسطی اور جنوبی ہند کی گاڑیاں بھی بڑی ہی تکلیف دہ لعنت سے بری پائیں!

میزبان، مہمان نوازی میں عبدالحق ثانی نکلے یعنی بجائے تکلفات کے ساز از ور میری حسب استدعا میری راحت پر۔ راحت و آسائش اور چیز ہے اور تکلفات اور رسمی

خاطر داریاں بالکل دوسری۔

گاڑی کا کچھ منٹ قبل از وقت پہنچ جانا اس لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ پیشوائی کے لئے سب لوگ اس وقت تک پہنچ نہ سکے ...... ابتدائی خطوں میں یہ بصراحت درخواست کر دی گئی تھی کہ استقبال کے وقت ہجوم نہ ہونے پائے اور ایک گوشہ نشین محرر کو ہرگز نہ کسی قومی لیڈر پر قیاس کیا جائے نہ کسی واعظ شیوابیاں پر! دورانِ قیام میں نہ کسی وعظ کی فرمائش کی جائے نہ امامت نماز کی، نہ کسی جلوس کا شائبہ آنے پائے نہ کوئی نعرہ لگے، نہ ہار پھول پہنانے کی رسم ادا ہو اور نہ ملاقاتیوں اور زائروں کا بے اندازہ ہجوم ہونے پائے نہ کھانے میں بہت زیادہ تکلفات ہوں نہ دعوتوں اور چائے نوشیوں کا سامان ہونے پائے ...... میزبان کا دلی شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے کہ خلوص کے ساتھ خوش فہمی کا ثبوت بھی انھوں نے پورا دیا اور درخواستیں یہ سب منظور کر لیں۔ راحت کا انتظام تو انھوں نے عیش تک پہنچا دیا، رہنے کو ایئر کنڈیشنڈ کمرہ دیا اور سواری کو ایئر کنڈیشنڈ موٹر، مجمع کو زیادہ سے زیادہ قابو میں رکھا اور اپنی کسی فرمائش پر مطلق اصرار نہ فرمایا۔

خوش حال میرے اندازہ سے زیادہ نکلے اور خوش اطوار اس سے بھی زیادہ۔ چمڑے کا کاروبار ہے اور ہندوستان کی چرمی اشیاء کے بڑے سے بڑے کاروباریوں میں ان کا شمار ہے۔ روس اور امریکہ دونوں جگہ مال برآمد کرتے رہتے ہیں۔ نام، ٹی عبدالواحد کارخانہ کا نام ٹی عبدالواحد اینڈ کمپنی دباغ اور ایکسپورٹر نمبر ۱۹ اوِیری ہائی روڈ پیریامٹ مدراس نمبر ۳۔ اصل سکونت مقام امبور (نواح مدراس) سال ولادت ۱۹۱۰ء، بی اے، بی ایل کیا، پارلیمنٹ کے ممبر بھی کانگریس کے ٹکٹ پر کچھ عرصہ رہے۔

مدراس میں یہ دیکھ کر دلی خوشی ہوتی رہی کہ مسلمانوں کی حالت ہماری اپنی ریاست یوپی کی طرح ردی اور گئی گزری ہوئی نہیں، تعداد جو کچھ بھی ہو، عزت مرتبہ میں وہ کسی قوم سے بھی کم نہیں۔ یہ احساس کمتری کا شکار نہیں۔ ان میں خودداری ہے خود اعتمادی ہے اور دوسروں سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتے ہیں۔ ترکی ٹوپی اور

تہمد باندھنے سے شرماتے نہیں اور بعض بعض تو جناح کیپ بھی علانیہ دیئے رہتے ہیں، شاید ایک سڑک بھی جناح روڈ ہے۔ اور ہوٹلوں وغیرہ میں سنا ہے کہ بڑے گوشت کا ذبیحہ بھی کھلم کھلا ملتا ہے۔ مسجدوں کی تعداد بھی خاصی اور نمازیوں کی کثرت ہے اور اپنی خودداری قائم رکھنے کے لئے دوسروں سے لڑنا جھگڑنا ہرگز ضروری نہیں، تہذیب وشائستگی اور صلح و آشتی کے ساتھ اپنی ثقافت کو قائم رکھا جا سکتا ہے، اور ملازمت کے علاوہ تجارت بھی یکساں ومساوی سطح پر قائم رکھی جا سکتی ہے...... نمونہ کی شخصیت انھیں سیٹھ عبدالواحد کی ملی۔ ایک پرانے کرم فرما پروفیسر عبدالوہاب بخاری سے ملاقات دیرینہ کی تجدید ہوئی انھیں تمام خصوصیات کے ساتھ پیش آتے رہے۔ شہر کی ایک اور قابل ذکر ہستی سابق جج ہائیکورٹ بشیر احمد صاحب سعید کی ہے۔ بارہ سال قبل ان سے ملاقات ہوئی تھی جب بھی ایک پرجوش قومی کارکن تھے۔ البتہ اس وقت محسوس ہوا کہ زمانہ کے تجدد کے اثر سے تھوڑے سے "ریفارمر" ہو گئے ہیں۔ ضرورت ان کی رفاقت میں افضل العلماء عبدالحق کی سی شخصیت تھی جو ان کو توازن واعتدال پر قائم رکھتی۔ اب بھی ایک بڑے زنانہ کالج کو چلا رہے ہیں جس میں سینکڑوں غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ ایک خاصی بڑی تعداد مسلم طالبات کی بھی ہے۔ کالج، ہوسٹل سے ملحق ایک جمعہ مسجد بھی ہے جس میں برقع پوش لڑکیاں نماز پڑھتی ہوئی دیکھی گئیں...... مخلوط تعلیم کے ساتھ ایک نیا مسئلہ مخلوط عبادت کا!...... باہر سے آنے والے مہمانوں اور کرم فرماؤں میں ایک قابل تعارف شخصیت ویلور کے مدرسہ باقیات صالحات کے نگراں سید صبغت اللہ شاہ بختیاری کی ہے۔ ایک زمانہ میں جماعت اسلامی کے امیر کیا معنی، کہنا چاہئے کہ امیر الامراء کے درجہ پر تھے اور اب مدت سے طائفہ درویشی کے نقیب ہیں۔ آدمی زندہ دل، گرم نفس، صاحبِ ذوق اور چنچل مزاج ہیں۔ بچپن وہی جو امارت کی وردی میں تھی وہی خرقۂ درویشی میں بھی موجود ہے۔

سفر اگر لمبا ہے تو آرام وآسائش کا اور حیثیتوں سے ہزار انتظام ہو اپنی طوالت

کے لحاظ سے بہر حال تکلیف دہ ہوتا ہے اور پھر ضعف بصارت کا اثر زندگی کی طرح سفر پر بھی پڑنا لازمی ہے اور اب جو چیز سفر میں سب سے بڑھ کر تکلیف دینے لگی ہے وہ خلقت کا ہجوم اور "عقیدت مندوں" کا مجمع ہے! ہر شخص زیارت کرنے اور مصافحہ کرنے پر پلا پڑتا ہے۔ مجھ میں اتنا ظرف تحمل کہاں کہ اس تعب کو برداشت کر سکوں، خلق میں قبول اور مرجعیت تو ایک طرف اللہ کی نعمت ہے اور دوسری طرف نفس کو بھی بڑی لبھانے والی چیز۔ اسے کیا کیجئے کہ بعض طبیعتوں میں اتنا ظرف ہی نہیں ہوتا کہ اس نعمت کو برداشت کر سکیں۔ اللہ سے دعا یہی رہتی ہے کہ ہم ایسے کم ہمتوں، کم ظرفوں، کم حوصلہ والوں کو اس نعمت کے بجائے کسی اور نعمت سے سرفراز کیا جائے ......اور بعض دفعہ تو اس گھیر گھار کے موقع پر بدگمانی پیدا ہوئی، اور بزرگوں سے یہ بے اعتقادی ہو چلی کہ کہیں یہ پرانے بزرگ بھی کچھ ایسے ہی کورے اور سادے تو نہ تھے۔ محض لوگوں نے انھیں تماشا بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا! ہر بہروپیے کے گرد کیسا میلہ لگ جاتا ہے اور کیسے کیسے عجائب و خوارق اس کے حق میں گڑھ لئے جاتے ہیں۔ اس سفر میں یہ تجربہ تازہ ہوا اور حیدر آباد کے بعض مخلصوں اور کرم فرماؤں کو تو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ تم مدراس تک آگئے اور حیدر آباد نسبتہً قریب تر ہے اس سے کتراتے چلے گئے۔

میزبان کو مجھ سے وعدہ لے چکنے کے بعد پھر خیال آیا کہ ہر روز مجلس کی صدارت کے لئے عالم باعمل اور فاضل یگانہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بھی رائے بریلی (مضافات لکھنؤ) سے مدعو کر لیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ خیال گو دیر میں آیا لیکن میں تو اسے سنتے ہی پھڑک گیا، تار سے اتفاق کیا کہ واقعی صدر رہے مجلس کی عزت افزائی ہو جائے گی، وقت کم تھا، انھوں نے دہلی ہوتے ہوئے ہوائی راستہ اختیار کیا (خاص لکھنؤ سے ہوائی سروس مدراس کے لئے ہے ہی نہیں صرف دہلی اور کلکتہ کے لئے ہے) مولانا کے مستقل رفیق سفر و حضر ایک ندوی میرے ساتھ ہی لکھنؤ سے ٹرین پر ہم سفر رہے...... ہم لوگ ۴۵ گھنٹہ گزار کر ۲۷ جولائی کو عشاء کے وقت مدراس پہنچے اور مولانا

دہلی سے ۲۸ر کو صبح سوار ہو کر ڈھائی تین گھنٹہ میں لکھنؤ سے زائد فاصلہ طے کر کے پہنچ گئے۔ ان کی اس سرعت سیر پرواز پر حیرت نہ کیجئے علی میاں کے آجاتے ہی مدراس لکھنؤ ہو گیا اور پردیس وطن بن گیا...... اور میں اس کو میزبان کی خاطرداریوں اور مہمان نوازیوں میں کیوں نہ شمار کروں، انھوں نے میری حیثیت اور بساط سے بڑھ کر جہاں اور سب خاطرداریاں کیں وہیں سب سے بڑی خاطر و مدارت انھیں یہ سوجھی کہ علی میاں کو بھی بلا دیا...... اور علی میاں جو آئے تو اپنے ساتھ ایک دلکش ضمیمہ بھی لیتے آئے، یعنی عبداللہ عباس ندوی پھلواروی اور ان کی درسگاہ ندوہ کے رشید ترین شاگرد، علم و فضل ہی میں نہیں بلکہ دماغ کے ساتھ دل کے اعتبار سے بھی ان کے پیرو معتقد تو ہے ہی ہیں اس نیاز مند کے ساتھ بھی اخلاص و محبت کی نسبت خصوصی رکھتے ہیں۔ ایک نعمت غیر مترقبہ کہاں مکہ معظمہ کا مرکز رابطہ اسلامی اور کہاں دہلی و مدراس، زمین کی طنابیں کھنچ جانے کا جو محاورہ پرانی کتابوں میں پڑھا ہے وہ ایسے ہی موقعوں کے لئے وضع ہوا ہوگا۔

جلسہ پروگرام کے مطابق ۲۸ر جولائی کو بعد نماز مغرب شروع ہوا اور سوا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے پانچوں دن پابندی سے ہوتا رہا، پہلے دن شہر کے شیخ معمر قاضی حبیب اللہ صاحب جو اپنے ضعف و نقاہت کے باوجود شریک رہے۔ نیو کالج کے وسیع ہال میں مجمع اچھا خاصا رہا۔ موضوع جذباتی اور واعظانہ رنگ کا نہیں، خشک علمی قسم کا تھا پھر بیان زبانی بھی نہ تھا لکھے ہوئے خطبے کو سنانا تھا، اگر ذرا بھی طویل ہوا تو سامعین پر بار ہونے لگتا ہے اس کے باوجود حاضرین اپنے لطف و کرم سے صبر و سکون کے ساتھ سنتے رہے۔ میری آواز یوں ہی نحیف و پست ہے کسی بڑے جلسہ کے لئے بالکل ناموزوں اور پھر یہ وقت رات کا تھا جب میری آنکھیں پڑھنے سے ہی قاصر ہو جاتی ہیں، اس مشکل کو میرے ایک ہم قافیہ اہل علم مولانا عبدالواجد نے حل کر دیا۔ یہ مضافات مدراس کے ایک بڑے عربی مدرسہ میں صدر معلم ہیں اور مدرسہ رحمانیہ (دہلی) کے

فارغ ہیں۔ انھوں نے ماشاء اللہ بڑی بلند آواز اور واضح لب ولہجہ میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ درمیان میں جابجا جو آیات قرآنی آجاتی تھیں انھیں وہ باقاعدہ تجوید اسی خوش لحنی سے ادا کر دیتے تھے کہ میرے لئے ممکن ہی نہ تھا، فجزا اللہ خیر الجزاء پہلے دن ایک مختصر استقبالی مقالہ سیٹھ عبدالواحد صاحب نے سنایا۔ پھر ایک دن مولوی عبداللہ عباس ندوی نے اور کسی دن صدر صاحب نے خطاب فرمایا۔ اور آخری دن تو علی میاں صاحب کی اختتامی تقریر تو ظاہر ہی تھی۔ خطبہ نگار کے لئے یہ سارا سامان بڑا حوصلہ افزا تھا مگر دل اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باعث کٹ کٹ کر رہتا تھا...... اللہ جس چھوٹے کو چاہے مخلوق کی نظر میں بڑا بنا دے اور جس بے کمال و بے ہنر کو چاہے کمال اور ہنرمندی کے لباس میں ملبوس کر کے دکھا دے!

انتخاب میں آیتیں کل ۶۵ آئیں اور وقت اور جگہ کی گنجائش صرف سورۂ توبہ کے آخر تک ساتھ دے سکی، سورۃ النساء ہی جہاں مصلوبیت مسیح کا ذکر ہے صورت حال کا ایک نیا نظریہ تاریخ و جغرافیہ کی روشنی میں پیش کرنے کی جرأت ہوئی۔ اسے بعض اور آیتوں میں مثلاً وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِابْنُ اللّٰهِ اور لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ حاضرین نے خصوصی توجہ و التفات سے سنا۔ تفسیر میں یہ سب بحثیں تو آہی رہی ہیں اور آچکی ہیں خود صدق کے صفحات میں خطبات کی اشاعت کے وقت ان شاءاللہ آجائیں گی۔

اندیشہ لگا ہوا تھا کہ اس مرتبہ ضیافتوں اور استقبالیوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی، لیکن میزبان کی حکمت اور دانائی نے اسے دوچار سے آگے نہ بڑھنے دیا، اور گویا صرف اپنوں ہی کے حلقہ تک محدود رکھا۔ مشفق قدیم عبدالحق مرحوم کی باقیات صالحات جو اب تک مدراس میں موجود ہیں ان کے ہاں حاضری ہوئی اور ان کے صاحبزادے میاں محفوظ الحق سلمہ، سے گلے مل کر تو آنسو کسی طرح ضبط نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے ادارے ہر بڑے شہر میں ہوتے ہیں۔ تعلیمی بھی ملی بھی، یتیم خانے

اور اقامت خانے وغیرہ بھی...... وہ اپنی جگہ اچھے اچھے کام بھی کر رہے ہیں لیکن کیا ضرور ہے کہ میں بھی ہر ادارہ کا جا کر معائنہ کروں اور پھر اس کی کارگزاری یا کارکردگی کی تصدیق کتاب معائنہ میں ضرور لکھ آؤں۔ لیکن یہ مصیبت ہر جگہ پیش آتی رہتی ہے۔ جس شہر میں بھی جائیے وہاں کے قومی اداروں کے کارکن دھوم دھام سے خیر مقدم کریں گے، اس کے بعد اصرار کر کے اور پورا اخلاقی دباؤ ڈال کر اپنے ادارے میں مدعو کریں گے، لے جائیں گے۔ اس کی ایک ایک چیز تفصیل کے ساتھ تھکا دینے کی حد تک دکھائیں گے۔ تقریر کرائیں گے، چائے اور ناشتہ بھی پیش کریں گے اس کے بعد ٹیکس سرٹیفکیٹ کی صورت میں وصول کریں گے۔ یہ بہ جبر اپنی تائید میں رائے لکھوا لینے کا فیشن عجیب چل نکلا ہے، بڑے بڑے مہذب و شائستہ لوگ اس میں کوئی عیب نہیں محسوس کرتے!...... مدراس اس کلیہ سے مستثنٰی کیوں ہوتا۔ اپنی طبیعت پر ان سب فرمائشوں سے بڑا ہی بار پڑتا ہے۔ لیکن الحمد للہ کہ یہاں مولانا علی میاں ندوی کی موجودگی نے بڑی سپر کا کام دیا۔ وہ ماشاء اللہ اس میدان کے مرد ہیں، جتنے اداروں کا گشت ان سے چاہے کرا لیجئے اور جتنی تقریریں ان سے چاہے کرا لیجئے اور بعض مرتبہ تقریر بڑے کام کی کر جاتے ہیں۔ یہاں کے زنانہ کالج کے سلسلہ میں ایسی ہی صورت پیش آگئی۔ ہم دونوں کو جانا پڑا میں تو بیشتر حصہ سواری ہی میں بیٹھا رہا وہ بیچارے پیدل خوب گھومے پھرے اور آخر میں تقریر کے لئے میں نے انھیں کو آگے کر دیا۔ بے حجاب لڑکیوں اور عورتوں کے مجمع میں بیٹھنا بھی مجھ دقیانوسی کو بار ہو رہا تھا چہ جائیکہ اس مجمع میں کچھ بولنا بہر حال مولانا نے پہلے تو چند فقروں میں عمارت وغیرہ کی داد دی، اور کالج کے خصوصی کارکن کو جنوبی ہند کا سر سیّد بتایا (یہ لقب پچھلی بار دورۂ مدراس کے وقت مرحوم کے لئے سن چکا تھا) اور اس کے بعد تقریر اس مفہوم کی کی:

...... لیکن ان ساری علمی ترقیوں اور اعلیٰ ڈگریوں کے ساتھ یہ سن لیجئے کہ مسلمان عورت کا کام زندگی میں محض اچھی انجینئر، اچھی ڈاکٹر اور اچھی ایڈوکیٹ بن جانا نہیں، اس کا کام اچھی بیٹی، اچھی بہن، اچھی ماں اور اچھی بیوی بننا ہے۔ اس کی نگاہیں نیچی رہیں

اور اس کا لباس شرم و حیا کا ہو، وہ اپنے بچوں کی بہترین تربیت دینے والی ہو اور اپنے گھر کی بہترین منتظمہ، ہر جگہ یار غار اور ہر حال میں خود دار رہے، مغربی تہذیب سے مرعوب نہ ہو اور اسلام کی روایات کی محافظ قدم قدم پر رہے۔

اسی کو انھوں نے بسط و تفصیل سے بیان کیا اور بڑی قیمتی نصیحتیں ان کے کان میں ڈال دیں۔

مدرسہ جمالیہ (عربی) بھی مولانا عبدالوہاب بخاری صاحب اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں کا سارا پروگرام عربی میں انجام پایا اور عربی میں تقریر بھی علی میاں صاحب کی رہی۔

ملنے والوں میں متعدد صاحبوں کی یاد خاص طور سے محفوظ رہ گئی، ایک تو مدرسہ جمالیہ والے مولوی عبدالباری صاحب، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے رفیق قدیم اسی قدیم لطف و عنایت سے برابر ملتے رہے، دوسرے مدراس یونیورسٹی کے استاد عربی ڈاکٹر محمد یوسف کوکنی کا تو کہنا ہی کیا وہ تو گویا اپنے ہی تھے۔ انور صاحب سابق ایم پی اے کی پارلیمنٹی تقریریں دو چار بار پڑھنے میں آئی تھیں اور ان کی دلیری اور اسلامیت کا قائل ہو چکا تھا۔ ابکی ان سے نیاز حاصل رہا اور اچھا رہا۔ موجودہ ایم پی عبدالصمد صاحب سے بھی ملاقات گو مختصر رہی لیکن جتنی رہی اچھی رہی۔ ان کے اخلاص کی روایتیں برابر سننے میں آئیں اور گفتگو سے کچھ ان کی تصدیق بھی ہوتی رہی۔ انگریزی ہفتہ وار اخبار کریسنٹ THE CRESCENT انھیں کی نگرانی میں یہاں سے نکلتا ہے اور اس کے ایڈیٹر عبدالرؤف صاحب سے ملاقات ابکی کئی سال بعد ہوئی۔ پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی جب یہ ریڈیئنس RADIANCE کے ایڈیٹر تھے۔ کریسنٹ کو اللہ ترقی دے اور نظر بد سے بچائے خاصا ہونہار پرچہ ہے۔ انگریزی صحافت کے ایک اور رکن محمد رضا خاں صاحب سے بھی ملاقات رہی۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اب تو شاید بند ہو گیا پہلے یہ انگریزی میں ترجمان نکالتے تھے۔ جنوبی ہند میں مسلمانوں سے وہ بیزاری اور بدگمانی نہیں جو یوپی بہار وغیرہ میں ہے اس لئے یہاں فضا مسلم لیگ کے مخالف نہیں بلکہ ایک حد

تک موافق ہی ہے۔ جی میں تھا کہ مشہور معمر ہندو لیڈر راج گوپال اچاریہ سے بھی ملئے، لیکن کچھ تو وقت نہ ملا اور کچھ کاہلی نے موقع نہ دیا۔ بہر حال اس کی حسرت ہی رہی۔

میزبان کے لڑکے اور داماد، شریک کاروبار کا تجربہ جتنا بھی ہوا خوشگوار ہی رہا۔ باقی ان کے رشتہ کے ایک بھائی حبیب اللہ سے سابقہ زیادہ اور گہرا رہا، بہت خوب شخص نکلے۔ بڑے مسلمان نظر آئے اور میری تحریروں کا تو شاید ایک ایک لفظ پڑھ چکے ہیں۔ کھانا کھلانے اور مہمانوں کی ہر قسم کی خدمت گزاری اور آرام رسانی تو شاید ان کا شیوہ ہی ہے۔ چھوٹی بڑی ہر چیز کی فکر رکھتے اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے خدمت خلق کا اجر کماتے تھے۔ واپسی کے بعد جتنی یاد میزبان کی آتی ہے اتنی ہی ان کی بھی آتی ہے......

شیخ شہر قاضی حبیب اللہ صاحب کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان کا کتب خانہ علی میاں اور عبداللہ عباس ندوی کے ہمراہ جا کر دیکھا کتب خانہ اپنے نوادر اور تعداد کتب دونوں کے لحاظ سے واقعی قابل قدر ہے لیکن بڑی ضرورت ابھی اس کی ترتیب اور سلیقہ مندی کے ساتھ تہذیب کی ہے۔ خود قاضی صاحب اب تبرک رہ گئے ہیں۔ حاضر ہو کر اپنی ذاتی نیاز مندیوں کی کچھ تجدید نہ کر سکا۔

شہر میں میرے لئے سب سے زیادہ پر کشش اپنے ملک العلماء، بحر العلوم لکھنوی کا مزار تھا اور ان کی مسجد۔ تربت پر کھڑے ہو کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ پردیس میں نہیں اپنے وطن میں ہوں۔ وہی خاندانی موانست و شفقت جس کی جھلک فرنگی محلی بزرگ میزبان میں ہوتی، اور مسجد کی نورانیت و تقدس کا کیا کہنا! جب اس کے صحن میں مولانا عبدالحق افضل العلماء کے مرقد کا شفاف کتبہ بھی نظر آ رہا ہو! ۱۲ سال قبل وہ مجھے یہاں لائے تھے آج خود ان کی کشش مجھے گھسیٹ کر لائی!

خطبات کا پروگرام (یکم اگست سنیچر) کی شام کو ختم ہو چکا اور واپسی کے ٹکٹ ۲ر (اتوار) کو ۱۰ بجے دن کی گاڑی سے خریدے جا چکے تھے۔ مولانا علی میاں صبح سویرے رخصت ہو کر مضافات مدراس (آمبور، ویلور وغیرہ) اسلامی مرکزوں کے دورہ پر نکل

گئے، ماشاء اللہ ان مجاہدات کے پورے مرد میدان ہیں۔ اب کل صبح وہ مدراس آئیں گے اور مدراس سے دہلی ہوائی جہاز سے روانہ ہو جائیں گے۔

الحمد للہ کہ رخصت کے وقت اسٹیشن پر مجمع زیادہ نہیں ہونے پایا بس پندرہ بیس مخصوصین ہی رہے۔ گاڑی (لنک ایکسپریس) کوئی ساڑھے دس پر چلی اور پورے احساس کے ساتھ کہ اب زندگی میں بظاہر یہ آخری لمبا سفر ہے آمد کی طرح واپسی کا بھی وہی لمبا سفر اور اکتا دینے والے فاصلے وہی جانے ہوئے اسٹیشن اور انھیں میں سے بعض بجواڑہ، ناگپور پر مشتمل سابق ملنے والے مخلصوں کا ہجوم ملتا رہا اور عالی حوصلہ میزبان نے جو بڑا سا ناشتہ دان اور پھلوں کی ٹوکری ساتھ کر دی تھی اس سامان میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا...... ان ملنے والوں اور مخلصوں کے سب نام اب حافظہ میں کہاں لیکن کرنل بسم اللہ بیگ کو کیسے بھلادوں۔ "تذکرہ قاریان ہند" کے مصنف اور فن تجوید و قرأت کے خود بھی یقیناً امام ہوں گے۔ حسرت اب اس کی ہو رہی ہے کہ ملاقات دو دو بار ہوئی اور خاصی دیر دیر تک رہی۔ نعمت سے محرومی محض اپنی غفلت و بے خیالی سے ہو گئی...... دوشنبہ کی دوپہر کو بھوپال سے کئی اسٹیشن قبل مولانا حافظ عمران خاں ندوی بھی مل گئے اور قبل اس کے باضابطہ ان کا مہمان بنوں اپنے حسب مذاق و معمول انھوں نے پیشگی ہی میزبانی شروع کر دی، گاڑی بعد عصر بھوپال پہنچ گئی یہیں قطع سفر کا پروگرام ہونے کے لئے تھا، سامنے استقبالیوں کا دستہ نظر آیا ان میں سب سے نمایاں یہ دو ہستیاں تھیں ایک تو مولانا کے صاحبزادے مولانا حبیب ریحان خاں ندوی، ازہری استاد دار العلوم لیبیا (آج کل چھٹیوں میں وطن آئے ہوئے ہیں) دوسرے صابر قلی خاں صاحب سابق والی ریاست محمد گڑھ "صدق" کے خصوصی کرم فرما۔ ان سے تعارف تو سالہا سال سے تھا شخصاً تعارف ابھی پچھلے ہفتہ اسی اسٹیشن بھوپال پر ہوا تھا۔

گاڑی جب بھوپال پہنچی تو عصر کا دوسوا وقت گزر چکا تھا طے یہ پایا کہ پہلے سیدھے مزار حضرت شاہ محمد یعقوب پر چلا جائے کہ یہاں حاضری ایک اہم فرض بھی تھی

چنانچہ یہی کیا گیا اور مغرب سے قبل اس سے فراغت ہو گئی...... تربت کی دلکشی کا کیا کہنا! جو سکون و یکسوئی حضرت کی خانقاہ میں میسر ہوتی تھی اس کا نمونہ یہاں بھی موجود۔ یہ جسم کل بھی حق کی طرف سے زندہ تھا اور خلق کی طرف سے مردہ وہ آج بھی جسم کے اعتبار سے مردہ اور روح کے اعتبار سے الحی القیوم سے مربوط و وابستہ...... وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ۔

قیام حسب دستور "غریب خانہ" پر رہا! جی ہاں "غریب خانہ" پر! کرم فرماؤں کی ایک تعداد سے رات ہی کے ابتدائی گھنٹوں میں نپٹ لیا گیا سفر کے تکان کے خیال سے لوگوں نے جلد ہی فارغ کر دیا، کھانے اور عشاء کی جماعت سے پڑوس کی مسجد شکور خاں سے جلدی فراغت حاصل ہو گئی...... میزبانی کا فرض ادا کرنے میں اصل میزبان سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ان کے صاحبزادے رہے۔ وہی نشان منزل والے حبیب ریحان خاں برسوں عرب ملکوں میں رہ کر اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو عرب میزبانی کا حوصلہ اور سلیقہ تو ضرور سیکھ آئے ہیں۔ اور میرے حق میں تو ان کا رابطۂ قلب و اخلاص شاعروں کو مات دیئے ہوئے ہے...... سعدیؒ کے مشہور مصرعہ

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

میں تو پھر قید "اگر پدر نہ تواند" کی لگی ہوئی ہے یہاں پسر اس قید شرط سے بے نیاز ہر طرح پدر سے بازی لے جانے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ میزبان کے بھتیجے منصور نعمانی ہر خدمت میں پیش پیش۔

دن میں بھی...... صبح سے لے کر رات گئے تک لوگ آتے جاتے رہے لیکن بحمد اللہ سکون میں کوئی خلل نہ پڑا، اور خود بھی دو تین جگہ جانا ہوا۔ سب سے پہلے بڑھ کر حضرت کی خانقاہ میں صاحبزادے محمد سعید صاحب اور دوسرے بھائی مہمان کی پذیرائی، دلجوئی اور عزت افزائی اپنے والد محترم کے قدم بہ قدم پھر سیفیہ کالج کے

استاد اور عبدالقوی دیسنوی کے جو مولانا سیّد سلیمان ندوی کے عزیز ہونے سے خود اپنے عزیز معلوم ہوتے ہیں اور اردو کے معروف خدمت گزار حمیدیہ کالج کے استاد اردو ابو محمد سحر اور تخلص بھوپالی اور روزنامہ الحمراء کے ایڈیٹر سید محمود الحسینی ان سب سے خوشگوار ملاقاتیں رہیں۔ نواب صاحب محمد گڑھ کا لطف خاص رہا اور سب سے بڑھ کر قاضی وجدی جو علم و دین شعر و ادب سب کے جامع نکلے۔ ایک بڑی قدیم مخلصہ صدق بلکہ سچ مرحوم کی قدر دان اہتمام بیگم شاہجہاں[1] پوری تھیں۔ اب کی بجائے ان سے ملنے کے ان کی قبر کی زیارت کی، بیچاری کی ساری زندگی خانگی پیچیدگیوں میں پڑ کر روتے ہی گزری اور لاولد دنیا سے گئیں۔ غرض ۳ر کی شام سے لے کر ۵ر اگست کی صبح تک اوقات گویا اپنے عزیزوں ہی میں خوشگواری کے ساتھ گزرے اور بڑوں اور چھوٹوں سب سے بقدر اپنے ظرف کے مستفید رہا۔ زندوں کے علاوہ مرحوم بزرگوں کے فیضان برزخی سے یقین ہے کہ سرتاسر محرومی نہ رہی اور ۵ر کی صبح سات بجے کے بعد بمبئی پنجاب میل کی لکھنؤ والی گاڑی پر بیٹھ رات کو ساڑھے آٹھ بجے لکھنؤ اسٹیشن پہنچ گیا...... اللہ کریم کا انتہائی لطف احسان ہے کہ سفر یا حضر ہر تجربہ کے بعد اپنے ہی عیب و نقصان نظر کے سامنے زیادہ کھل کر آتے رہتے ہیں۔ اور اس کا احساس ہر مرتبہ زیادہ ہو جاتا ہے کہ اس مشت خاک کو سلیقہ نہ سفر کا نہ حضر کا اور حقوق ادا کرنے نہ ہمسایوں کے آتے ہیں نہ ہم سفروں کے۔ نہ میزبانوں کے نہ مہمانوں کے نہ بڑوں کے نہ چھوٹوں کے اور زندگی کے دن ہیں کہ لشتم پشتم بس کٹتے ہی چلے جاتے ہیں...... اپنے ہر تعلق رکھنے والے سے استدعا بس صرف عفو تقصیر ہی کی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

[1] اردو کے استاد ڈاکٹر گیان چند سے ملنے کی حسرت پچھلی بار کی طرح اس بار بھی دل میں رہ گئی۔

چند گھنٹے علی گڑھ میں

علی گڑھ سے پرانے تعلقات کورٹ کی ممبری یا ممتحنی وغیرہ کے مدت ہوئے ختم ہو چکے تھے لیکن اب ادھر چند سال سے جب سے مولانا اکبر آبادی صدر شعبۂ دینیات ہو کر آ گئے ہیں اُن کی کشش سال میں ایک بار مجلس شعبۂ دینیات میں حاضری کے لئے علی گڑھ پہنچا ہی دیتی ہے اور یہ ایک سالانہ معمول سا ہو گیا ہے۔ قیام صرف دن ہی بھر کا رہتا ہے لیکن اتنی ہی دیر میں بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ پُرانے رفیقوں دوستوں سے ملنا ملانا، مسجد اور لائبریریوں میں حاضری، سر سیّد اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم وغیرہ کے مزارات پر فاتحہ خوانی، یونیورسٹی قبرستان کی زیارت اور جماعت اسلامی والوں، جماعت تبلیغی والوں سے دیدا دید اس قسم کی چیزوں کے لئے اکثر وقت نکل ہی آتا ہے اور سرسری اچٹتی سی نظر بہت سی چیزوں پر پڑ ہی جاتی ہے۔

پرانے علی گڑھ کی ایک خاص چیز ترکی ٹوپی تھی (اکثر سیاہ ترکی کوٹ یا شیروانی کے ساتھ) اور دوسری خصوصیت لڑکوں کی عادت السلام علیکم کی تھی۔ شناسائی ہو نہ ہو، جدھر سے بھی نکل جایئے آوازیں السلام علیکم کی برابر چلی آتی تھیں...... گویا اہل جنت تھے کہ ایک دوسرے کو خوشخبریاں ہمہ وقت سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ کی پہنچاتے رہتے تھے۔ اب یہ دونوں جوہر عنقا ہو چکے ہیں۔ ع

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

لڑکوں کی ٹولیاں کثرت سے اِدھر اُدھر چلتی پھرتی نظر آئیں، برہنہ سر اور بجائے سلام تحیۃ اسلام کے "رخ کردہ از ما یک طرف" سب بیگانہ وار گزرتی چلی گئیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ طلبہ علی گڑھ کے ہیں!...... البتہ دھوتی کہیں ایک جگہ بھی نظر نہ آئی (جس کی شہرت علی گڑھ کے بعض غالی معاندوں نے اسی پچھلے سال

دے رکھی تھی) حالانکہ ظاہر ہے کہ ہندو طلبہ اب کثرت سے ہیں۔

ترکی کوٹ تو بہت پہلے جا چکا تھا۔ ترکی ٹوپی اب گئی اور اپنے ساتھ اسلامی سلام کی رسم قدیم کو بھی لیتی گئی اور ان کی جگہ جو چیز آئی وہ ہے طالبات کی کثرت، وہ بھی بلا برقع و حجاب...... ظاہر ہے کہ ان دونوں دقیانوسی چیزوں کو جانا ہی تھا اور اس نئی چیز کو آنا۔ اس میں قصور کسی فرد یا پارٹی کا نہیں ع

دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

شروع شروع جب لڑکیوں کو داخلہ ملنے لگا ہے تو کچھ دن قید برقع حجاب کی رہی لیکن آخر یہ کب تک چلتی۔

کھل گئے ورنہ رہا شاہد مشرق کو حجاب

مولانا عبداللہ ناظم اور نواب صدر یار جنگ اعزازی صدر شعبۂ دینیات کا زمانہ ہوتا تو شاید ہر شعبہ پھڑ پھڑا کر رہتا۔ اب ہمارے مولانا اکبر آبادی کے لئے یہی بہت ہے کہ اپنے شعبہ کی طالبات کی حد تک وہ حجاب و برقع کی پابندیاں قائم رکھے ہوئے اور خود اس مجلس شعبہ میں جب ان کی کوئی "شاگردہ" شریک ہوتی ہیں تو اسی قید و بند کے ساتھ۔

رقبہ یونیورسٹی کی توسیع، شاندار عمارتوں کی افزونی، لائبریریوں کے اندر کتابوں کا اضافہ، ان سب چیزوں کو کچھ نہ پوچھئے، چلتے چلتے تھک جایئے اور عمارتوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ یہ میڈیکل کالج وہ پالی ٹیکنیک، یہ فلاں ہوسٹل وہ فلاں لیبارٹری اور بڑی آزاد لائبریری کے علاوہ نسبتہً چھوٹی اسلامک اسٹڈیز لائبریری کے حدود میں اگر پہنچ جایئے تو سامان اپنے اندازہ و شوق سے بھی کہیں بڑھ کر پایئے۔ آنکھیں پڑھتے پڑھتے تھک جائیں اور کسی ایک شعبہ کے ادنیٰ جزو بھی احاطہ میں نہ آنے پائے...... "علوم" و "فنون" جیسے کہ وہ ہیں ان کی تحصیل اور ان میں تکمیل کے لئے بہترین اڈے اور رمنے، لیکن پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی۔ پولیس کا عملہ دخلہ اب تک بدستور! اپریل ۶۵ء کی اس منحوس، بدبخت و تاریک تاریخ کو پونے دو برس ہو رہے ہیں اور وہ داغ سیاہ اب بھی

قائم! اس کے اسباب جو کچھ بھی ہوں لیکن بہرحال پبلک کے سامنے بدنامی تو وائس چانسلر ہی کی ہو رہی ہے اور ان کے ہر مخلص کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔

سرور صاحب (صدر شعبۂ اردو) کا ساتھ سفر میں لکھنؤ ہی سے ہو گیا تھا...... اور کہنے والے کی زبان پر اس وقت آ گیا تھا کہ جب "سرور" رفیق سفر ہو تو اب "غم" کیا! ...... اور بات ٹھیک ہی نکلی۔ سرور صاحب کی معلومات سے اردو ادب کی کتابوں سے متعلق نہ صرف اثنائے سفر میں استفادہ ہوتا رہا بلکہ علی گڑھ پہنچ کر دوسری صبح کو انھوں نے اچھا خاصا وقت میرے لئے نکالا اور آزاد لائبریری اپنے ساتھ لے جا کر اردو لغت کی کم یاب و نایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ میرے لئے نکلوایا اور اس کے متعلق اپنی معلومات سے پوری مدد فرماتے رہے۔ جتنا وقت ان کے ساتھ گزرا، ایک طالب علم کا ایک صاحب علم کے ساتھ گزرا، دل ان کے شکریہ سے لبریز رہا۔

شعبہ کی مجلس میں ملاقات صدر شعبہ اور اس کے دوسرے کارکنان سے ہونا تو ظاہر ہی ہے باقی کئی گھنٹوں کی ملاقات دوسرے اہل علم سے رہی۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا تقی امینی (ناظم شعبہ) مولانا محمد شفیع فرنگی محلی (سابق ناظم شعبہ) مولانا محمد فضل اللہ (شارح الادب المفرد بخاری و سابق استاد دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد) کے نام طبقۂ علماء میں بھولنے والے نہیں۔ خاصے علمی و دینی مذاکرے رہے۔ باقی ملنے والوں میں چہرے حاجی عبیدالرحمٰن خاں شروانی، ان کے فرزند ریاض الرحمٰن خاں شروانی، شعبۂ تاریخ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کے حافظہ کے سامنے آتے جاتے ہیں۔ ایک نئے ملاقاتی کنور مسعود علی خان نکلے۔ چہرہ پر نور کی وہ بارش کہ جیسے کوئی عابد مرتاض و شب زندہ دار ہوں بعد کو ان کی ریاضتوں اور معمولات کے تذکرے سن کر معلوم ہوا کہ قیاس بے جا نہ تھا۔ بظاہر ایک دنیاوی عہدیدار ایڈیشنل کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہونے والے لیکن توفیق الٰہی جس کو بھی چاہے دولت معنوی سے سرفراز کر دے۔

دین اللہ کی ہے اس میں اجارہ کیا ہے!

اسلامیات ہی کے ایک اور مخلص سے گفتگو رہی اور ہائی اسکول کے دو اخلاق مجسم

ٹیچروں سے بھی جن میں سے ایک کا ساتھ تو کئی گھنٹے رہا...... ان مختلف نوعیت کے ان ۲۵، ۳۰ ملاقاتیوں میں سے بعض نے وائس چانسلر کی مدح وثنا صراحت کے ساتھ کی اور شکایت تو کسی نے بھی نہ کی۔ یہ اطلاع خاص طور پر اپنے مخلص عمیم مولانا علی میاں ندوی کے علم میں لانا چاہتا ہوں جن کے لئے دل میں محبت بھی ہے اور عظمت بھی۔

وائس چانسلر علی یاور جنگ اس روز موجود نہ تھے اور پرو وائس چانسلر فضل الرحمٰن صاحب حیدر آبادی بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ دونوں سے ملاقات کی مسرت حاصل نہ ہو سکی۔

صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا حسب معمول تین مخلصوں کے حصہ میں رہا۔ سب سے سبقت حافظ قرآن سعید الملک نواب صاحب چھتاری لے گئے۔ میرے مستقل میزبان عزیزی ہاشم قدوائی نے بیان کیا کہ سہ پہر کو نواب صاحب کے ہاں ایٹ ہوم ہے۔ موصوف پہلے ہی عالی مرتبت ہونے میں کیا کم تھے اور اب تو ماشاء اللہ ملک کی اس مہتم بالشان یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں قدرۃً میں یہی سمجھا کہ کوئی بڑے آدمی وارد ہوئے ہوں گے اور نواب صاحب نے میری عزت افزائی کے خیال سے مجھے بھی اس ایٹ ہوم میں یاد کر لیا ہوگا۔ کچھ دیر کے بعد جب کارڈ دیکھا تو اس میں کسی بڑے کے بجائے اس چھوٹے کا یعنی خود اپنا نام دیکھا! اور احساس شرمندگی سے کٹ کر رہ گیا۔ بہر حال گیا اور واپس آیا تو خوشی خوشی ایک تو یہ کہ وقت زیادہ صرف نہ ہونے پایا، آدھ گھنٹے میں فراغت ہو گئی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مجمع بڑا نہ تھا۔ گنتی کے کل دس بیس مخلصین تھے۔ سب اہل علم یا اہل دین...... نواب صاحب کا یہ فخر قابل رشک ہے کہ ۸ سال کے سن سے جب سے انھوں نے محراب سنانا شروع کی ہے اس میں آج تک کسی سال ناغہ نہیں ہوا اور یوپی کا گورنر اور حیدر آباد دکن کا صدر اعظم برابر بے جھجک قرآن سناتا رہا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ الخ۔

اس بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں کون مسلم ادارہ اپنی اصلی اور مثالی صورت

میں رہ سکتا ہے نہ دیوبند وہ دیوبند ہے اور نہ ندوہ وہ ندوہ ہے جو ان کے بانیوں کے ذہن و تصور میں تھا اور فرنگی محل مرحوم کا تو نام ہی نہ لیجیے۔ علی گڑھ بھی وہ کیسے رہ سکتا تھا جو سر سیّد اور محسن الملک اور وقار الملک اور آفتاب احمد خاں کے زمانہ میں تھا۔ دل کو یہی کہہ کر سمجھا لیجیے کہ حالت اگر قابل شکر نہیں تو تمام تر مستحق شکوہ وملامت بھی نہیں۔

لڑکوں کی عام مذہبی حالت مثلاً پابندی نماز باجماعت بحمد اللہ بہتر ہی سننے میں آئی اور احترام صوم کے سلسلے میں جو احکام جاری ہوتے ہیں ان کے لئے بھی اطلاع یہی ملی ہے کہ وائس چانسلر کے ہاں سے جاری ہو چکے ہیں۔

(صدق جدید، ۹ر دسمبر ۱۹۶۶ء)



آگرہ / جے پور

یوپی سرکار نے کئی سال سے جو کمیٹی انعامی کتابوں کے لئے قائم کر رکھی ہے وہ اصلاً تو ہندی اور اس کے بعد سنسکرت کتابوں کے لئے ہے لیکن اس میں چار ممبر اردو کے لئے بھی رکھ دیئے ہیں۔ کمیٹی کے صدر یوپی کے سابق چیف منسٹر اور راجستھان کے موجودہ گورنر آنریبل ڈاکٹر سمپورنانند ہیں۔ کمیٹی کا تازہ اجلاس ابکی ۱۴؍۱۵؍جولائی (۱۹۶۳ء) کو راجستھان کی راجدھانی جے پور میں طلب ہوا اور اس تقریب سے جے پور کا سفر لکھنؤ سے براہ آگرہ ۱۲؍جولائی کو اختیار کرنا پڑا۔ گاڑی کے انتظار میں آگرہ اسٹیشن پر کئی گھنٹے گزارنے تھے۔ دل نے کہا کہ موقع کو غنیمت جانئے اور ایک سرسری سیر مشہور آفاق عمارت تاج محل کی اور مشہور ملک عمارت قلعہ کی کر آیئے...... دوپہر کے دو ڈھائی گھنٹے اس مشغلہ میں بسر ہوئے اور سالہا سال کا اشتیاق پورا ہوا...... کاش نہ پورا ہوا ہوتا!

تاج محل اور اس کے ملحقات، گلستان شاہجہانی وغیرہ کے حسن و جمال اور وسعت رقبہ کا کیا پوچھنا! ایک دنیا ہے کہ ملکوں ملکوں سے، مشرق و مغرب سے تمنائے دید میں کھنچی چلی آ رہی ہے اور ہر سال نہیں ہر روز ہی ایک میلہ سا، کیا خواص اور کیا عوام کا لگا رہتا ہے! اس روز بھی اور ٹھیک دوپہر میں ایک تانتا تماشائیوں کا لگا ہوا بھانت بھانت کی مخلوق ہر ریاست اور ہر صوبہ کی اور ایک ٹولی کیمرہ بدست فرنگیوں اور فرنگنوں کی۔ ان کے علاوہ اصل عمارت اور اس کے ملحقات، رقبہ فرلانگوں کا نہیں میلوں کا گھیرے ہوئے ہیں۔ دولت اس سارے کارخانے کی تعمیر و جلا میں ارزانی کے زمانے میں بھی کیا لکھو کھا سے کچھ کم صرف ہوئی ہو گی! اور آج کے معیار سے تو میزان کروڑوں کی پہنچے گی۔ شاہجہاں کا شمار صاحب فہم سلیم رکھنے والے تاجداروں میں ہے۔ ساتھ ہی دین کا شعور اور شریعت کا پاس رکھنے والا۔ حیرت اور کمال حیرت ہے کہ اسے اس بے تحاشا اسراف اور سرتاسر بے نتیجہ اسراف کی سوجھی کیا! اور وقت کے علماء و مشائخ اس ارادہ کے کیوں نہ آڑے آگئے اور کسی نے کیوں نہ سمجھایا کہ محبوب کی یاد منانے کا یہ کون سا

عاقلانہ طریقہ ہے! محبوب کی روح کو اس بے دھڑک اسراف پروری سے کسی قسم کی بھی مسرت، راحت حاصل ہو گی؟...... کیا اس سے ہزار درجہ بہتر نہ ہوتا کہ بادشاہ ملکہ کی یادگار میں مسجدیں بنوا دیتا، آبپاشی کے لئے نہریں یا کنویں کھدوا دیتا، دینی مدرسے کھول جاتا، مہمان سرائیں تعمیر کرا دیتا۔ وقس علیٰ ہذا۔

اسی حسرت و تاسف کے ساتھ قلعہ کی لق و دق عمارت کو بھی دیکھا۔ "عمارت" بہ صیغۂ واحد نہیں چھوٹی بڑی بیسیوں، عمارتوں کے مجموعہ کو جس کی ہر چھوٹی عمارت بھی بیسیوں عظیم الشان عمارتوں پر بھاری! یہ قلعہ بمعنی قصر شاہی دور اکبری، دور جہانگیری اور سب سے بڑھ کر عہد شاہجہانی کی تعمیر ہے اور مسلمان فرماں رواؤں کے حد مرض تک پہنچے ہوئے اسراف کا مکمل نمونہ!...... تاج محل اور قلعہ کی سیر سے جو افسردگی و حسرت طاری ہوئی اس نے فتح پور سیکری، مقبرہ اعتماد الدولہ وغیرہ کی طرف توجہ کرنے کی ہمت ہی نہ باقی چھوڑی۔

جے پور، قیام دو دن رہا۔ ۱۴؍ کو قبل صباح سے لے کر ۱۵؍ کی نصف شب کے بعد تک۔ قدرۃً گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر صاحب کے مہمان کی حیثیت سے اور ڈاکٹر سمپورنانند کو ایک نئے روپ میں دیکھا۔ یہ نجی اور نیم سرکاری زندگی کے سمپورنانند ان سمپورنانند سے بالکل مختلف نکلے جو سرکاری زندگی میں پہلے وزیر تعلیم اور پھر وزیر اعلیٰ کی حیثیت رکھے ہوئے تھے۔ نہ جلال نہ جبروت، نہ تمکنت نہ نخوت۔ ان کے مہمان پانچ چھ اور تھے اور تنہا میں مسلمان تھا لیکن مجھ سے بھی نہ کسی قسم کا تعصب نہ بیگانگی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ اوّل بھی میزبان ہیں اور آخر بھی میزبان۔ مشرق میں میزبانی کے جو معنی ہیں اس کا حق انھوں نے ادا کر دیا۔ اردو کمیٹی میں پوری دلچسپی لی اور صدر کی حیثیت سے اور اس کے علاوہ بھی ہر موقع پر شستہ اردو روانی سے بولتے رہے۔ پہلی رات کو ایک اردو مشاعرہ کرایا۔ اس میں اوّل سے آخر تک شریک رہے بلکہ آخر میں لوگوں کے اصرار پر اپنی ایک پرانی اردو غزل بھی سنائی...... کاش اس کی آدھی اردو نوازی بھی

ان کی سرکاری زندگی کا جز و رہی ہوتی!

مشاعرہ میں کلام اچھا اچھا سننے میں آیا اور اردو کے مشاعرہ میں مجمع راجستھان میں بھی اچھا خاصا تھا۔ صدر مشاعرہ سابق نواب صاحب ٹونک تھے جو خود بھی خاصے شاعر اور ادب نواز نظر آ رہے تھے۔ حاصل مشاعرہ فراقؔ صاحب کی غزل رہی۔ فراقؔ بھی میری ہی طرح اردو کمیٹی کے ممبر اور سرکاری مہمان تھے۔ ہندوؤں کی تعداد سامعین ہی میں نہیں شاعروں میں بھی اچھی خاصی تھی۔ معلوم ہوا کہ شہر میں انجمن ترقی اردو کی جو شاخ قائم ہے اس کے نائب صدر بھی ایک ہندو ہی ہیں۔ مشاعرہ میں دو پر لطف نظمیں لکھنؤ کے سید صدیق حسن صاحب آئی سی ایس کی طرف سے بھی (جو ایک معذوری کی بنا پر شریک نہ ہو سکے تھے) پڑھ کر سنائی گئیں اور اپنے کسی قدر مشکل ہونے کے باوجود حاضرین سے داد خوب وصول کی۔

(صدق جدید، ۲۶ر جولائی ۱۹۶۳ء)



طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com